خدا بخش لائبریری جرنل

شمارہ : ۱۹۱ — ۱۹۴ جنوری — دسمبر ۲۰۱۸

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

ایڈیٹر
ڈاکٹر شائستہ بیدار
ڈائریکٹر، خدابخش لائبریری

رجسٹریشن نمبر : ۳۳۴۲۴/۷۷
شمارہ : ۱۹۱-۱۹۴

زرسالانہ

افراد	:	۴۰۰/-
ادارہ	:	۵۰۰/-

غیر ممالک

افراد	:	۳۰ ڈالر
ادارہ	:	۶۰ ڈالر

مقالہ نگاروں کے افکار و آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

محمد جاوید اشرف نے پاکیزہ آفسیٹ، شاہ گنج، پٹنہ میں چھپوا کر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا۔

فہرست

اداریہ	پانچ-چھ
جمیل مظہری کا شاہکار ناولٹ: شکست و فتح/فرض کی قربانگاہ پر	۱
ظ۔انصاری کے خطوط (پیشکش ڈاکٹر فرد الحسن)	۶۹
پورنیہ کی تاریخ وثقافت صدیوں کے آئینے میں، از پروفیسر انوار الحق تبسم	۸۸
مگہی زبان کی تاریخ اور اس کا ارتقا، از ڈاکٹر الفیہ نوری	۱۱۲
تذکرہ آب حیات پر پہلی تحریر، از ڈاکٹر ابرار عبدالسلام	۱۳۸
اقبال کا دورۂ اورنگ آباد، از ڈاکٹر عنایت علی	۱۴۶
ریاض الرحمٰن خاں شروانی کے کانفرنس گزٹ کا اشاریہ۔۲۰۰۲ء تا ۲۰۱۷ء (ش)	۱۶۱
تازہ کتب ورسائل: تعارف	۲۱۹

انگریزی۔ہندی

قران السعدین: تاریخی پس منظر، از ڈاکٹر نرملا گپتا (انگریزی)	۱
ہندوستان میں مسلم تاریخ نویسی کا آغاز وارتقا، از ڈاکٹر نکہت تبسم (ہندی)	۱۷-۳۶

مقالہ نگار

☆ ڈاکٹر ابرار عبدالسلام، صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج، سول لائنز، ملتان، پاکستان

☆ ڈاکٹر الفیہ نوری، پوسٹ ڈاکٹرل فیلو، شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ

☆ جمیل مظہری مرحوم، مشہور شاعر، پٹنہ یونیورسٹی کے مرحوم استاد

☆ ڈاکٹر عنایت علی، ہاؤس نمبر: ۱-۱۲-۴۶، مونا محلّہ گھاٹی، نزد پرگتی کالونی، اورنگ آباد

☆ ڈاکٹر فرد الحسن، فیلو خدا بخش لائبریری (سابق) ارم پبلشنگ ہاؤس، دریاپور، سبزی باغ، پٹنہ

☆ ڈاکٹر محمد انوار الحق تبسم، شعبۂ تاریخ (سابق) اورینٹل کالج پٹنہ

☆ ڈاکٹر نرملا گپتا، شعبۂ تاریخ، ایم ایم وی، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

☆ ڈاکٹر نکہت تبسم، ریسرچ اسکالر، شعبۂ تاریخ، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

اداریہ

خدابخش لائبریری ۲۰۱۴ء یا اس سے کچھ قبل ہی سے کچھ ایسے ناگزیر حالات سے گذری جس سے اپریل ۲۰۱۹ء سے پہلے نکل نہ پائی۔ لائبریری کا ایک سہ ماہی جرنل جو مرحوم قاضی عبدالودود صاحب کی رہنمائی میں ۱۹۷۷ء سے نکلنا شروع ہوا، ۲۰۱۴ء میں پچھلی سیریز کا گویا آخری شمارہ نکلا، جو پورے ایک سال کے چار شماروں کی جگہ سال میں ایک شمارہ کے حساب سے شائع ہوا، اس کے بعد ۲۰۱۵ء، ۲۰۱۶ء، ۲۰۱۷ء، ۲۰۱۸ء کے دوران جو تعطل رہا، ایک سال کے ایک شمارے کے حساب سے تو ہو ہی جاتا؛ سو اب ہو گیا، اور ۲۰۱۴ء کی طرح ان چار برسوں کا بھی بھرت پورا ہو گیا، یعنی ایک سال کے ایک شمارہ ہی کا حساب بن پایا، مگر تسلسل رکھنے کے لئے نمبروں کو مسلسل کر دیا گیا، آگے پھر یہ ہوا کہ ۲۰۱۹ء میں سال میں ایک شمارے کی اوسط بڑھا کے سال میں دو شماروں تک لے آیا گیا ہے، یعنی جنوری تا جون ۲۰۱۹ء-اور- جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء۔

۲۰۱۵ تا ۲۰۱۹ء کے 'مقروض' شماروں میں بیشتر تو نئی تحریریں ہیں، مگر ایک آدھ وہ

بھی جو ہماری قدیم میراث میں شامل تھیں، اوران کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ انھیں ازسرِ نو شائع کیا جائے۔

ان برسوں کے قرضے کی ادائی میں ہمیں عبدالرحمٰن صاحب (ساکن ضلع ارریہ سابق ضلع پورنیہ) کا تعاون حاصل رہا، اس کے لئے دلی شکریہ۔ ڈاکٹر محمد ذاکر حسین صاحب نے سال ۲۰۱۹ء میں اس سیکشن کا چارج سنبھالا، ان سے بھی تعاون ملا۔ چند مضامین کا پروف بھی اچھے طور سے پڑھا، اور مجموعی ہیئت کو سنوارنے میں بھی (فہرست وغیرہ) انھوں نے مدد دی، اس کے لئے ان کا شکریہ۔ سب سے اہم شکرگزاری پرانے خریداروں کی ہم پر واجب ہے، اور نئے خریداروں کی شکرگزاری بھی۔ مزید شکرگزاری ان رسائل کی بھی جو خدابخش لائبریری کے ذخیرے کو بھرپور بنانے کے لئے اپنے مجلّات بھیجتے رہے ہیں۔ ان رسائل میں جو لائبریری کو موصول ہوتے رہے ہیں، اکثر کو ہم نے اپنی مستقل مبادلہ فہرست میں رکھا ہے، مبادلے والے رسائل کے مدیران کرام پر ہمارے جرنل کی رسید واجب ہے جب یہ تازہ شمارے ان تک پہنچ جائیں۔

ہمارا جرنل ان مضمون نگاروں کو پہنچنا ضروری ہے، اور متوقع مضمون نگاروں کو بھی، جو خدابخش لائبریری اور اس کے جرنل سے تعلق بنائے رکھنا پسند کرتے ہیں۔

(ش)

جمیل مظہری

کا

شاہکار ناولٹ

شکست و فتح

فرض کی قربان گاہ پر

O

ندیم، بہار بلکہ پورے ہندوستان کے اہم پرچوں میں رہا ہے۔ یہ جون ۱۹۳۱ء میں نکلا اور ۱۹۴۸ء تک جاری رہا، اس میں بہار کے اہم لکھنے والے اور ان کی بڑی اہم تحریریں محفوظ ہیں۔ ضرورت تھی کہ اس کا ایک انتخاب سامنے آجاتا، تاکہ ان برگزیدہ تحریروں کی بازخوانی سے سینہ کے داغ تازہ کرنے کا سامان بہم پہنچتا۔ اب اس کی نوبت آن پہنچی ہے، اور چند جلدوں میں یہ انتخاب ملاحظہ میں لایا جاچکا ہے۔

ندیم میں کچھ ایسی غیر معمولی چیزیں چھپی ہیں جنہیں منتخبات میں شامل کرنے کے بجائے الگ مستقل بالذات حیثیت دینا ضروری تھی، ان ہی میں سے ایک 'جمیل مظہری ایم۔اے' کا افسانہ تھا: **شکست و فتح / فرض کی قربان گاہ پر**۔ اس لیے وہ علحدہ مجلد ہی میں شائع ہو رہا ہے، اور خدا بخش لائبریری جرنل کا بھی حصہ بنایا جارہا ہے۔

یہ طویل افسانہ/ ناولٹ پہلی بار ندیم کے بہار نمبر ۱۹۳۵ء/ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ پھر ایک بار کتابی صورت میں بھی ۱۹۵۰ء میں چھپا، اس بار اس کا عنوان تھا، **شکست و فتح**، ہم نے ندیم کا اصل عنوان برقرار رکھا ہے اگرچہ دوسرا عنوان بھی ساتھ میں لگا دیا ہے۔

جمیل مظہری (۱۹۰۴ء-۱۹۸۰ء): اپنے تخلص جمیل مظہری سے مشہور۔ سید خورشید حسنین کے بیٹے میر کاظم علی پٹنہ سٹی کے محلّہ مغلپورہ میں ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پٹنہ سٹی کے مدرسہ سلیمانیہ میں اور پھر میٹرک کلکتہ سے ۱۹۲۲ء میں پھر انٹر سے ایم۔اے (۱۹۳۱ء) تک کلکتہ ہی میں تکمیل کی۔ ۱۹۴۶ء-۱۹۵۰ء میں حکومت بہار کے شعبۂ نشر و اشاعت میں کام کیا۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۴ء تک پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد رہے۔ ۱۹۸۰ء میں بھیکن پور ضلع مظفر پور بہار میں وفات پائی۔

تصانیف: ☆نقش جمیل: (پہلا مجموعۂ کلام) مرتب رضا نقوی، پٹنہ ۱۹۵۳ء☆فکر جمیل: (غزلیات و رباعیات) مرتب رضا مظہری و رضا نقوی، پٹنہ ۱۹۵۸ء☆ آب و سراب: (فلسفیانہ مثنوی) مرتب رضا مظہری، کلکتہ ۱۹۷۰ء☆ عرفان جمیل: (مراثی و قصائد) مرتب ڈاکٹر سید صفدر حسین، لاہور ۱۹۶۹ء☆ عرفان جمیل: (دوسرا ایڈیشن مع اضافہ) الہ آباد ۱۹۷۹ء☆ وجدان جمیل: (مراثی وملی نظمیں) لاہور ۱۹۷۹ء☆منثورات جمیل (دو حصے): مرتب اعجاز علی ارشد۔

جمیل مظہری کا یہ ناولٹ دو قسطوں میں ندیم کے بہار نمبر میں شائع ہوا، ایک ۱۹۳۵ء میں، ایک ۱۹۴۰ء میں۔

ان کی عمر ۱۹۳۵ء میں اکتیس برس کی تھی، آگے پانچ سال اور جوڑ دیجئے، اس وقت تک یہ شاعر تو بس ____ تھے! مگر یہ جمیل صاحب کی طویل نثر کا خوبصورت نمونہ اور جمیل صاحب کی اپنی فکر کا یہ طویل اظہار اردو ادب میں بڑی اہمیت رکھتا ہے جب یہ پہلی بار ۱۹۳۵-۱۹۴۰ء میں چھپا، اور خدا بخش سے ۱۹۹۵ء میں چھپا۔ اور اب بارِ دگر ۲۰۱۸ء کے جرنل میں اس کی اشاعت ہو رہی ہے، تو جمیل مظہری لٹریچر میں اس کی اہمیت واضح تر ہوتی جاتی ہے۔

۱۹۳۵ء میں چھپنے کے بعد رسالہ ندیم غائب ہو گیا، ۱۹۴۰ء میں جمیل صاحب کے شاہکار کی دوسری قسط شائع ہونے لگی تو جمیل صاحب نے پچھلے اوراق کا خلاصہ خود تیار کر کے ندیم کے ادارے والوں سے کہا ہوگا کہ دوسری قسط کے آغاز میں مصنف کے یہ سطور بھی شائع کر دیں جو پہلے حصہ کو دوسرے سے ملائیں، ہم نے اسے دوسرے حصے سے ممتاز کرنے کے لئے، ذرا خط بدل کے اس دوسرے حصہ کے آغاز کا ''دیباچہ'' بنا دیا ہے۔ تا کہ یہ خلاصہ بھی محفوظ رہ جائے۔ آپ چاہیں تو اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائیں۔ مصنف نے اسے بغلی سرخی اس طرح دی تھی: چند افکار اور چند محسوسات کا افسانوی خاکہ۔

جمیل صاحب کا ناولٹ پڑھتے وقت آپ ایک اور بھی فائدہ اٹھا سکیں گے، یعنی کچھ ایسے الفاظ جو بہار سے مغرب میں کسی اور طور سے بولے لکھے جاتے ہیں، مثلاً: اگنائی/ انگنائی، کی ارتقا/ کا ارتقا وغیرہ، اس طور سے اس ناول کا مطالعہ کرتے وقت کچھ الفاظ کی طرف آپ بھی توجہ کر سکتے ہیں۔

۱۹۳۵ء/ ۱۹۴۰ء کے اس متن میں اسی طرح عجیب وغریب سطور پڑھنے کو ملیں۔ وقت کی رفتار کب کہاں فکر کی رفتار کے ساتھ تھم جائے کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔ دنیا میں جو، اور بہت سے اسرار ہیں ان میں سے ایک اس جمیل مظہری کے ناول میں بھی در آیا ہے، جسے ہمارے عبدالرحمٰن صاحب (ارریہ) نے دریافت کیا: عجیب بھی، غریب بھی! جمیل مظہری صاحب لکھتے ہیں:

''دو بھولے بھالے حسین بچے گھر کی انگنائی میں کھیل رہے تھے۔ چھوٹے کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی، بڑے کے مضبوط پنجوں نے چھوٹے کے کمزور ہاتھوں سے وہ گڑیا چھین لی، اور لے بھاگا۔ گڑیا چھن گئی، ایک ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں چلی گئی ___ گڑیا کے منھ میں زبان نہیں ہوتی کہ اپنی رائے ظاہر کرے کہ کس کے ہاتھ میں رہوں گی۔ جو چھین لیتا ہے اس کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے، اور اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ خود اسے پھینک نہ دے ___ ہاں تو گڑیا چھن گئی، جس کے ہاتھ سے چھن گئی اس نے فریاد کی، غل مچایا اور گھر میں جتنے کان تھے ان سب کو اپنی مظلومی کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ لوگ دوڑے معصوم نزاع نے سنگین مقدمے کی شکل اختیار کی ججوں نے فیصلہ یہ کیا کہ گڑیا اس کی ہے جس کے ہاتھ میں ہے، دوسرے کے لئے دوسری منگوادی جائے ___''(''شکست وفتح'' سے مقتبس: ۱۹۳۵ء)۔

مالک اس بڑے فنکار کی قبر کو نور سے بھرا رکھے۔

(ادارہ)

☆☆☆

O

دو بھولے بھالے حسین بچے گھر کی انگنائی میں کھیل رہے تھے ___ کھیل رہے تھے اور گھروندے بنا رہے تھے ___ بنا رہے تھے اور توڑ رہے تھے۔ چھوٹے کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی کچکڑے کی ایک خوبصورت گڑیا ___ معصوم جذبات کا کھلونا ___ نابالغ ذوق نظر کے لئے ایک حسین دھوکا ___ بڑے کے مضبوط پنجوں نے چھوٹے کے کمزور ہاتھوں سے وہ گڑیا چھین لی، چھین لی اور لے بھاگا۔ گڑیا چھن گئی، بغیر کسی غدر کے ایک ہاتھ سے دوسرے کے ہاتھ میں چلی گئی ___ گڑیا کے سینے میں دل ہوتا نہیں۔ اور ہوتا بھی ہو تو زبان نہیں ہوتی کہ اپنی رائے ظاہر کرے کہ کس کے ہاتھ میں رہوں گی۔ جو چھین لیتا ہے اس کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے اور اس وقت تک رہتی ہے جب تک وہ خود اسے اٹھا کر پھینک نہ دے ___ اور اگر ٹوٹ جائے؟ تو بقول غالب ''اور بازار سے لے آئیں گے'' ___ جو چیز کہ بازار میں کوڑیوں کے مول ملتی ہو اس کی قیمت؟ ___ ہاں تو گڑیا چھن گئی، جس کے ہاتھ سے چھن گئی اس نے فریاد کی، غل مچایا اور گھر میں جتنے کان تھے ان سب کو اپنی مظلومی کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ لوگ دوڑے، معصوم نزاع نے سنگین مقدمے کی شکل اختیار کی، ججوں نے فیصلہ یہ کیا کہ گڑیا اس کی ہے جس کے ہاتھ میں ہے، دوسرے کے لئے دوسری منگوا دی جائے ___ ایک گڑیا کے لئے دو کمسن بھائیوں میں یہ نوک جھونک دیکھنے والوں کے لئے تماشہ ہو کر رہ گئی، لیکن زمانہ کی گرم رفتاری نے بہت جلد انہیں دکھلا دیا کہ یہ تماشہ تماشہ نہ تھا، فطرت کا ایک استعارہ تھا۔ مجاز کی تاریکیوں سے ڈھکی ہوئی ایک حقیقت تھی۔ تلخ حقیقت، فطرت جس کی ''زبان حال'' سے ایک کہانی کہہ رہی تھی۔ ایک ہونے والی کہانی۔ قضا و قدر کا فیصلہ جس کی بنیاد پر ایک افسانہ مرتب کر رہا تھا ___ ایک عجیب افسانہ۔

(۱)

صبح آفرینش کی پہلی کرن پھوٹی نہ تھی کہ زمین کے سینے پر جو سورج سے الگ ہو کر ایک مستقل سیارہ بن چکی تھی، ضرورت محسوس کی گئی ایک ایسی مخلوق کی جو مقاصد فطرت کی کارفرمائی کر سکے! ___ ارادے نے صورت پکڑی ''حجریت'' نے جسم اختیار کیا۔ التہاب و حرارت نے روپ بدلا ___ مرد کی تخلیق ہوئی ___ اور فطرت کا یہ شاہکار اولین زمین کے سینے پر خوشخرامیاں کرنے لگا۔ فضائے بسیط نے

مہمان عزیز کے استقبال کے لئے اپنی گود پھیلا دی ___ پھولوں سے بھری ہوئی گود۔ لیکن پھولوں کی خوشبو اس کے مشام و روح کو آسودگی نہ پہنچا سکی۔ ستاروں نے آنکھیں مٹکا مٹکا کر کچھ اشارے کئے۔ چاند کی روشنی نے دور سے بلائیں لیں۔ بجلی نے ابر کے پردے سے جھانک کر ادائیں دکھلائیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے احساسات لذت کو لطف اندوز نہ کر سکا۔ مہمان خانے میں کوئی چیز بھی اپنے مطلب کی نہ دیکھ کر مہمان کا جی گھبرانے لگا ___ فطرت کی پیشانی پر بل پڑ گئے، فکر کے بل! ''شاہکار ابھی نامکمل ہے'' ___ ارادے نے دوسری کروٹ لی دوسرے شاہکار کے لئے جو پہلے شاہکار کو مکمل کر دے۔ کائنات کی ہر چیز نے اپنی لطافتیں پیش کیں لطافتوں کا رس نچوڑا گیا۔ اور رعنائی اور کہربائیت کے امتزاج کے ساتھ ایک مجسمہ تیار ہوا ___ یہ عورت تھی ___ جو دفعتاً آسمان کی بلندی سے شہاب ثاقب کی طرح ٹوٹی ___ مرد کی آنکھیں چمک اٹھیں اور اس نے دیکھا کہ کائنات پر ایک نیا رنگ پھر گیا ہے ___ ہر چیزیں میں ایک نئی زندگی دوڑ رہی ہے۔ پھولوں کی خوشبو اب بھلی معلوم ہونے لگی۔ بجلی کی ادائیں اب بہت ہی پیاری نظر آنے لگیں۔ ستاروں کی چشمک میں مزہ ملنے لگا۔ ان کے اشارے اب سمجھ میں آنے لگے ___ یہ عورت تھی، جس نے دنیا کو مرد کے لئے مزیدار اور پر کیف بنا دیا۔ یہ عورت تھی، مرد نے جسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اپنی خودداری کھو دی اور برابر کھوتا رہا۔ ذوق نظر نے مرکز ڈھونڈ لیا ___ جذبہ پرستش کو کھلونا مل گیا ___ پیشانی میں جتنے سجدے تھے سب ایک ایک کر کے اس کے قدموں پر بکھیر دئے۔ اور بنانے والا منھ دیکھتا رہا گیا ___ غرض دل کی یہ ملکہ اپنے حدود سے باہر نکل کر مرد کے دماغ پر بھی قابض ہو گئی۔ یہ سب کچھ ہوا، لیکن متمدن دنیا نے اصولی حیثیت سے اس کی ہستی کو مرد سے جداگانہ کوئی مستقل چیز کبھی تسلیم نہ کیا۔ اس کا جواب یہ کہ عورت تخلیق ہوئی مرد کی دلچسپی کے لئے، مرد عورت کے لئے نہیں بنا۔ یہی وہ تخئیل ہے جس نے ہمیشہ کے لئے مرد کی افضلیت کو عورت پر مسلّم کر دیا ___ ''عورت کھیلنے کے لئے بنائی گئی ہے'' اس لئے بنائی گئی ہے کہ مرد کی ضرورتیں اس سے کھیلتی ہیں اس کو اس سے بحث کیا کہ کھیلنے والا کون؟ ہاتھ کس کا ہے؟ لیکن یہ غلطی فطرت کی تھی کہ اس نے کھلونے کو بناتے وقت اس کے پہلو میں ایک دھڑکتا ہوا دل بھی رکھ دیا۔ ایک ننھا سا دھڑکتا ہوا دل جو مرد کی طرح دھڑکتا ہے، مرد ہی کی طرح خواہش کرتا ہے، کچھ چاہتا، کچھ نہیں چاہتا ہے۔ اگر رکھنا ہی تھا تو دل کی جگہ پتھر کا ایک ٹکڑا رکھ دیا ہوتا۔ اور اگر پتھر کے ٹکڑے سے وہ افعال طبعی پورے نہ ہو سکتے تھے تو پتھر کا ٹکڑا نہ سہی ایک ایسا ''نیم بیدار دل'' سہی، جو صرف دھڑک سکتا، بول نہ سکتا۔ جو صرف جواب دے سکتا سوال نہ کر

سکتا ___ ہاں تو فطرت کی اس خطرناک غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرد اور عورت کی آزادی میں دلوں کی ٹکر شروع ہوگئی ایک کے غرور نے دوسرے غرور کو جھکانا چاہا، ایک کی خواہش نے دوسرے کی خواہش کو نگل جانا چاہا۔ فتنوں نے کروٹ لی، ہنگاموں نے سر اٹھایا، تعلق کی زنجیریں اور جماعت کا نظام بکھرنے لگا۔ یہ دیکھ کر ''تمدن حکیم'' نے ''فطرت نابینا'' کی اس خطرناک غلطی کی تصحیح کرنے کی ضرورت محسوس کی، اور عورت کے دل کو لوریاں دی جانے لگیں۔ لوریاں پہ لوریاں یہاں تک کہ وہ سو گیا، گہری نیند سو گیا۔ ''تمدن جدید'' کچھ سوچ کر سوئے ہوئے فتنوں کو جگا رہا ہے اور وہ جاگتے جا رہے ہیں ___ کل پوری طرح جاگ جائیں گے۔ اور اپنے تمام طوفان کے ساتھ جاگ جائیں گے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کی اس معاشرت کا شیرازہ کیوں بندھا رہتا ہے اور خانہ دار زندگی کے وہ گھروندے جو آپ نے بنا رکھے ہیں، کیوں بنے رہتے ہیں۔ تمدن قدیم نے عورت کے دل کو تو سلا دیا اور مرد کے دل کو ضرورت سے زیادہ بیدار کر دیا۔ انصاف کا تقاضہ یہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کو چین جیسا چاہئے تھا، کبھی نہ ملا۔ دل کسی کا بھی ہو نیند اس کے لئے بہر حال بہتر ہے۔ گوشت کا یہ دھڑکتا ہوا لوتھڑا اپنے افعال کے لحاظ سے معاشرتی زندگی کے لئے ہمیشہ خطرناک ثابت ہوتا رہا ہے۔ جنہوں نے اس کی پرورش کی انہوں نے ہمیشہ اس کو اپنے لئے اور اپنے ماحول کے لئے ایک مصیبت پایا۔ تمدن کی (کذا) ارتقاء اور معاشرت کی خیریت بس اسی پر مبنی ہے کہ یہ ''لعنت متحرک'' سرکش ہونے سے پہلے کچل دی جائے۔ آپ اس سے متفق ہوں یا نہ ہوں، لیکن میں تو یہی سمجھتی آئی ہوں، اگر سمجھتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ محمود کی آغوش کو اپنی کنواری امنگوں کی بہشت سمجھنے کے باوجود چپکے سے اس کے بڑے بھائی حامد کی آغوش میں چلی جاتی اور زندگی کے بہترین حصے کو اس کے پہلو میں سو کر اس خندہ پیشانی کے ساتھ بسر کر جاتی جیسے واقعی میرے سینے میں دل نہ تھا۔ سلیمہ نے دل اور دل میں جذبات رکھنے کے باوجود رواج کے حکم اور سماج کے فیصلے کے سامنے گردن جھکا دی اور اس کے فیصلے کی لاج رکھنے کی لئے عمر بھر ان زنجیروں کا احترام کرتی رہی جو اس کے پاؤں میں ڈال دی گئی تھیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سماج کے پاس سلیمہ کے لئے کیا ہے۔ گو سلیمہ خود نہیں جانتی کہ اس کی قربانیوں کا معاوضہ کیا ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ وہ عورت جو عمر بھر اپنے دل کی سرکش ترین طاقتوں سے جہاد نفس برپا کئے رہی اب اپنے جذبات پر فتح پا لینے کے بعد اپنی تمناؤں کا خون بہا کیا طلب کر سکتی ہے۔

(۲)

یہ سطریں اس وقت قلمبند کر رہی ہوں جب جوانی کی بہار خزاں ہو رہی ہے۔ سہرے کے

پھول مرجھا چکے ہیں ___ قسمت نے سہاگ کی وہ نعمت بھی چھین لی ہے جو عورت کے لئے سب بڑا بل ہے ___ طوفان کا زور کم ہو جاتا ہے، لیکن محمود کی محبت کی سلگائی ہوئی چنگاری اب تک سلگ رہی ہے اور میری روح اس کی دھیمی آنچ سے پھنکی جا رہی ہے، گھلی جا رہی ہے موم کی اس بتی کی طرح جو نصف سے زیادہ جل چکی ہو: مردانہ باش، ختم ہے یہ امتحان بھی

ہوا کا ایک تند و تیز جھونکا اور بس ___ ایک آخری ہچکی اور شمع کی داستان شب ___ ہمیشہ کے لئے ختم۔

یہ چند اوراق جو آنسوؤں کے دھبّوں سے داغدار ہیں زمانے کے ہاتھ میں اس وقت پہنچیں گے، جب زمانہ میرے وجود کے بوجھ کو موت کی آغوش میں پھینک چکا ہوگا۔ میں نہ ہوں گی لیکن میری رام کہانی سننے اور سمجھنے کے لئے میری بہت سی ایسی بہنیں موجود ہوں گی، جنہوں نے میری ہی طرح عمر بھر اپنے دل سے لڑائی باندھ رکھی ہوگی۔ وہ میرے جذبات کو پوری طرح سمجھیں گی اور میری قربانیوں کی منہ مانگی داد دیں گی، اور کیوں نہ دیں گی جب کہ وہ ان طوفانوں سے اچھی طرح واقف ہیں جو عورت کے دل میں اٹھتے رہتے ہیں، اس عورت کے دل میں جس کی ''فطرت'' کو پابندیوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہو ___ یہ اوراق انہیں بہتوں کے نام معنون ہیں ___ ہمدردی کے آنسوؤں کی چند بوندیں اور بس ___ میری زندگی بھر کی مشقتوں کا اجر ہیں، اور قسم ہے اس خدا کی جو میرے دل کی ہر ہر جنبش کا نگراں رہا ہے کہ میں اس اجر کی مستحق بھی ہوں۔

(۳)

یہ چند سطریں جو غیر ارادی طور پر قلم کی زبان سے ٹپک گئی ہیں، انہیں میری داستان حیات کا مقدمہ سمجھئے۔ رہی داستان تو آگ اور لکڑی کی داستان کی درازی ہی کتنی؟ پس یوں سمجھئے کہ آگ لگی۔ تیل چھڑکا گیا اور لکڑی دیکھتے دیکھتے راکھ کا ڈھیر ہوگئی۔ ایک ایسا راکھ کا ڈھیر جو اپنے سینے میں بہت سی چنگاریاں چھپائے ہو۔ اس استعارے میں مجھے لکڑی فرض کر لیجئے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتی کہ آگ کس کو کہوں، محمود کی محبت کو یا اس رشتہ ازدواج کو جو حامد کے دامن اور میرے آنچل کے ساتھ باندھ دیا گیا تھا۔ بہر حال نتیجہ جلنا تھا، جلی اور بری طرح جھلس کر رہ گئی۔ تصور کا ہاتھ جب کتاب زندگی کے پچھلے اوراق الٹتا ہے تو مجھے ماضی کے دھندلکے میں ایک تصویر نظر آتی ہے ___ مٹی مٹی سی ___ گھر کی انگنائی، امرود کا درخت اور اس کے سائے میں ایک گھروندا جس میں دو بچے (میں اور محمود) کھیل رہے

ہیں، زندگی کا کھیل، کھیل رہے ہیں، بڑی سنجیدگی کے ساتھ۔ خانہ داری کے لوازمات پھیلے ہیں، گھر بن رہا ہے۔ میاں بیوی کو جھڑک رہا ہے، اور بیوی میاں کو ___ پھر تھوڑی دیر کے بعد دیکھو تو کچھ نہیں۔ چند قہقہے اور کھیل کا خاتمہ ___ یہ تھا ہمارا روزانہ کا کھیل، جواب دیکھتی ہوں تو واقعی کھیل ہو کر رہ گیا ___ حامد ہم دونوں سے عمر میں کچھ بڑا تھا، اس لئے وہ ہم سے پہلے مکتب میں بٹھلا دیا گیا تھا۔ مکتب سے جب اسے چھٹی ملتی تو سیدھا ایک حملہ آور کی طرح ہماری مملکت میں گھس آتا۔ اور اس کے چنگیز خانی حملوں سے ہمارے گھروندے کی چھوٹی سی دنیا میں تراہ تراہ مچ جاتی ___ خانہ داری کا نظام برہم ہو جاتا۔ محمود الگ چیختا، میں الگ بسورتی، یہ بھی سچ پوچھئے تو ایک ہونیوالی بات تھی، قسمت جس کی طرف رہ رہ کر اشارہ کر رہی تھی، آگے چل کر نتیجے نے بتلا دیا کہ حامد کی مداخلت نے واقعی ہمیں وہ کھیل کھیلنے نہ دیا جسے ہم جوان ہو کر بھی کھیلنا چاہتے تھے۔

(۴)

بچپن اور بچپن کے بعد جوانی، زندگی کی دوسری منزل ہے ___ لیکن اس منزل کو طے کرنے میں مدت ہی کتنی صرف ہوتی ہے؟ بس ایک جھپکی ___ اس کے بعد:

کھلی جو آنکھ تو دیکھا کہ وہ بہار نہ تھی

ہاں تو آنکھیں کھلیں اور آنکھوں کے کھلتے ہی اپنی حقیقت نظر آئی اور اپنی حقیقت کو دیکھ کر محمود کی نگاہوں کو پہچانا۔ حامد اس منزل میں البتہ ہمارے ساتھ نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جوان ہونے سے کچھ پہلے ہی میں اس سے چھپائی جانے لگی تھی اور یہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ کیوں؟ محمود سے کوئی پردہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا محمود سے ربط بڑھتا گیا اور ہم لوگ غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے ہوتے گئے۔ وہی اگنائی، وہی امرود کا درخت لیکن اب اس کی چھاؤں میں گھر بھر کی نظریں بچا کر ایک دوسرے ہی قسم کا کھیل کھیلا جانے لگا ___ جوانی کا وہ کھیل جو آنکھوں ہی آنکھوں میں کھیلا جاتا ___ وہ کھیل جس کی بساط پر پانسوں کی جگہ دل پھینکے جاتے ہیں ___ وہ کھیل جس کی جیت اور ہار دونوں ہی لذت سے خالی نہیں۔

برسات کا موسم تھا ساون کی جھڑی برس کر کھل چکی تھی اور مناظر قدرت پر ایک ایسی ''خوبصورت اداسی'' طاری تھی جیسے کوئی حسین عورت رو دھو کر چپ ہو جائے۔ شام ہو رہی تھی ___ وہ شام جو میری زندگی کی تمام شاموں میں منتخب کہے جانے کی مستحق ہے۔ گھر میں سوائے بوڑھی باورچن کے کوئی نہ تھا ___ امی کسی تقریب میں گئی ہوئی تھیں۔ موسم کی ہوائیں دل کو گدگدا رہی تھیں۔ اور میں

اکیلی پلنگڑی پر بیٹھی پھولوں کا ہار گوندھ رہی تھی۔غرض قضاوقدر کا ہاتھ وہ تمام حالات جمع کر رہا تھا۔جن کے بعد غالب کا یہ شعر پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے:

دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد
کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتہ است

ہاں تو میں پلنگڑی پر بیٹھی ہار گوندھ رہی تھی ___ کہ ''محمود میاں'' آئے۔اور پائینتی کے کنارے بیٹھ گئے میں ہار گوندھتی رہی اور وہ شعر پڑھتے رہے:

یہ محویت نہیں بالکل کھلی بے اعتنائی ہے
ہم آئے تھے ذرا تم مسکرا دیتے تو کیا ہوتا

میں مسکرادی۔''اس زحمت کا شکریہ'' انہوں نے کہا ''پھولوں کا کلیجہ کب تک چھیدا جائے گا ___ پھولوں کے علاوہ اور لوگوں کے پاس بھی تو کلیجے ہیں ___ ''اس میں تو بقول ایک سچے آدمی کے چھلنی کی طرح ستر چھید ہو چکے ہیں، مزید سوراخ کی گنجایش کہاں'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔وہ لاجواب ہو گئے۔لیکن انہیں فضول بکواس کرنے کی بیماری تھی اور اس کا دورہ شروع ہو چکا تھا۔

''یہ آج نظر کی سوئی سے کیوں کام نہیں لیا جاتا''۔اس کے جواب میں بھی میں نے نظر کی سوئی سے کام نہ لیا۔

''مجھے ڈر ہے کہ بیکار رہنے سے زنگ آلود نہ ہو جائے''۔غرض زبان کی قینچی چلتی رہی میں نے سوالات کا سلسلہ توڑنے کے لئے نظر اٹھا کر باورچی خانے کی طرف دیکھا اور ان کی کلائی میں آہستہ سے سوئی چبھودی ___ یہ انجکشن کارگر ثابت ہوا اور وہ یہ سمجھ کر کہ باورچی خانے میں کوئی لاش سانس لے رہی ہے، کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے ___ لیکن کب تک؟

''ہاں تو یہ ہار کس کے لئے گوندھا جا رہا ہے آج تو اختر بھی نہیں ہیں'' ___ یہ سوال نہ تھا بلکہ جواب تھا میری ایک خاص حرکت کا جو ان کی سمجھ میں نہ آسکی تھی۔بات یہ تھی کہ ایک دن اسی طرح میں ہار گوندھ رہی تھی اور انہیں کے لئے گوندھ رہی تھی، ایک ایسے عالم محویت میں کہ کلیوں کے ساتھ اس ہار میں میرا دل بھی گندھ گیا ہو تو تعجب نہیں۔یہاں تک کہ جس کا تصور تھا وہ خود آ گیا۔محمود کے ساتھ میرے چچازاد بھائی اختر بھی تھے ___ میں نے ہار پورا کر کے محمود کی طرف دیکھا۔دیکھا اور پھر دیکھا۔مسکرائی اور ہار اختر بھیا کی گردن میں ڈال دیا۔محمود کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا ___ جہاں تک عورت کی ادا فہمی کا

تعلق ہے، مرد ہمیشہ سے غبی ثابت ہوا ہے۔ محمود بھی میرے دل کی کیفیتوں کا مطالعہ نہ کر سکے۔ کئی دن تک منھ تھتھائے رہے ___ آج بے چارے کو کئی دنوں کے بعد بھرے ہوئے دل کو خالی کرنے کا موقعہ ملا تھا۔ بہر کیف آج میں نے اپنے بیوقوف دوست کے روٹھے ہوئے دل سے صلح کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جلدی جلدی ہار ختم کیا اور ختم کر کے ایک شرمیلی ادا کے ساتھ ان کی طرف جھکی۔ محمود نے میرے ارادے کو تاڑ کر گردن بڑھائی اور مجھے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی۔ میں نے پیچھے ہٹنے کا ارادہ کیا لیکن آگے بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ قصور سرزد ہو گیا جس کے بعد کم از کم ہونٹوں کو تو کنوارا نہیں کہا جا سکتا ___ یہ تھا میرا پہلا اور آخری گناہ ___ جس کا میرے ارادے سے اتنا ہی تعلق تھا جتنا پانی کا بہاؤ سے۔ بہر حال جو نہ ہونا چاہئے تھا وہ ہو گیا۔ اور صرف اس لئے ہوا کہ میرا دل اس وقت تک اپنی ''فطرت اصلی'' پر تھا ___ اس کے بعد احساس گناہ نے خود میرے دماغ کی اس رگ کو چھیڑ دیا جو نیکی اور بدی میں تمیز کرتی ہے ___ اور میں نے اپنی حالت پر غور کرنا شروع کیا ___ عقل نے روشنی دکھلائی اور مجھے نظر آنے لگا کہ میں جس راستہ پر چل رہی ہوں وہ راستہ مجھے کسی حال میں منزل تک نہیں پہنچا سکتا ___ مجھے مستقبل قریب میں ''حامد کی بیوی'' بننا ہے اور میں ''محمود کی محبوبہ'' بنتی جا رہی ہوں، آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ سوچ کر میں نے اپنے دل کو محمود کی طرف سے برانگیختہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی شخصیت پر بے رحمانہ نقادی شروع کی۔ اور اس کی صورت و سیرت میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نقائص نکالنے لگی لیکن دل جو اس کا ہو چکا تھا ہمیشہ میری تردید کرتا رہا۔ طبیعت کو ادھر سے بھلانے کی غرض سے کتابوں کا مطالعہ شروع کیا ___ کتابوں نے میرے دل کو کس حد تک بہلایا، یہ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن کتب بینی نے اپنی فطرت سے جو جنگ چھیڑ رکھی تھی ان میں میری کامیابی ان کتابوں ہی کی رہین منت ہے۔ ہاں تو میں محمود سے اب پرے رہنے لگی تھی۔ محمود لاکھ مرد سہی لیکن اب اتنا بھی غبی نہ تھا کہ میرے اچٹتے ہوئے تیور کو نہ تاڑ لیتا ___ میری بے رخی نے آہستہ آہستہ اس کو بھی خودداری سکھلائی اور اس نے میرے پاس آنا اور بیٹھنا بالکل ترک کر دیا۔ بھولے بھٹکے کبھی سامنا ہو جاتا تو اس کی روٹھی ہوئی نگاہیں مجھے ''غدار''، ''بیوفا''، ''ستمگر'' اور ''حرافہ'' غرض نجانے کیا کیا کہا کرتیں جس کے جواب میں میری آنکھیں اسے فلسفۂ معاشرت پر ایک مبسوط خطبہ سنانے کی کوشش کرتیں ___ لیکن وہ شخص جو میری آنکھوں کی معمولی گفتگو بھی سمجھنے سے معذور رہا ہو ''خطبہ'' کیا خاک سمجھتا۔ غرض دن گذرتے گئے اور میری جوانی اس گھٹا کی طرح بھرپور ہوتی گئی، ہوا کا ایک معمولی جھونکا بھی جس کے لئے کافی ہو۔ دل کبھی کبھی محمود کو ضرور ڈھونڈتا، کیوں ڈھونڈتا یہ بھی سن

لیجئے، مجھے محمود سے زیادہ اس کی خوش آمد عزیز تھی ___ یہ ہے عورت کی فطرت کا وہ کمزور پہلو جو تند و تیز ہواؤں میں ہمیشہ غیر متوازن ہوتا رہا ہے ___ وہ دکھتی ہوئی رگ جس کو پکڑ لینے کے بعد اس کے غرور کو سجدہ کے بغیر چارہ نہیں ہوتا ___ میں جھوٹ کیوں بولوں میرے دل میں بھی یہ جذبہ ہر عورت کی طرح تمام جذبات لطیفہ سے زیادہ قوی تھا کہ ''کوئی میرے حسن کی داد دیتا رہے''، محمود نے میرے اس جذبے کی پذیرائی کی تھی اور میرے سامعہ کو پنی چٹپٹی گفتگو کی ایسی چاٹ دے رکھی تھی کہ میں باوجود کوشش کے بھی اس سے بہت دنوں تک دور نہ رہ سکی ___ کچھ محمود ہی پر منحصر نہیں ہر وہ شخص جو سب سے پہلے میرے حسن کی داد دیتا میں شاید اسی کی ہو جاتی ___ یہ، میں میری جوانی کی وہ کمزوریاں جن کے لئے آج میں اپنے ضمیر سے برابر معافی مانگتی رہتی ہوں۔

(۵)

یادش بخیر محبت جب اپنے پینگ بڑھا رہی تھی تو ایک دن میں نے سرسری طور پر محمود سے کہا تھا ''دیکھتے نہیں کہ تمہارے بھیا کی ذات میرے تمہارے درمیان میں ایک دیوار کی طرح حائل ہو جانے والی ہے پھر کس امید پر بڑھے آ رہے ہو؟'' محمود نے اس کے جواب میں سر ہلا کر کہا ''یہ نہیں ہونے دوں گا'' اس جملے سے ایک ایسا عزم راسخ ٹپک رہا تھا کہ مجھے دھوکا ہوا کہ اس کے جسم میں لوہے کے عناصر غیر معمولی طور پر زیادہ ہیں لیکن وقت نے آ کر یہ ثابت کر دیا کہ یہ خوبصورت ہاتھ پاؤں کا خوبصورت مجسمہ کچھ نہ تھا مگر بالو کا ایک تودا ___ ہاں تو امتحان کی گھڑی جب آئی تو اس بالو کے تودے نے اپنی ماں سے اپنی خواہش کا اظہار نہ معلوم کن لفظوں میں کیا کہ ادھر سے جواب ملا ''توبہ کر چھوکرے سلیمہ تجھ سے عمر میں کئی مہینے بڑی ہے'' اس کے بعد ہماری چچیا ساس نے جو اپنے چھوٹوں سے بھی مذاق کرنے میں بے باک تھیں اس خواہش پر یوں تبصرہ فرمایا ''اے تو اس میں کیا حرج ہے، سلیمہ تمہیں بہت پیاری معلوم ہوتی ہے تو بھاوج بنا کے پیار کر لینا بھائی ہی کی تو چیز ہے کوئی غیر تھوڑے ہی لئے جاتا ہے۔ غرض میری قسمت کا فیصلہ ہنسی ہنسی میں اڑ گیا اور محمود کی ہمت مفلس کے مکان کی طرح اس معمولی جھٹکے سے ایسی گری کہ پھر نہ اٹھی ___ ہاں تو سن لیا نہ آپ نے کہ محمود کی خواہش کس بنا پر ٹھکرائی گئی ___ صرف اس لئے کہ میں اس سے عمر میں کئی مہینے بڑی تھی لیکن وہ کئی مہینے کیا کئی برس بلکہ کئی جگ بھی بڑا ہوتا تو کوئی حرج نہ تھا میں اس سے بلا تامل نتھی کر دی جا سکتی تھی۔ عورت اگر ۹ سال کی بھی ہے تو کیا مضائقہ ہے شرعاً بالغ ہو چکی ہے لیکن مرد وہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ ساٹھ برس کا بھی ہو تو پروا نہیں

''ساٹھا پاٹھا'' مشہور ہے ____ دنیا میں یہی ہوتا رہا ہے اور مصلحت اندیشوں نے اس رواج کی اہمیت قائم رکھنے کے لئے بہت سی شرعی حجتیں بھی گڑھ ڈالی ہیں، چنانچہ ایک دن خود میں نے وعظ کی ایک زنانی مجلس میں اپنے کانوں سے ایک مولوی صاحب کو یہ کہتے سنا کہ ایک بوڑھے صحابی نے (صحابی کا نام میرے حافظے سے محو ہو گیا ہے)، ایک اپنی ہم عمر عورت سے نکاح کیا۔ حضرت کو خبر ہوئی تو آپ نے اثنائے ملاقات میں ان بڑے میاں سے ارشاد فرمایا کہ اگر تم کسی کمسن عورت سے نکاح کرتے تو تمہاری تندرستی بھی ترقی کرتی اور عمر میں بھی اضافہ ہوتا ____ یہ لونڈی اس دن سے آج تک اس تمنا میں ہے کہ کاش میرے پیغمبر صاحب خواب میں بھی میرے گھر آ جاتے تو میں اپنے بالوں سے پائے مبارک کی گرد جھاڑ کر پوچھتی کہ میرے ماں باپ صدقے ہوں یا رسول اللہ ان کلمات خیر کو ارشاد فرمائے حضرت نے اپنی امت کی بیٹیوں کو کیوں بھلا دیا، کیا ان کا خون ان کی رگوں میں دوڑنے کے لئے نہیں بلکہ مردوں کے اعصاب کو جوانی کا عرق پلانے کے لئے بنا ہے ____ مانتی ہوں کہ فالج ہاتھ پاؤں کے علاوہ زبان پر بھی گرا کرتا ہے۔ لیکن آج تک میں نے کسی مولوی کی زبان پر اس مادے کو گرتے ہوئے نہیں دیکھا ____ نہ جانے خدا کا عذاب آج کل کس فکر میں خموش ہے۔

(٦)

چاہتی ہوں کہ آپ کو اپنی کہانی سناؤں لیکن کیا کروں کہ اثنائے گفتگو میں ان بہت سے پھوڑوں میں سے ایک نہ ایک پھوڑا بہہ اٹھتا ہے جو میرے دل میں پرورش پا رہے ہیں اور میرا لہو پی پی کر جی رہے ہیں ____ ہاں تو وہ وقت آ گیا دل جس کے تصور سے گھلا جا رہا تھا۔ شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد میں مایون بٹھلائی گئی اور ایک ہفتہ تک اس حوالات میں دنیا کی کھلی فضا سے دور رکھی گئی۔ اس ''کال کوٹھری'' میں جسے قید ازدواج کی تمہید سمجھئے مردوں کی صورت ہوا کے جھونکوں اور سورج کی روشنی کے علاوہ ہر چیز کا گذر تھا یہاں تک کہ محمود کی آواز بھی کبھی کبھی آ کر دل کو ٹکر لگا جاتی تھی ____ گیتوں کے ذریعے سے مجھے آئندہ زندگی کے مراحل سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن میرا دماغ دل سے جنگ کرنے میں مصروف تھا کیا خاک سمجھتی۔ جب گیتوں کی گونج ڈھول کی کھناکھن کے ساتھ بلند ہوتی تو میرا سامعہ کبھی کبھی چونک پڑتا اور میں ایسا محسوس کرنے لگتی جیسے سارا کنبہ میری میت پر بین کر رہا ہو، غرض اس گھما گھمی میں وہ تاریخ بھی آ گئی جسے عدالت کی اصطلاح میں پیشی کی تاریخ کہہ سکتے ہیں، مجھے سرخ جوڑا پہنایا گیا ناک میں نتھ جو ہندوستان میں سہاگ کی علامت سمجھی جاتی ہے ڈالی

گئی۔اس کے بعد چند سہاگنوں کی حراست میں پردے کے پاس لا بٹھائی گئی قاضی صاحب آئے اور آتے ہی یہ سوال کیا'' کیوں بیٹی کیا تم مجھے اپنا وکیل مقرر کرتی ہو کہ تمہارا نکاح پچاس ہزار روپیہ سکہ رائج الوقت اور پانچ دینار سرخ رقم معجّل پر حامد کے ساتھ پڑھ دوں''۔ کہئے اس سوال کے جواب میں مجھے کیا کہنا چاہیے تھا؟ ___ نہیں؟ ایک گرہست آشرم کی بیٹی جسے بچپن سے لے کر جوانی تک فرض کی کٹھ پتلی بننے کی تعلیم دی گئی ہو۔ یہ کیوں کر کہہ سکتی تھی۔ کیا میرے لئے قانون معاشرت بدل دیا جاتا کیا وہ طریقہ ازدواج منسوخ کر دیا جاتا جس کی برکت سے ہمارے ملک کی اہلی زندگیاں ہمیشہ سے پر امن رہتی آئی ہیں ___ پھر میں نے اپنے گرد و پیش نظر کی میری ممانیاں چچیاں پھوپھیاں اور خالائیں جو اس وقت مجھے گھیرے ہوئے بیٹھی ہیں کیا ان کے لئے بھی ایک ایسا ہی وقت نہیں آیا تھا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے دل میں بھی میری ہی طرح کوئی کھٹک موجود نہ ہو۔ آخر انہوں نے دل پر کیوں کر قابو پالیا اور کس طرح اہلی زندگی کے مراحل کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیل رہی ہیں ___ تو کیا میرا نفس ان کے نفس کے مقابلہ میں کسی طرح کمزور ہے ___ اس خیال سے میرے غرور کو چوٹ لگی اور میں نے پورے استقلال کے ساتھ قاضی صاحب کو جواب میں ہاں کہہ دی ___ قاضی صاحب چلے گئے۔ اس کے بعد رسم ہے کہ لڑکیاں رونے لگتی ہیں ___ اس خیال سے کہ وہ گھر جس گھر میں پل کر جوان ہوئی آج سے میرے لئے اجنبی ہو گیا مہمان کی طرح بلائی جاؤں گی اور مہمان کی طرح رخصت کر دی جاؤں گی۔ یہ احساس جدائی رونے کے لئے کم نہیں ہے، لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور رستا ہوا زخم بھی پھوٹ بہتا ہو۔ بہر کیف مجھے بھی رونا چاہئے تھا گو میری سسرال میکے کی دیوار سے لگی ہوئی تھی اور میرے لئے جدائی کا کوئی سوال نہ تھا لیکن رسم بہر حال رسم ہے میں بھی روئی۔ محمود کی محبت کی اتھاہ ندی آنسوؤں کی کفیل تھی آنسوؤں کی کیا کمی ہو سکتی تھی ___ روئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی ___ یہاں تک کہ میرا گریبان اور امی کا آنچل دونوں بھیگ گئے۔

(۷)

اب میں نے زندگی کی اس منزل میں قدم رکھا ہے جہاں پہنچ کر زندگی کے مسلسل امتحانات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے وہ امتحانات جن کے لئے عورت ماں کی گود سے سدھائی جاتی ہے ___ اس کے باوجود لوگ شادی کے پہلے سال کو جوانی کی بھری ہوئی گھٹاؤں کے برسنے کا موسم کہتے ہیں ___ لیکن یہ بھری برسات کا موسم میرے دل کی اس بستی کے لئے جس میں جاڑے کی سرد

ہوائیں چل رہی تھیں، کیا کیف انگیز ثابت ہوتا ___ ابر گھِر کر آئے برسے اور برس کر کھل گئے لیکن برف کے وہ تودے جو میرے دل کے گرد جمے ہوئے تھے نہ پگھلنا تھا نہ پگھلے ___ جھوٹ کیوں بولوں، میرا جسم کورہا حامد کے پہلو میں لیکن تصورات محمود کی آغوش کا خواب دیکھا کئے ___ یہ تھا میری ازدواجی زندگی پہلا سال۔

یہ کہنا بھول گئی کہ رخصتی کے دسویں دن میں نے محمود کو دیکھا تو اس کا خوبصورت چہرہ کمھلایا ہوا تھا اس کنول کی طرح جسے تالاب سے نکلے ہوئے کئی دن ہو چکے ہوں یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی ___ ایک ایسی ''شریر خوشی'' ہوئی جو فاتح کے دل میں مفتوح کو اپنے قدموں پر روندا ہوا دیکھ کر ہوتی ہے۔ میں اپنے نکاح کے وقت محمود کے ''قلندرانہ سکوت'' سے کچھ کبیدہ سی ہوگئی تھی میرا خیال تھا کہ اگر محمود کو مجھ سے سچی محبت ہوگی تو وہ کسی تیسری شخصیت کو ہمارے درمیان آنے نہ دے گا۔ اور تمام احتجاجی مظاہروں کے بعد وہ جارحانہ کارروایوں پر بھی اتر آنے میں دریغ نہ کرے گا۔ یہ تھی میری توقع، جس کے بالکل ہی خلاف وہ اپنی پہلی کوشش کے بعد اس چراغ کی طرح جس میں تیل نہ ہو بھڑک کر خاموش ہوگیا۔ اور میں نے سمجھ لیا کہ وہ ان نوجوانوں میں ہے جو پھولوں سے تو کھیلنا چاہتے ہیں لیکن انگاروں سے کھیلتے ہوئے ڈرتے ہیں ___ اور جن کا نظریہ یہ ہے کہ :

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجے
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجے

آج جو اس کا ستا ہوا چہرہ نظر پڑا تو مجھے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ اس کا دل اب تک میرے روتا ہے۔ لیکن یہ خوشی ایک لمحے سے زیادہ نہ رہ سکی پھر جو نظر اٹھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں میری اس مسرت پر تنقید کر رہی ہیں ___ اور زبان حال سے کہہ رہی ہیں کہ ''ہاں کیوں نہ خوش ہوگی سہاگ کی سیج پر جوانی کے ارمان نہ نکل رہے ہیں'' ___ میرا دل دکھنے لگا۔ ''آخر یہ کون سا خوشی کا موقعہ تھا۔ کہیں میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ کھیل گئی ہو، محمود نے مجھے کیا سمجھا ہوگا؟ کیا میرے چہرے پر اس بے چینی کے کوئی آثار نہیں جس نے میری سہاگ کی راتوں کو سوگوار بنا رکھا ہے'' ___ یہ خیال آتے ہی میں اپنی خلوت میں آئینے کے پاس دوڑی گئی تا کہ اس سے پوچھوں کہ کیا میرا چہرہ میرے دل کا ساتھ نہیں دے رہا ہے؟ آئینے نے کہا ''نہیں'' ___ آئینہ عورت کی طرح جھوٹا نہیں ہوتا کہ دل میں کچھ اور منھ پر کچھ ___ اس کے جواب سے مجھے تکلیف بھی پہنچی اور خوشی بھی ہوئی۔ تکلیف اس لئے کہ

''دل کا حال'' محمود پر ظاہر نہ ہوسکا اور خوشی اس لئے کہ ''حامد سے میں اپنے دل کا چور چھپانے میں کامیاب ہوں'' ___ میں نے مسہری پر لیٹ کر دل کی الجھنوں کو اخبار میں بہلانے کی کوشش کی ایک گھنٹہ بھی نہ گذرا ہوگا کہ میرا چھوٹا بھائی دوڑتا ہوا آیا ''باجی یہ کتاب محمود بھیا نے دی ہے''۔ محمود بھیا اور کتاب'' ___ دل دھڑکنے لگا ___ کتاب کھول کر دیکھی تو وہ اس خط کا لفاف ثابت ہوئی:

''مجھے بہت جلد بھول جانے والی سلیمہ ___ خوش رہو اور خوش رہو۔ اگر بچپن کی محبت اور دوشیزگی کے وعدے سہاگ کی سیج پر بھی پہنچ کے یاد رہتے ہوں تو میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں محمود ہوں ___ تمہارے گھروندے کا ساتھی ___ محمود ___ جس سے تم نے ایک بار نہیں بارہا جاڑے کی سناٹی راتوں میں، گرمی کی سنسان دوپہر میں، کھلی ہوئی چاندنی میں، بھری ہوئی برسات میں، نور کے تڑکے میں، شام کے دھندلکے میں، دھڑکتے ہوئے دل اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ یہ وعدہ کیا تھا کہ ''میں تمہاری ہوں'' کیوں کر انکار کروگی؟ ستاروں کی کھلی ہوئی آنکھوں نے دیکھا ___ ہوا کے جھونکوں نے سنا ہے فطرت کے مناظر گواہ ہیں، فضا کا سکوت گواہ ہے۔ امرود کا درخت گواہ ہے۔ وہ امرود کا درخت جس کی چھاؤں میں میرا اور تمہارا دل جوان ہوا، گھر کی وہ انگنائی گواہ ہے جس کی خاک ہمارے معصوم آنسوؤں کے بہت سے قطروں کو جذب کر چکی ہے ___ کیوں کر انکار کروگی سلیمہ!۔ جھوٹ بولوگی؟ تمہاری آنکھیں تمہیں جھٹلا دیں گی۔ تمہارا حافظہ تم پر ملامت کرے گا۔ تمہارا ضمیر تم سے روٹھ جائے گا ___ قسم ہے محبت کے ان خاموش پیغاموں کی جو آنکھوں کی زبان سے بھیجے اور دل کے کانوں سے سنے گئے کہ یہ دنیا اور اس کی تمام رعنائیاں بیوفا ہیں ___ چکور کہتا ہے کہ چاند بیوفا ہے پاس بلاتا ہوں اور دور رہتا ہے، دن کہتا ہے کہ رات بیوفا ہے پیچھا کرتا ہوں اور بھاگی جاتی ہے۔ بلبل کہتی ہے کہ پھول بیوفا ہیں مجھ سے جدا ہو کر بھی گلچین کی ٹوکری میں ہنستے رہتے ہیں ___ اور محمود کہتا ہے کہ سلیمہ بیوفا ہے دوسرے کی آغوش میں پہنچ کر بھی خوش نظر آتی ہے۔ سلیمہ بیوفا ہے، ہاں سلیمہ بیوفا ہے ___ برا نہ ماننا آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں انہیں حیرت زدہ آنکھوں سے تمہیں پھول کی طرح کھلا ہوا دیکھ چکا ہوں ___ کیا اب بھی کہوگی کہ تم اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں ہو ___ خدا کرے نہو ___ خدا کرے نہو ___ تم کیوں انکار کرو میرا دل خود میرے مشاہدے جھٹلا رہا ہے، اور تمہیں بیوفا سمجھنے پر راضی نہیں ہوتا:

اس ستمگر کو ستمگر نہیں کہتے بنتی
سعیِ تاویل خیالات چلی جاتی ہے

خدا کرے کہ میری تاویلات صحیح ہوں اور تم اب تک وہی سلیمہ ہو جو آج سے کچھ دنوں پہلے تھیں لیکن ان دلیلوں کو کیوں کر سمجھاؤں جو تمہارے خلاف میرے شکوک کا ساتھ دے رہی ہیں، بے شک تم مجبور تھیں کہ تمہارا نکاح کر دیا گیا لیکن کیا اقرار کے وقت قسمت کا پانسہ تمہارے میں ہاتھ میں نہ تھا تمہاری ایک ''نہیں''، مستقبل کا نقشہ بدل سکتی تھی، ایک انکار بزرگوں کا فیصلہ اور فیصلے کا رخ پھیر سکتی تھی، تمہاری ایک خموشی ___ ایک طویل خموشی قاضی صاحب کو واپس لوٹ جانے پر مجبور کر سکتی تھی لیکن تم نے میرے دل پر رحم نہ کیا، خدا بھی تمہارے دل پر رحم نہ کرے گا ___ یہ میں کیا کہہ گیا سلیمہ معاف کرو پیاری میں اب دیوانہ ہوں اس بری طرح کہ اب کچھ دنوں میں زنجیروں کی ضرورت ہوگی ___

کاش ہم تم یورپ کے آزاد ممالک میں جنم لئے ہوتے۔ ہندوستان غلام ہے اس لئے یہاں کے ہر رواج میں غلامی کی تخیل ہے ___ یہ بد بخت فطرت کو بھی بیڑیاں پہنانا چاہتا ہے۔ نکل چلو پیاری نکل چلو حیوانوں کی اس بستی سے ___ روحوں کے اس قبرستان سے زندگی کے اس دوزخ سے دور ___ بہت دور ___ ایک ایسی دنیا میں جہاں محبت مصلحت کی غلام نہ ہو ___ جہاں حسن و عشق میں اجنبیت نہ ہو ___ جہاں درد و درمیاں میں بیگانگی نہو ___ جہاں شوق کے لئے رواج کے کٹہرے نہ ہوں جہاں فکر کے لئے قانون کا پہرا نہ ہو ___ جہاں شمع کو ہوائیں نہ ستاتی ہوں۔ جہاں زندگی کو موت نہ دھمکاتی ہو ___ جہاں دریا بہتے ہوں اور موجوں کی زنجیر پاؤں میں پھندے نہ ڈالتی ہو۔ جہاں شبنم روتی ہو اور پھول اس کے گریہ بے اختیار کی ہنسی اڑاتے ہوں۔ جہاں نغمے فضا میں گونجتے ہوں ور ہوا کے جھونکے انہیں چرا نہ لے جاتے ہوں ___ ایک ایسی معصوم دنیا میں بھاگ چلو سلیمہ بھاگ چلو توڑ دو ان رواج کی زنجیروں کو جو تمہارے پاؤں میں ابر دستی پہنائی گئی ہیں ___ ثابت کر دو کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی زنجیروں کو نہیں پوج سکتی۔

ہاں تو سلیمہ بولو کیا کہتی ہو؟ میں نے صرف تمہارے لئے سارے کنبے سے ترک تعلق کر لینے کا تہیہ کر لیا ہے، دیکھیں اب تم میرے لئے کیا کرتی ہو ___ اگر تم میرے اس خطرناک ارادے میں حصہ لے سکتی ہو تو پھر کچھ دیر نہیں۔ آج بلکہ ابھی اسی شام کو ہمارے افسانہ محبت کا وہ دلچسپ باب شروع ہو سکتا ہے۔ شعر و موسیقی کی زبان میں جس کا عنوان ''بسنت کا موسم'' ہے:

چہ خوش است با دو یک دل سر حرف باز کردن
گلۂ گذشتہ گفتن سخنے دراز کردن

اثرِ عتاب بردن ز دلے ہم اندک اندک
بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

میرے پاس روپے نہیں سچے دوست ہیں، اور کچھ نہو جب بھی محبت کرنے کے لئے تندرست ہاتھ پاؤں ہیں، میں تمہیں ہر طرح خوش رکھ سکتا ہوں اور اس دنیا سے اتنی دور لے جا سکتا ہوں جہاں سوسائٹی کی آواز تو کیا قانون کا تازیانہ بھی ہمارا سراغ نہیں لگا سکتا۔ ہاں تو بولو میرے دل کی ملکہ کیا کہتی ہو___ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم محبت کے قانون کا کتنا احترام کرتی ہو، یاد رہے سلیمہ کہ محبت تمہارا امتحان لینا چاہتی ہے۔ پہلی اور آخری بار اگر تم میں میرا ساتھ دینے کی طاقت نہیں تو صرف لکھ بھیجو کہ میں اپنی قسمت پر قانع ہو کر جنگلوں کی طرف نکل جاؤں___ کیوں کہ یہ زنجیروں سے بھری ہوئی دنیا اب مجھے کاٹے کھا رہی ہے___ بس اور کچھ نہیں۔

اپنی لیلیٰ کا مجنوں
محمود''۔

خط کی ابتدائی سطریں میرے لئے کافی رقت انگیز تھیں۔ جی چاہا کہ ان کے جواب میں ایک ایسا خط لکھوں جس میں اپنے دل کی گرہوں کو کھول کر رکھ دوں لیکن جوں جوں آگے بڑھتی گئی ''غصہ'' تاسف کی جگہ لیتا گیا___ ''نکل چلو سلیمہ'' کیا محمود نے مجھے بازاری عورت سمجھ رکھا ہے۔ یہی فرمایش کرنی تھی تو کسی بازاری عورت سے محبت کیوں نہ کی تھی۔ اس خط کے جواب میں ایک ایسی تحریر جانی چاہیے جو اسے مایوس کر دے، قطعی مایوس۔ آگ پر تیل چھڑکنے کا وقت اب ختم ہو چکا پانی ڈالنے کی ضرورت ہے___ یہ سوچ کر میں نے قلم اٹھایا___ خط تیار تھا:

''میرے بھولے محمود___ خوش رہو___ خوش رہنے کی کوشش کرو___ کیوں کہ اس دنیا میں کوئی شخص خوش رہنے کی کوشش کئے بغیر خوش نہیں رہ سکتا۔ فطرت کا کارخانہ ہی یہی ہے۔

ع چناں نماند چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند

تم نے مجھے بیوفا لکھا ہے لیکن میں خوش ہوں کہ تم نے بہت جلد حقیقت کو پہچان لیا___ دلوں کا حال تو وہی جاننے والا جانتا ہے جو دلوں کی رفتار گن رہا ہے۔ مجھ میں وفا ہے یا نہیں یہ بجائے خود ایک سوال ہے لیکن اس کا مجھے خود اعتراف ہے کہ میں نے تمہاری محبت کے ساتھ وفا نہیں کی۔ کیوں نہیں کی؟ اس لئے نہیں کی کہ میں ایک سنجیدہ فکر کے بعد سچائی تک پہنچی کہ تم سے وفا کرنا بہت سے لوگوں

سے بیوفائی کئے بغیر ممکن نہیں ___ اور میری عقل سلیم نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک کے ساتھ بیوفائی کرنا بہت سے لوگوں کے ساتھ بیوفائی کرنے سے بہتر ہے۔ ماں کے ساتھ بیوفائی۔ باپ کے ساتھ بیوفائی، کنبے کے ساتھ بیوفائی۔ خاندانی روایات کے ساتھ بیوفائی۔ معاشرت کے قانون کے ساتھ بیوفائی ___ اور صرف تمہارے ساتھ وفا؟ ___ تو کیا دل صرف تمہارے ہی پاس تھا ___ تم کہو گے یہ محبت کے قانون کے ساتھ کھلی ہوئی بغاوت ہے ___ ہوسکتی ہے ___ یوں سمجھ لو کہ میری محبت اس حد تک نہیں پہنچی تھی جہاں پہنچ کر عقل دل کی لونڈی بن جاتی ہے۔ اگر محبت اسی کا نام ہے کہ اپنی خواہش کے لئے دنیا کی خواہش کو ٹھکرایا جائے۔ اپنے جذبات کی آسودگی کے لئے کنبے بھر کے جذبات کو ٹھیس لگائی جائے تو خدارا بتاؤ کہ خودغرضی کسے کہتے ہیں؟ اگر حد سے بڑھی ہوئی خودغرضی جرم ہے تو پھر حد سے گذرا ہوا عشق کیوں جرم نہ ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جرم کی تاریخ ایسے لوگوں کے ناموں سے کیوں خالی ہے جو جذبات کی رو میں حدود سے باہر نکل گئے ہوں۔

ہاں تو اب اپنے خط کا جواب سنو۔ تم لکھتے ہو کہ کاش ہم تم آزاد ممالک میں ہوتے۔ بیشک اگر ہوتے تو ایک دوسرے کو آنکھوں آنکھوں میں انتخاب کر کے گرجا کی محراب کے نیچے کھڑے ہو جاتے اور بڑی آسانی کے ساتھ میاں بیوی بن جاتے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ دل کی تشنگی بجھ جانے کے بعد رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے غیر متعلق نہ ہو جاتے۔ عشق میری نظر میں عناصر کا ایک ہیجان ہے۔ اعصاب کی ایک کمزوری ہے، نفس کی ایک خواہش دل کا ایک مطالبہ ہے اور دل کی فطرت یہ ہے کہ وہ بہت جلد اپنی موجود حالت سے اکتا جاتا ہے۔ سیر ہو جاتا ہے۔ غیر مطمئن ہو جاتا ہے، بچوں کی طرح پرانے کھلونوں کو پھینک کر نئے کھلونے کی آرزو کرتا ہے۔ جب دل کی فطرت یہ ہے تو مشرق اگر اپنے قانون ازدواج میں اس کی خواہشوں کی رعایت نہیں کرتا ہے تو زمانہ اس سے کیوں تیوریاں چڑھائے ___ تم کہتے ہو کہ یہ بدبخت فطرت کو بیڑیاں پہنانا چاہتا ہے۔ تم شاعر آدمی زنجیروں کا فلسفہ کیا خاک سمجھو گے۔ کاش تمہارے پاس دھڑکتے ہوئے دل کے علاوہ ایک سوچنے والا دماغ بھی ہوتا تو تم دیکھتے کہ مشرق کے فلسفہ ازدواج میں کہاں تک سچائی ہے۔ میرے بیوقوف دوست مشرق مغرب کی طرح مزدوروں کا ملک نہیں بلکہ فلسفیوں، پیغمبروں اور جوگیوں کی بستی ہے، یہاں ازدواج کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ دو محبت کرنے والے دلوں کو ان کی خواہش کا احترام کر کے ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے۔ بلکہ یہ ہے کہ دو دلوں دو اجنبی دلوں کو ازدواج کے رشتے میں جکڑ کر ایک دوسرے سے محبت

کرنے پر مجبور کیا جائے ___ اور جنہوں نے انسانی خواہشات کا نفسیاتی مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ زندگی کی کامیابی نفس کو مجبور کرنے میں ہے نہ کہ مطلق العنان چھوڑ دینے میں ہے۔ شادی نام ہے معاشرتی قیود کی سنہری زنجیروں کا ___ اور ظاہر ہے کہ ایک دل آزادی جس کی ''فطرت اول'' ہو بغیر کسی معقول تربیت کے قید خانے کی بندشوں میں لذت نہیں پا سکتا۔ فرض کرو کہ دو دل ایک دوسرے کے لئے بھوکے ہیں اور سماج ان کی بھوک کی رعایت کر کے انہیں ان کی مطلوبہ غذا دیتا ہے ___ لیکن کیا تمہارا فلسفہ یقین دلاتا ہے کہ وہ آگے چل کر کچھ اور نہ چاہیں گے ___ کیوں نہ چاہیں گے جب کہ ''ندرت پرستی'' ان کا خاصہ طبعی ہے، اور سوسائٹی نے شروع ہی میں ان کے ذوق کی رعایت کر کے ان کی ندرت پسندی کا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔ دو جملوں میں یوں سمجھو کہ مغرب کی معاشرت دل کا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ اور مشرق کی تہذیب اپنے طریقۂ ازدواج سے دلوں کو قناعت سکھلاتی ہے۔ یہاں پر اگر یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ رواج کو کیا حق حاصل ہے کہ شادی کے معاملے میں انتخاب کے حق کو جو فریقین کا فطری حق ہے، فریقین سے چھین کر ان بزرگوں کو دے دے کنبے کو دے دے سوسائٹی کو دے دے، تو سنو انتخاب کا حق نوجوان جوڑوں کو دینا ننھے بچے کے ہاتھ میں چھری دے دینے کے برابر ہے، نوجوانی میں انتخاب کی نظر سطح پر لوٹ کر رہ جاتی ہے، جلد اور ہڈیوں سے نیچے اترنے کی کوشش نہیں کرتی۔ دور کیوں جاؤ خود اپنی آنکھوں سے پوچھو کہ اس نے میری طرف کبھی اس ارادے سے بھی دیکھا ہے؟ دیکھنا تو درکنار سینے کے اندر کی حقیقتیں کبھی اتفاق سے نظر بھی آ جاتی ہیں تو مئے عشق کے متوالے طرح دے جاتے ہیں، کیوں نہیں؟ مطلب تو صرف لطف اندوزی سے ہے اور وہ ہر حال حاصل ہے ___ روح میلی ہے تو ہو صورت تو اجلی ہے۔ آیا سمجھ میں کچھ؟ یہی وجہ ہے کہ مغرب سے لے کر مشرق تک ''کورٹ شپ'' والی شادیاں عموماً اپنے مقصد میں ناکام رہتی ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ''آنکھ کا نشہ'' جوں جوں کم ہوتا جاتا اور ''دل کی پیاس'' جوں جوں بجھتی جاتی ہے، نگاہیں نقاد ہوتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ تنقید کی روشنی اور تجربے کے اجالے میں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی کمزوریاں نظر آنے لگتی ہیں ___ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعلقات کی زنجیریں اگر بیچ سے ٹوٹ نہیں جاتی ہیں تو کم از کم ڈھیلی ضرور ہو جاتی ہیں، ہاں تو یہی وہ صدیوں کا تجربہ ہے جس کی بنا پر ہمارے ملک نے انتخاب کا حق بزرگوں کے اور کنبے والوں کے ہاتھ میں دے رکھا ہے، ظاہر ہے کہ ان کا تجربہ اور ان کی پختہ مغزی اس کو اچھی طرح سمجھ سکتی ہے کہ کون لڑکا کس لڑکی کے لئے ہے اور کون لڑکی کس لڑکے کے لئے ہے۔ اب رہا یہ کہ اگر کوئی شخص اپنی جہالت سے

اپنے لڑکے لڑکیوں کو اندھا دھن کنویں میں جھونکدے تو قصور اس کا ہے کہ اس نے اس حق کو ناجائز طور پر استعمال کیا ___ اصول کو کیوں برا کہا جائے۔ اب تو سمجھ میں آ گیا کہ ''یہ بد بخت ملک فطرت کو کیوں بیڑیاں پہناتا ہے'' ___ یہ ہے ہمارا نظریہ ازدواج جس نے ہمارے ملک کی ۹۰ فیصدی ''متاہل زندگیوں'' کو خوشگوار اور کامیاب بنا رکھا ہے، اب رہی یہ ناگوار حقیقت کہ اس نظریہ کے ماتحت تھوڑے سے ''خواہش زدہ'' دل فرض کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھ جاتے ہیں تو چڑھ جائیں، اس میں کیا مضائقہ ہے اکثریت تو چین سے ہے ___ اس کے مقابلہ میں ذرا عینک لگا کر اپنے یورپ کے ''آزاد ممالک'' کو دیکھو ''ان غلامان فطرت'' کو دیکھو کہ ''فطرت'' کے ہاتھوں ان کے نظام معاشرت کی بندھنیں کس بُری طرح کھلی جا رہی ہیں ___ اب تو نہ کہو گے کہ یہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود میں ''جوش عشق'' میں وہ حرکت کر جاتی جس کے بعد کنبے کی شرافت ہمیشہ کے لئے سوسائٹی کو سامنے اپنی گردن نیچی کر لیتی ___ سوچو تو کہ میں ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہو کر نکاح کے وقت انکار کر جاتی تو اس میرے انکار کا نتیجہ جماعت کی ذہنیت پر کیا مرتب ہوتا ___ کیا میری اس بے باکی کے بعد ''شرفا'' کو اپنی لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا حوصلہ ہوتا ___ تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ میری ایک نفسانی خواہش کی بدولت قوم و ملک کی بہت سی معصوم بچیاں علم کی نعمت سے محروم رہ جائیں ___ خدا تمہیں سوچنے والا دماغ عطا کرے تم مجھے ایک ایسی دنیا میں بلا رہے ہو جو کم از اس خلائے بسیط میں کہیں آباد نہیں ___ شاعر کے خواب میں آباد ہو تو ہو ___ تمہارے دماغ کی پرورش اور تمہاری ذہنیت کی تعمیر ان انسانوں کے لئے ہے جو ''روح'' کو ''دل'' کا غلام بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں، اس لئے تم میری اور اپنی محبت کو بھی افسانہ بنانا چاہتے ہو، اور خود اس کا ہیرو بننے کے لئے بے چین ہو۔ یہی نہیں بلکہ مجھے بھی دعوت دے رہے ہو کہ میں ''گرہست مندر'' کی چار دیواری سے نکل کر افسانے میں ''ہیروئن'' کا کام کروں ___ کس طرح کا فسانہ؟ اسی طرح کا ایک افسانہ جسے عورت اور مرد کی گمراہیاں آئے دن بناتی رہتی ہیں ___ وہی ہجر و وصال کی فرسودہ داستان جسے ادب کی زبان اور ادیب کا قلم نت نئی رنگینیوں کے ساتھ دہراتا رہتا ہے۔ وہی ''نگاہ اور دل'' کی پرانی کہانی جسے موسیقی فضا میں بلند کرتی رہتی ہے۔ اچھالتی رہتی ہے۔ کیا کہوں کہ کیسی کہانی؟ ایک عورت ایک نوجوان مرد کے ساتھ محبت کرتی ہے۔ شوق کی پیاس بجھانے کے موقع نہیں ملتے اس لئے معاشرتی حدود سے باہر نکل جاتی ہے۔ اس کے بعد مرد بیوفائی کرتا ہے عورت خودکشی کرتی ہے یا بازار حسن کی رونق بڑھاتی ہے ___ سنتے سنتے اور پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتا گئی۔

جی نہیں چاہتا کہ ایک ایسی بے مزہ اور فرسودہ داستان میں ایک اور کا اضافہ کروں، بنانی ہی ہے تو ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں جو آنکھوں میں سرمہ اور دماغ کو روشنی دے۔ ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں جو مغرب کی بیٹیوں پر یہ حقیقت روشن کر دے کہ مشرق کی بیٹیاں کیا کر سکتی ہیں، ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں کہ دنیا حیرت کی انگلیاں دانتوں میں دبائے دیکھتی رہ جائے کہ ایک عورت، ایک جوان عورت، محبت نے جس کے سہاگ کی سیج میں کانٹے بو دئے تھے، ان کانٹوں کی بیچ پر زندگی کی آخری شام تک اس طرح سویا کی، اس خندہ پیشانی سے سویا کی جیسے اس کا جسم گوشت وخون کا بنا ہوا نہ تھا ___ ایک ایسی کہانی کیوں نہ بناؤں کہ اونچے گھرانے کی بلند نظر لڑکی نے اپنے محبت بھرے دل کو نفس کشی کی سل پر رکھ کر فرض کے بٹّے سے اس طرح کچل دیا جیسے وہ دل نہ تھا گوشت کا ایک معمولی ٹکڑا تھا، جو قصاب کی دوکان سے منگوایا گیا تھا ___ تم گھبراؤ نہیں میں بھی ایک افسانہ مرتب کر رہی ہوں، لیکن اس طرح کا ___ محمود! چکّی چلتی ہے اور چلتی رہے گی ___ اس کا کام دانوں کو پیس کر مفید سے مفید تر بنا دینا ہے۔ کوئی بیوقوف دانہ اگر اپنے پسینے کی شکایت کرے تو یہ اس کی بے بصری ہے کاش اس کے پاس چکی چلانے والوں کی بصیرت ہوتی۔ محمود! میں وہ دانہ ہوں جس کے پاس اتفاق سے بصیرت کی آنکھیں ہیں ___ پس رہی ہوں لیکن اپنی حالت پر مغرور ہوں ___ یہ سمجھ کر مغرور ہوں ___ کہ کام آ رہی ہوں ___ برباد نہیں ہو رہی ہوں۔ ''نکل چلو پیاری سلیمہ نکل چلو'' کاش یہ لکھنے سے پہلے تمہارے قلم پر فالج گر پڑتا۔ حافظ نے شاید تمہارے کانوں میں پھونک دیا ہے کہ :

من از آں حسن روز افزوں کہ یوسف داشت دانستم
کہ عشق از پردہ عصمت بروں آرد زلیخا را

لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستان کی ایک بیٹی نے ''ایرانی شاعر'' کے اس نظریہ کی تردید کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے ___ اور خدا نے چاہا تو زمانے کی آنکھیں دیکھ لیں گی کہ ''سلیمہ'' نے کو جھٹلا دیا۔ محمود! سن لے کہ تیرا حسن میری نظر میں کسی طرح یوسف کے ''حسن روز افزوں'' سے کم نہیں ہے، لیکن وہ ایک مصر کی عورت تھی جو اپنے یوسف کے لئے ''پردۂ عصمت'' سے نکل کھڑی ہوئی اور میں ایک ہندوستان کی لڑکی ہوں جو عشق کے ساتھ فرض کی ڈوری کو بھی مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہے گی۔

تمہاری طرز تحریر سے یہ بو آتی ہے کہ تم خواہ مخواہ جنون کی دعوت دے کر اپنے پاس بلانا چاہتے ہو۔ اگر ہو تو تعجب نہیں اس لئے کہ بچپن سے لے کر جوانی تک تم ایک ایسا لٹریچر پڑھتے آئے ہو

جورودکی سے لیکر غالب تک علانیہ ڈنکے کی چوٹ جنون کو ہشیاری پر ترجیح دیتا آیا ہے۔ کیا اس کا کچھ اثر نہ ہوگا۔ لکھتے ہو کہ ''اب کچھ دنوں میں زنجیر کی ضرورت ہوگی'' خدا مبارک کرے۔ یہ وہ گہنا ہے جس کو تم سے پہلے تمہارے بہت سے بھائی پہن چکے ہیں، لیکن خدا کے لئے اس گہنے کو اتار کر جوش جنوں میں صحرا کی راہ نہ لینا ورنہ یاد رہے کہ محبت کا قانون تمہیں ماخوذ کرے گا اور میں انصاف کی کرسی پر بیٹھ کر تم پر بیوفائی کی فرد جرم قائم کروں گی ___ راسخ کی زبان سے:

قیس پھرتا جو رہا دشت میں دیوانہ تھا
اس کو لیلیٰ ہی کے دروازے پہ مرجانا تھا

کہو شاعر ہو ___ کھسیانی ہنسی نہ ہنسو ___ اس شعر کا کیا جواب ہے۔ ہاں تو یہ سمجھ لو کہ لیلیٰ کے دروازے پر رہو گے تو لیلی کی آواز تو سن سکو گے۔ لیلیٰ کی ایک جھلک تو دیکھ سکو گے۔ لیلیٰ کی کوئی خدمت تو کر سکو گے۔ پاک محبت کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔ کیا تمہاری آنکھیں مجھے روزانہ کئی بار دیکھ لینے پر قناعت نہیں کر سکتیں۔ کیا محبت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جس چیز سے تم محبت کرو وہ قانونی حیثیت سے تمہاری ملک بھی ہو ___ یہ تو ملکیت کا وہی جذبہ قدیم ہے ''گڑیا خوبصورت ہے مجھے ملنی چاہیے حامد بھیا کو کیوں مل گئی'' ___ میں تو اسی میں خوش ہوں کہ قسمت نے تم کو مجھ سے چھین لیا اور چھین کر بھی مجھ سے قریب ہی رکھا۔ پاک محبت کو (گو پاک محبت اس آب وگل کی دنیا میں قطعاً ممکن نہیں) جوں توں کر کے نباہ جانے کے لئے دیور بھاوج کا رشتہ کیا کم ہے؟ میں ہندوستانی عورت ہوں اس لئے میری تخئیل اور میرا مذاق دونوں ہندی ادب سے متاثر ہے ___ میرے لئے دیور بھاوج کا رشتہ بجائے خود عاشق اور معشوق کے رشتے سے کم مزیدار نہیں ہے کیا تم نے وہ گیت نہیں سنا:

دیورواچھینے موراہار

تصور تو کرو کیسی حسین زندگی ہے کیسا مزیدار کھیل ہے۔ پاکیزہ بھی اور پر کیف بھی، پھر پرانے زمانے کو بھول کر بالکل بھول کر نئے رشتے کے ماتحت کیوں نہ ہم تم بھی عمر بھر یہی کھیل کھیلتے رہیں۔ کھیلتے رہیں چہلیں کرتے رہیں۔ یہاں تک کہ بڑھاپا آ کر دلوں کے دروازے بند کر دے۔ اس کے علاوہ میری ایک آرزو ہے۔ ''آرزو'' لفظ کی اہمیت پر غور کرو ___ اگر تم واقعی وفا کے مدعی ہو تو میری ہر آرزو کا احترام، عملی احترام تمہارا عاشقانہ فرض ہے۔ اچھا تو وہ یہ کہ تم جلد سے جلد اپنی زندگی کا شریک ڈھونڈ لو ___ ڈھونڈ لو باغ میں ہر طرف پھول ہی پھول ہیں، غور سے دیکھو کسی نہ کسی پھول پر تمہارا

نام بھی ضرور لکھا ہوگا۔

''جوانی دیوانی''، مشہور ہے اس عمر میں اس قسم کے جذباتی دورے کوئی عجیب چیز نہیں ہیں، خدا وہ دن کرے کہ چاند سی بنّو بیاہ کر گھر میں لاؤ ___ دنیا اجالی ہو جائے گی۔ اور جوانی کے وہ نجارات جو دماغ پر چڑھ کر تمہیں ایسے خواب دکھلاتے ہیں جن کی کوئی تعبیر نہیں جب گھٹا بن کر برس جائیں گے تو پھر میں پوچھوں گی کہ تم کہاں تھے؟

محمود! آنکھیں کھولو! پھر کہتی ہوں اور نہایت سنجیدگی سے کہتی ہوں کہ جو راہ تم اختیار کر رہے ہو وہ بخط راست ظلمات کو گئی ہوئی ہے ___ چھوڑ دو اس راہ کو۔ نتیجے کی روشنی کا انتظار نہ کرو ___ کیوں کہ یہ اس وقت نمودار ہوتی ہے جب آدمی پوری طرح گم ہو چکتا ہے ___ بس اور کیا کہوں زیادہ ''داغ اور ماتم فراق''۔

راقمہ۔ تمہاری لیلیٰ''۔

خط کتاب میں رکھ کر محمود کے پاس بھیجدیا۔ اس کے بعد دل کو تو دھڑکنے کی عادت ہی ہوگئی تھی اس نے پھر دھڑکنا شروع کیا ___ یہ سوچ کر کہ کہیں محمود مجھ سے مایوس ہو کر سچ مچ جنگلوں کی راہ نہ لے۔ کئی دن تک انہیں اندیشوں میں الجھی رہی۔ ___ تیسرے دن محمود کی صورت نظر آئی ___ تیوریوں کا چڑھاؤ کم ہو چکا تھا لیکن افسردگی پہلے سے زیادہ تھی محبت نے کہا کہ دوڑ کے اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کی بلائیں لے لوں ___ لیکن کیا کرتی جی مسوس کر رہ گئی ___ چوتھے دن رات کے کوئی دس بجے بھائی نے کھانے پر بلایا ___ آئے تو عالم ہی دوسرا تھا۔ چہرے پر جیسے کسی نے سرخی مل دی ہو، آنکھیں چڑھی ہوئی لال لال ڈورے قدم میں لغزش چال میں ایک طرح کی بے اختیاری ___ بھائی ان کے، سر جھکائے کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے ان کی حالت پر غور نہ کیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا ___ اور دیر تک دیکھتی رہی ''آج اس خدا کے بندے کو کیا ہو گیا ہے'' ___ بھائی ان کے، جب کھانا کھا کر ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے میں گئے تو میں نے آہستہ سے پوچھا ''یہ کیا حال ہے''؟ کہنے لگے کہ:

عقل تو درد سرِ تست بہ مئے سودا کن
کہ بلا ہرچہ رود برسر عاقل بہ رود

یہ شعر پڑھا اور جوٹھا ہاتھ لئے لڑکھڑاتے ہوئے باہر چلے گئے ___ میں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی ___ اس کے بعد ان کی حالت پر چند آنسو ___ آج اس کہانی کو یہیں پر ختم سمجھئے، گو شمع اور رات

دونوں میری عمر کی طرح آدھی باقی ہیں لیکن میرا فرض مجھے پکار رہا ہے ___ چھوٹا بچہ سوتے سوتے جاگ اٹھا ہے۔ (ندیم، بہار نمبر ۱۹۳۵)

●

[(اوپر) **طبع شدہ حصہ کا خلاصہ:** سلیمہ اور محمود کے گھروندے کی محبت جوان ہر ک ایک تلخ حقیقت بنتی ہے، لیکن سماج کا قانون سلیمہ کو محمود سے بیاہنے کی جگہ محمود کے بڑے بھائی حامد سے بیاہ دیتا ہے، شاعر مزاج محمود سلیمہ کو محبت کے نام پر سماج کی دیواریں پھاند جانے کا مشورہ دیتا ہے لیکن سلیمہ کا روایت پرست دماغ سوسائٹی کے اس فیصلہ سے بغاوت کرنے سے انکار کرتا ہے وہ محمود کو ایک خط لکھ کر فلسفہ معاشرت کی روشنی میں قدیم طریقہ ازدواج کی خوبیاں جتلاتی ہے، حسن وعشق کے رنگین نظریوں کا مضحکہ اڑاتی ہے، اور محمود کو موجود حالت پر قانع رہنے کی تلقین کرتی ہے، تلقین کرتی اور خود احساس فرض کے ماتحت اپنے جذبات کو ہمیشہ کے لئے کچل دینے کا عزم کرتی ہے ___ وقت کی گرم رفتار ہی جذبات شوق اور احساس فرض کی اس کشمکش کو ایک افسانہ بناتی جارہی ہے۔ ایک ایسا افسانہ جس کے صفحوں پر عورت کے خاموش آنسوؤں نے کہیں کہیں زندگی کے بولتے ہوئے نقوش بھی بنادئے ہیں]۔

●

ایک ہفتے سے کچھ زیادہ گذر گیا لیکن ملاقات جسے کہہ سکتے ہیں وہ مجھ سے اور محمود سے ایک لمحے کے لئے بھی میسر نہ آئی، وہ گھر میں آتے آ کر بیٹھتے اور پھر فوراً ہی اٹھ کر چلے جاتے۔ گفتگو کا موقعہ نہ ملتا۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی، کنواری زندگی میں اکثر ایسا اتفاق ہوا کیا ہے کہ وہ مجھ سے اور میں ان سے ہفتوں کیا مہینوں تک نہیں بولی، آنکھوں ہی لڑائیاں بھی ہوئیں اور صلح نامے بھی مرتب ہوتے رہے۔ لیکن اب کے دل کا کچھ اور ہی حال تھا، کچھ اور ہی فرمایش اور کچھ اور ہی تقاضا۔ اس ایک ہفتے میں اس نے کئی بار میرے قابو سے باہر ہو جانے کی کوشش کی، مچلا اور بری طرح مچلا، میں اسے زنجیر پہنانا چاہتی اور زنجیروں کا فلسفہ اس کی سمجھ میں نہ آتا۔ میں کہتی کہ فطرت کے حدود کو پہچان وہ کہتا کہ فرض کے حدود کو فطرت کیوں کہتی ہو۔ غرض مجھ میں اور میرے دل میں وہ مباحثہ شروع ہو گیا جس کا سلسلہ عمر کی درازی کے ساتھ جوانی کی شام تک قائم رہا۔

ان چند دنوں میں محمود کی زندگی میں کچھ ایسی کایا پلٹ ہو گئی تھی کہ گھر کے کونے کونے میں ان کے متعلق سو گوشیاں ہونے لگی تھیں، جتنے منھ اتنی زبانیں۔ کوئی کہتا کہ لڑکا باؤلا ہو گیا ہے، کوئی کہتا کہ نہیں کچھ پینے لگا ہے، شرابی کی آنکھ نہیں چھپتی، ایک دن آتو جی نے خود مجھ سے کان میں کہا کہ ''کل محمود میاں آدھی رات کو نشے میں چور آئے، اور صبح تک دربان کی پلنگڑی پر پڑے سویا کئے''۔ چچی جان حسب عادت ان کا اترا ہوا چہرہ اور چڑھی ہوئی چتونیں دیکھ کر کہتیں، بیچارے کے گھروندے کی سہیلی حامد نے چھین لی۔ کیسے جی نہ کڑھائے۔ کبھی ہنسی ہنسی میں ان سے مخاطب ہو کر کہتیں جی نہ کڑھاؤ محمود میں

تمہارے لئے چاند سی دلہن ڈھونڈ کر لاؤں گی، سلیمہ کس گت کی ہے توبہ، ناک پھلکی، منھ طباق۔ وہ ہنستے اور کھسیانی ہنسی ہنستے۔ میں سنتی اور گھونگھٹ میں مسکرا کے رہ جاتی۔ لیکن یہ خیال رہ رہ کر میرے دماغ کی رگوں کو خون چوس رہا تھا کہ محمود کو میری محبت برباد کر رہی ہے اور میں اسے بچا نہیں سکتی ___ بہر حال مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اسے برباد ہونے کے لئے چھوڑ دیا۔ اور خود اپنی حفاظت کی فکر میں مبتلا ہوگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کی نگاہ اور میرے دل میں جو ٹکریں ہوتی رہتی ہیں وہ ایک نہ ایک دن میرے ''احساس فرض'' کو ضرور پاش پاش کر کے رہیں گی۔ اس لئے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو اس کی نظروں سے بھاگنے کی کوشش کی جائے گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں نے طریقہ اختیار کیا کہ جب وہ اپنے بھائی کے پاس آتے تو میں فوراً وہاں سے اٹھ جاتی، ان کے قدموں کی چاپ سنتی اور بلا تمہید اٹھ کھڑی ہوتی، ان کے بھائی خانگی معاملات میں ہر چھوٹی سی چھوٹی بات کو پرکھنے اور کریدنے کے عادی تھے، میری اس اضطراری حرکت کو بھی انھوں نے دیکھا اور دیکھتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک دن تنہائی میں مجھ سے پوچھ ہی بیٹھے۔ کیوں صاحب! یہ محمود جب آتا ہے تو آپ بھاگ کیا جاتی ہیں، میرے تریا چرتر نے صاف گوئی میں مصلحت سمجھتے ہوئے کہا۔ تو کیا آپ نہیں جانتے کہ وہ بچپن سے مجھ سے پیار کرتے ہیں؟ کہنے لگے کہ آپ پیار کرنے کی چیز ہی ہیں۔ میں نے کہا پیار کی نظروں سے گناہ بھی جھانکتا ہے۔ بہت ہنسے اور کہنے کہ حسین عورت کو دیکھ کر جوان آدمی کی نظر سے گناہ ہی جھانکتا ہے، خدا نہیں جھانکا کرتا ___ میں نے جھنجھلا کر کہا وہ جو کچھ بھی ہو یہ میرا طبعی میلان ہے۔ میرا بس ہو تو میں ان سے پردہ کروں ___ کہنے لگے کہ میرا بس ہو؟ کیا معنی۔ آپ کی ہر چیز آپ کے بس میں ہے۔ لیکن گذارش یہ ہے کہ اس فیصلے پر نظر ثانی کی جائے۔ یہ تو کسی طرح ممکن نہیں کہ آپ محمود سے پردہ کریں۔ میرے خیال میں اس کی کسی حال میں ضرورت نہیں ___ اور اگر آپ جھنجھلائیں نہیں تو یہ عرض کرنے کی جرأت کروں کہ مجھ سے بیوی کی عصمت سے زیادہ بھائی کی خاطر عزیز ہے۔

ان کی گفتگو چونکہ مذاق کا پیرایہ اختیار کر رہی تھی اس لئے میں نے بھی وہی انداز اٹھالیا۔ ''بہت اچھا جیسی آپ کی رائے ہو لیکن میں بھی آخر جوان عورت ہوں۔ اور ان کے ساتھ کی کھیلی ہوئی ___ اگر کوئی نوع دگر ہو تو مجھ پر الزام نہ رکھئے گا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور انھوں نے ایک قہقہے کے ساتھ جواب دیا۔ بسم اللہ اگر آپ کے پاس خوش قسمتی سے ایک دیور ہے تو مجھے بھی اللہ میاں نے سالیاں دے رکھی ہیں، میں بہر صورت اپنا انتقام لے لوں گا۔ غرض میری اسکیم ایک مضحکہ ہو کر رہ گئی، لیکن عورت کے دماغ میں

اسکیموں کی کیا کمی ہوسکتی ہے۔ میں اپنے مقصد کے لئے دوسری اسکیم بنانی شروع کی۔ میرے شوہر حال ہی میں بیرسٹری کی ڈگری لے کر یورپ سے آئے تھے۔ اور کسی ہائی کورٹ میں اپنا پیشہ شروع کرنا چاہتے تھے۔ میرے صوبے میں گو ہائی کورٹ کھل چکا تھا، لیکن میں نے ان کی قوت فیصلہ کو اپنی بہت سی مضبوط اور کمزور دلیلوں سے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ وطن کو خیر باد کہہ کر کلکتہ ہائی کورٹ میں اپنے پیشے کی مشق شروع کریں، بیچارے میری محبت کے ہاتھوں موم کی ناک تھے راضی گئے ___ لیکن اعزا نے ایک خاصہ طوفان اٹھایا۔ بڑے بوڑھوں نے نشیب و فراز دکھلائے بڑی بوڑھیوں نے قسمیں دے دے کر سمجھایا۔ لیکن بیرسٹر صاحب اپنے فیصلے پر اڑے رہے۔ وہ کیا اڑے رہے میں اڑی رہی ___ غرض میں نے کلکتہ کے لئے رخت سفر باندھا اور وطن کو خیر باد کہنے میں بہت ہی عجلت سے کام لیا اور یہ آپ جانتے ہیں کہ کیوں؟ ___ میں محمود کی نگاہوں سے بھاگ رہی تھی، اور بھاگ آئی۔ کلکتہ پہونچ کر میری زندگی نے شادی کے بعد اطمینان کا پہلا سانس لیا یہ سوچ کر کہ محمود کے حلقہ نظر سے نکل کر دل کو سیدھی راہ پر لے چلنا شاید ممکن ہوگا، آپ کا شاعرانہ ذوق مجھے بیوفا سمجھے گا، اور سمجنا بھی چاہیے۔ اس لئے کہ میں نے محبت کے مقدس ترین جذبے سے بیوفائی کی اور اس کی حقیقت کو کچھ نہ سمجھی مگر یہ کہ ایک عارضی ہیجان ایک وقتی تموج۔ ایک نفسیاتی کمزوری ___ بہر کیف میں نے شوہر کے لئے عاشق کو چھوڑ دیا ___ گو اس کے ساتھ بھی یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اگر میں چاہتی تو دونوں سے بہ یک وقت کھیل سکتی تھی، عمر بھر کھیل سکتی تھی۔ مگر میرے غرور کے لئے اس دوعملی زندگی میں کوئی لذت نہ تھی۔ میرے غرور نے اسے گوارا نہ کیا کہ خود فریب کھاؤں اور دوسروں کو فریب دیتی رہوں ___ زندگی کی بولائی ناؤ نے گھاٹ کو پہچانے میں غلطی کی یا نہیں اس کا فیصلہ وقت کرسکتا تھا، اور اس نے کیا''۔

(۹)

کون کہتا ہے کہ عقل جنون پر فتح نہیں پاسکتی اور عشق کے جذبات فرض کے احساس کے ما تحت مغلوب نہیں کئے جا سکتے۔ میں نے خود انہیں ایک حد تک مغلوب کیا اور حالات اگر میرے ناموافق نہ ہوتے تو شاید پوری طرح مغلوب کر لیتی۔

میں کلکتہ پہنچ کر محمود کو بھولنے لگی ___ آپ سمجھیں گے کہ کلکتہ کی دلچسپیوں نے محمود اپنے اندر گم کر لیا، نہیں ایسا نہیں ہے، مجھے تو اس شہر میں ہر جگہ نجد ہی کی ہوائیں چلتی ہوئی نظر آئیں، ہر جگہ جنون کی دعوت، سنیماؤں میں جنون کی دعوت و ناچ گھروں میں جنون کی دعوت، سوسائٹی کے ہر رنگین

مشغلے میں جنون کی دعوت ___ میں دل کی موت چاہتی تھی اور دنیا میرے دل کے واسطے ہر طرف زندگی کا تحفہ لئے کھڑی تھی، یہاں تک میں نے اس کے تقاضوں سے گھبرا کر اس کے دروازے اپنے اوپر بند کر لئے اور گھر سے نکلنا چھوڑ دیا، کتب بینی کا مجھے شوق تھا، میں نے کوشش کی اپنے کو کتابوں میں دفن کر دوں، لیکن وہاں بھی میرے لئے ادب لطیف کی مصیبت تھی، کوئی ماہوار یا ہفتہ وار رسالہ کوئی ناول یا کوئی افسانہ کوئی دیوان یہاں تک کہ کوئی نظم اور کوئی غزل مجھے ایسی نہ ملی جس میں میرے دل کے لئے میرے دل کی نوشت کے لئے جنون کا پیغام اور جنوں کی دعوت نہو، شاعری مجھ سے محمود کی سفارش کرتی، موسیقی میرے ضبط نفس کا مضحکہ اڑاتی، افسانے میرے احساس فرض پر طنز کرتے ___ اور مصوری حسن وعشق کی زندگی کے مرقعے پیش کر کے مجھے فرض کی دنیا سے خواب کی دنیا میں بلانا چاہتی۔ میں نے عاجز ہو کر ادب لطیف کے ساتھ تمام فنون لطیفہ سے اپنا رشتہ توڑ لیا۔ لیکن ان آوازوں کا میرے پاس کیا علاج تھا، جو میرے اردگرد گونجتی رہتیں، میرے مکان کے سامنے کالج کے چند لڑکے رہتے تھے، راتوں کے سناٹے میں اور علم کے سرسوتی کے یہ ہونہار بچے جب موسیقی کی دیوی راگنی سے عشق بازی کا سبق پڑھتے تو میرا سویا سلایا ہوا دل ان کی آواز سے چونک اٹھتا۔ اور ان کی ہر تان مجھے محمود کا وہ گیت یاد دلاتی جو وہ اکثر تنہائی میں گایا کرتا تھا:

ع اناڑی سیّاں کیا جانے پریت کی ریت

اور مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ محمود کی نشیلی آواز میرے دل میں اتر رہی ہے۔ ایک دن کوئی لڑکا کسی شاعر کی یہ غزل گا رہا تھا:

محبت بھی ہے اک عجب آشنائی
بہ معنی تعلق بصورت جدائی

میرا دل اچھلنے لگا اور میں نے محسوس کیا کہ اس بہ ''معنی تعلق بصورت جدائی'' میں میرا اور محمود کا افسانہ حیات بند ہے۔ اس کے بعد چند اشعار اور تھے۔ ہر شعر پر میرا دل ایک کروٹ بدلتا۔ یہاں تک کہ مقطع میں شاعر نے مطلع کے مضمون کو الٹ کر میری اور محمود کی داستان محبت کی جگہ میری ازدواجی زندگی پر طنز کیا:

جمیل اس تعلق سے ہے فائدہ کیا
بصورت تعلق بہ معنی جدائی

اور میں چند لمحوں کے لئے سمجھنے لگی کہ واقعی ایسا تعلق سوسائٹی کی زبردستی اور سماج کا ظلم ہے ____

خدا سمجھے ان شاعروں سے جو اپنے دل کی شورشوں کو دوسرے دلوں تک پہونچانے کی کوشش کرتے اور اپنے ہیجان نفس میں ساری دنیا کو شریک کرنا چاہتے۔ صرف سلیمہ ہی کو نہیں ملکہ ہر اس محبت کے ستائے ہوئے انسان کو جو اپنے دل کو سمجھا بجھا کر زندگی کی سیدھی راہ پر چلانا چاہتا، شکایت ہے ان شاعروں سے ان افسانہ نویسوں سے، ان مطربوں اور رقاصوں سے جو دلوں کو مچلنے کی ترغیب اور نفس کو بغاوت کا مشورہ دیتے ہیں، اور انہیں سمجھتے، انسان ان کے نغموں کی مٹھاس میں گم ہو کر اگر ان تلخ حقیقت کو فراموش کر دے، جن سے اس کی زندگی اور اس کی سوسائٹی کی ترکیب ہے، تو کیا ہو؟

جو لوگ کہ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا ان کے خوابوں کے پیچھے آوارہ رہے انہیں چاہئے کہ پہلے تمدن کا شیرازہ بکھیر دیں سوسائٹی کے نظام اکھاڑ پھینکیں، فرض کے بندھنوں کو ایک ایک کر کے کاٹ دیں۔ اور ان تمام ضرورتوں کا منھ بند کر دیں، طبیعت کا قانون جن کی زبان سے بولتا ہے، ور جب یہ سب کچھ کر چکیں تو پھر اس کے بعد یہ فرمایش کریں کہ دنیا زندگی اور معاشرت کی ناقابل تردید حقیقتوں کو پوجنے کی جگہ صرف نوک پلک کو خط و خال کو رنگ و روغن کو پوجتے رہے، پریم ساگر میں غوطے کھاتی رہے، پریم بانسری کی ہر دین پر اپنی زندگی سناتی رہے۔ جب تہذیب کی رنگینیاں اور لطافتیں اور مجلس تمدن کی ساری رونق اور چہل پہل موقوف ہے صرف ان محرکات پر جو سوائے ترغیب جنسی کے ہمارے اندر کسی اور جذبے کو حرکت میں نہیں لا سکتے تو پھر بہتر یہ تھا کہ سوسائٹی کا ایک ایسا نظام ہوتا جس میں گھر نہ ہوتے گھر والے اور گھر والیاں نہ ہوتیں، ازدواج کا قانون نہ ہوتا، اولاد کی ذمہ داری نہ ہوتی، ماں باپ نہ ہوتے، ماں باپ کے حقوق نہ ہوتے، یہی نہیں بلکہ سینوں میں مامتا کے شعلے نہ اٹھتے۔ پیٹ میں بھوک کی چبھن نہ ہوتی۔ سردیوں میں ہمارے اعصاب کی ٹھٹھرن ہم سے کپڑوں کا مطالبہ نہ کرتی، برسات میں بادل کی پھواریں ہم سے ایک چھت بنوانے اور ایک سایہ دار جگہ میں رہنے کی فرمایش نہ کرتیں ____ لیکن جب ایک ایسی سوسائٹی کی تشکیل ممکن نہیں ہے اور جب یہ تمام معاشرتی ذمہ داریاں ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ سکتیں ____ جب بھوک لگنا ناگزیر ہے جب ازدواج کا قانون سوسائٹی کو گھیرے ہے، جب برادری اور سماج کے حقوق ہمارے چاروں طرف دائرہ کھینچے ہیں، تو پھر غور کیجئے کہ ان نظموں ان افسانوں اور ان گیتوں کے کیا معنی ہیں جو ہمارے دلوں کو گدگدا کر ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم اپنے ذوق نظر کے مطلوب کے لئے اپنا سب کچھ لٹا دیں، ساری زنجیروں کو توڑ دیں، تمام چار دیواریوں کو

ایک نعرہ ہو کے ساتھ پھاند جائیں، اور انا للہ، آزادی کی یہ ساری ترغیبیں اور قانون شکنی کے تمام مشورے کس لئے ہیں، اپنی ایک خواہش کی غلامی کے لئے۔ میں نے اپنی ایک ذلیل خواہش کے لئے اپنے سماج کی بہترین خواہشوں کو نظر انداز کرنا نہیں پسند کیا اس لئے جہاں تک ممکن ہو محمود اور محمود کی محبت کو بھولنے اور بھلانے کی کوشش کرتی رہی زنجیروں کو پوجتے رہی، تمناؤں کو بہلاتی رہی، محمود نے مجھے بیوفا سمجھا۔ میری شاعر قسم کی سہیلیوں نے مجھے بے مروت کہا، میں نے آنچل پھیلا کر ان کے طعنوں کو شکریئے کے ساتھ سمیٹ لیا اور جس راہ کو اپنے لئے بہتر سمجھا اس راہ پر چل پڑی ___ بلاشبہ مجھے اس راہ پر اپنے دل کی قربانی کرنی پڑی، لیکن میں نے کسی طرح قانون شکنی کو گوارا نہیں کیا۔

بہر حال میں نے جب یہ محسوس کیا کہ سوسائٹی کے رنگین مشغلے مجھے گرہست آشرم میں نچلا نہیں بیٹھنے دیتے تو میں نے لٹریچر میں پناہ لینی چاہی، لٹریچر میں بھی جب مجھے پناہ نہ ملی، تو میں نے دماغ سے پوچھا کہ اے بد بخت روشنی پھینک اور راستہ دکھلا کہ خدا کی یہ بندی کدھر جائے، کدھر جائے بھاگ کر ان گیتوں سے جو تجھے لوریاں دے رہے ہیں، کدھر جائے بھاگ کر خوابوں کی اس فضا سے جہاں محبت کے نغمے نیند چھڑک رہے ہیں ___ دماغ اگر چہ اونگھ رہا تھا، لیکن ابھی اسے پوری طرح نیند نہ آئی تھی، اس نے جماہی لے کر کہا، کہیں نہ جا اپنے گھر ہی میں رہ اپنی دنیا آپ بنا ___ میں نے اپنے گھر کو اپنی دنیا سمجھ کر اسے بنانا شروع کیا اور کوشش کی اس کے دھندوں میں اپنے کو گم کر دوں، کھو جاؤں ___ اور اپنے دل کی آگ کو چولھے میں پھونک دوں۔ اور اپنے دماغ کی الجھنوں کو سوئی اور دھاگے کی رشتہ دارانہ کشمکش میں الجھا دوں۔ یہ فیصلہ کر کے میں نے جہاد شروع کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانداری کی مصروفیتوں نے مجھے بہت جلد اپنا لیا ___ یہاں تک کہ میں محمود سے زیادہ ان کی ہوگئی ___ محمود سے زیادہ ان کے متعلق سونچنے لگی۔

میرے شوہر اپنے باورچی سے نالاں تھے وہ ان کی پسند کے مطابق کھانا پکا نہیں سکتا اور یہ اپنی حد سے بڑھی ہوئی مروت کی بنا پر اس کو جواب نہیں دے سکتے تھے۔ غرض ایک کشمکش کو اس طرح حل کیا کہ ان سے کہا آپ اپنے باورچی کو تو اپنا اردلی بنا لیں اور اپنا باورچی خانہ باہر سے اندر منتقل کر دیں۔ میں خود آپ کی مرضی کا کھانا تیار کرنے کی کوشش کروں گی، کہنے لگے کہ جو کھانا آپ کی تکلیف کے بعد پلیٹوں میں آئے گا وہ میرے حلق سے اترے گا کیوں کر۔ میں نے کہا شاعری چھوڑیئے آپ آج صاحب بنے ہیں اور میری اور آپ کی ماں بہنیں صدیوں سے یہی کرتی آ رہی ہیں، اور یہی کرتی رہیں

گی۔ میں بچپن سے اس کی عادی ہوں، اس کے علاوہ میرے ساتھ جو دائیاں آئی ہیں وہ میرا ہاتھ بٹائیں گی، آپ بسم اللہ کر کے جو کہتی ہوں وہ کیجئے۔ میں گھر کی مالکہ ہوں اور یہ مسئلہ میری مملکت کے حدود میں آتا ہے۔ آپ کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے اور میں نے باورچی خانہ گھر میں منگوالیا۔ باورچی صاحب اب دن بھر ٹانگ پھیلا کر سویا کرتے اور بیڑی پیا کرتے۔ ان کے متعلق اب گھر کی نگرانی کے سوا کوئی خاص خدمت نہ تھی، میں ان کے عوض باورچی خانہ میں جلتی۔ اور اس کے باوجود ان کی شکر گزار تھی، کیوں کہ اس جلنے میں میرے لئے سکون تھا، باورچی خانہ عورت کے لئے خود فراموشیوں کی ایک ایسی جنت ہے جہاں پہونچ کر نہ سنگار کی ہوس رہتی ہے، نہ خود آرائی کا جنون نہ بچوں کی پروا، نہ پردیسی پیا کی یاد ــــــ کم از کم میرا تجربہ تو یہی ہے کہ جب باورچی خانے میں ہوتی تو چولھے کی حقیقی آنچ کے سامنے محبت کی مجازی آنچ بہت کم تکلیف پہونچاتی۔ یہ خوف کہ سالن کہیں جل نہ جائے دال میں نمک کہیں تیز نہ ہو جائے۔ روٹی کہیں زیادہ تاؤ نہ کھا جائے مجھے اپنے دل سے باتیں کرنے کا بہت ہم کم موقع دیتا۔ اور جب دل سے باتیں موقوف ہو گئیں ــــــ تو اس کے ساتھ محبت کا پیچ وتاب بھی خود بخود کم ہوتا گیا۔

خانہ داری کی ان مصروفیتوں سے مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی اس لئے کہ میری پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں نئی تہذیب کی روشنی ''زنان خانے'' تک نہیں پہونچی تھی۔ میرے ابا جان نے مجھے انگریزی کی کافی تعلیم دلوانے کے ساتھ جہاں تک پردے کی پابندیوں نے اجازت دی تھی مجھے نئی تہذیب سے روشناس بھی کرا دیا تھا لیکن ماحول کا اثر مجھ پر تعلیم کے اثر سے زیادہ تھا۔

(۱۰)

آپ نے تصویر کا ایک رخ دیھ لیا ــــــ دیکھ لیا کہ ایک کمزور عورت نے کس طرح اپنے جذبات پر فتح پانے کی کوشش کی۔ اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ ہو ــــــ ملاحظہ ہو کہ طاقتور مرد جس کے اعصاب میں فطرت نے غیر معمولی طاقتیں ودیعت کی تھیں کس طرح اپنے دل کی غلامی کرتا رہا ــــــ وہ دل کی غلامی جو اکثر اوقات مرد سے عورت کی غلامی کراتی ہے ــــــ یادش بخیر محمود کا یہ عقیدہ تھا کہ عشق کا درد لذتوں سے معمور ہے اور اپنے اس عقیدے میں ان کو اتنا غلو تھا ان کی غزلیں ہمیشہ اس خیال کی تبلیغ کرتی رہیں، لیکن تجربے نے انہیں بتایا کہ یہ عقیدہ کچھ نہ تھا مگر ایک خالص شاعری۔ اگر درد میں واقعی لذت ہوتی تو ہرگز دوا کی تلاش میں انھیں بازاروں کی خاک نہ چھاننی پڑتی۔ اپنی محبوبہ کو کھو کر اس کی

جدائی کے درد میں نہ جانے ان کے لئے لذت کیوں نہ رہی کہ انہیں اس سے چھٹکارا پانے کے لئے یک گونہ بےخودی کی تلاش میں بوتل کی لال پری کو منھ لگانا پڑا ___ اور جب بربادی کی یہ پہلی منزل بہ آسانی طے ہوئی، تو یہاں سے دوسری منزل کا فاصلہ ہی کتنا تھا:

ع نکلے میخانہ سے اور کوئے بتاں تک پہونچے

کوئے بتاں کی آبادی میں شاید ہی کوئی بتکدہ ایسا ہو جس کی چوکھٹ پر محمود کی پیشانی نے اپنے سجدہ ہائے عبودیت کے اثرات نہ چھوڑے ہوں۔ ''دل کی دوا'' بیچنے والوں کے کوچے میں شاید ہی کوئی شفاخانہ ایسا ہو جہاں محمود کے ''درد'' نے درمیان کی جستجو میں نقد خودداری کوڑیوں کے مول نہ لٹایا ہو ___ حسن کی رعنائیاں، محبت کے جذبات اور عورت کا دل بکری کی چیز ہو یا نہ ہو لیکن ہمارے مردوں کے تجربے کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ یہ چیزیں بازار میں بکتی ہیں، سونے چاندی اور جواہرات کے بھاؤ ٹکتی ہیں، لیکن بکتی ہیں، اور لوگ خریدتے ہیں ___ اور خرید کے خوش ہوتے ہیں، محمود بھی اسی خریداری کا سودا لے کر اس بازار میں گئے اور ثریا کی دوکان پر پہونچ کر خود بک گئے۔ ثریا میرے شہر کی وہ مشہور مجلس آرا عورت تھی جس کی فتوحات کا دائرہ شہر کے سرمایہ دار حلقے سے نکل کر خانقاہوں تک پہونچ گیا تھا اور ایک پیر صاحب اس کی کافر جوانی میں خدا کے جلوے دیکھنے لگے تھے۔ ہاں تو ایک ایسی خطرناک عورت جو پہلی ہی نظر میں اپنے شکار کا سارا خون چوس لینے میں مشہور ہو چکی ہو، محمود کی طرف متوجہ ہوئی اور محمود اس کی نظر کے حلقے میں اس بڑی طرح گھرے کہ عید کی نماز کے لئے اس کے کوٹھے سے نہ اترے، اور گھر میں عید کے چاند کی طرح بھی نمودار نہ ہو سکے۔ بھائی جان کے خط سے ہمیں محمود اور ثریا کا حال معلوم ہوا۔ ان کے بھائی نے کچھ دیر کے لئے تیوریاں چڑھائیں لیکن میرا دل کئی دن تک سینے میں اچھلتا رہا، جھوٹ کیوں بولوں اس خبر سے میرے غرور کو ٹھیس لگی اور یہ سمجھ کر کہ ثریا مجھ سے زیادہ حسین تھی جبھی تو اس نے محمود کو مجھ سے چھین لیا اور محمود مجھے بھول کر اس کا ہو رہا، خودغرضی کے پاس انصاف کی آنکھیں نہیں ہوتیں، میں محمود کو بھولتی جا رہی تھی، بھول جانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن جب محمود نے مجھے بھول جانے کی اپنے نقطۂ نظر سے ایک صورت پیدا کی تو وہ صورت حال میرے لئے ناگوار ثابت ہوئی اور میں تھوڑی دیر کے لئے یہ سمجھنے لگی کہ مرد کی ذات خلقی طور پر بیوفا ہوتی ہے۔ بہرحال میں اپنے خیالات کے ساتھ چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح بل کھاتی رہی اور جب تک محمود کو ایک زہر میں بجھا ہوا خط نہ لکھ چکی وہ زہر نہ اترا جو میرے دل سے لے کر دماغ تک چڑھا ہوا تھا:

''محمود میاں کو: ان کی پیاری سلیمہ کا سلام پہونچے،

پھلنے پھولنے اور خوش رہنے کی دعاؤں کے ساتھ ___ گھروندے کی محبت اور پچھلی زندگی کے تصورات کے ساتھ ___ جواب ڈھلتی رات کے چراغ کی طرح گل ہوتے جارہے ہیں، موجودہ ''مشاغل لطیف'' میں ان کے ''احساس کامیابی'' پر مبارک باد کے مخلصانہ جذبات کے ساتھ ___ محمود میاں کو ان کی پیاری سلیمہ کا سلام پہونچے۔ محمود میاں! خدا مبارک کرے آپ اپنے حال سے خوش اور ماضی کی طرف مڑ کر نہ دیکھتے، میرے لئے اس سے زیادہ خوشی اور کیا ہوسکتی ہے۔ آپ کا کنبہ آپ کی موجودہ زندگی سے مطمئن نہیں لیکن میں بہر حال مطمئن ہوں۔ ''بھوک'' کسی قسم کی کیوں نہ ہو ''غذا'' کی تلاش اس کے لئے ناگزیر ہے، آپ بھوکے تھے آپ کی بھوک نے پہلے گھر میں اپنے لئے غذا تلاش کی، میں سامنے تھی لیکن میری خودداری نے آپ کا لقمہ بننا گوارا نہ کیا۔ اور ظاہر ہے جب گھر میں کھانا نہیں مل سکتا تو بازار کا کھانا کھانے میں کون سا حرج ہے، دل کی بھوک بھی آخر بھوک ہے اور نفس کی پیاس بھی آخر پیاس ہے۔ اس کو بجھانا یا بجھانے کی کوشش نہ کرنا کوئی اخلاقی جرم کیوں ہو، ایک پیاسے کے لئے جو بہت زیادہ پیاسا ہو، یہ سوال کبھی نہیں پیدا ہوتا کہ چشمہ گدلا ہے یا کنویں کے پانی میں ملیریا کے کیڑے ہیں، آپ کی تشنگی نے بھی اگر آپ کو ایک ایسے گھاٹ پر پہونچا دیا جس کا پانی خالص نہیں تھا تو دنیا آپ پر کیوں طعنہ زن ہو۔ پیاس بجھ جانے پر آپ کی آنکھیں خود کھل جائیں گی، اور آپ کا ذایقہ کڑوے اور میٹھے پانی میں خود تمیز کرنے لگے گا۔ جوانی کی نیند جھنجھوڑنے اور غل مچانے سے نہیں ٹوٹی۔

آپ کے بھائی نے مجھے ہدایت کی ہے کہ آپ کو ایک واعظانہ خط لکھ کر آپ سے زندگی کے نشیب و فراز پر غور کرنے کی فرمایش کروں۔ لیکن میرے خیال میں آپ جو زندگی آج کل بسر کر رہے ہیں اس پر غور کرنا ایک غیر شاعرانہ حرکت ہے۔ آپ شاعر ہیں اور زندگی کے متعلق شاعر کا نقطۂ نگاہ ہمیشہ یہی رہا ہے ___ کہ:

دیوانہ باش تا غم تو دیگراں خورند
آنرا کہ عقل بیش غم روزگار بیش

پھر آپ حالات کی ان شیرینیوں میں جب کہ زندگی کا ہر گھونٹ شہد سے زیادہ میٹھا ہے ___ عقل کا مصرف کیوں لیں ___ اور عقل کا مصرف لے کر زندگی کے کسی ایک لمحے کو بھی تلخ کام کیوں بنائیں۔ یہ دیکھ کر کہ ثریا کے حسن کی جگمگاتی ہوئی روشنی نے میرے حسن کے نقوش کو آپ کے

دماغ سے محو کر دیا، میرے غرور کو تھوڑی سی چوٹ لگتی ہے، لیکن جب یہ غور کرتی ہوں تو چوٹ کا احساس جاتا رہتا ہے کہ آپ شاعر ہیں اور شاعر ذات کا نہیں صفت کا پرستار ہوتا ہے۔ آپ کو میری آنکھوں کا نشیلا پن اور پلکوں کا نیچے کی طرف غیر معمولی جھکاؤ بہت پسند تھا۔ لیکن یہ جھکاؤ یہ نشیلا پن دنیا کی اور بہت سی آنکھوں میں ممکن ہے پھر کوئی وجہ نہ تھی کہ آپ کا ذوق نظر میری ہی آنکھوں کے تصور کو پوجتا رہتا۔ حسن وعشق کی دنیا میں شاعر بلبل کا مقلد اور بلبل کا حال یہ ہے کہ وہ کسی ایک پھول کی پابند نہیں، وہ ہر پھول پر ٹھونکیں مارتی ہے، ہر شاخ پر ڈورے ڈالتی ہے۔ ہر کلی سے رس چوستی ہے۔ جب وہ مجرم نہیں تو شاعر کیوں مجرم ہو اور آپ کیوں مجرم ہوں۔

اب رہا یہ سوال کہ آپ ہمیشہ سے عشق کو ایک لازوال حقیقت سمجھتے آئے تھے، تو یہ آپ کے فکر خامی اور تجربے کی بے مائیگی تھی اور آپ کی ناتجربہ کاری کو کیوں قصوروار کیا جائے جب رومی عرفی اور غالب جیسے مفکر شاعر اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے میں نے اپنے پہلے خط میں آپ سے گذارش کی تھی کہ آپ جلد سے جلد اپنی زندگی کا شریک ڈھونڈ لیں۔ لیکن اب سمجھتی ہوں کہ وہ تجویز سراسر غلط تھی اس لئے کہ آپ کے جیسے بے چین طبیعت والوں کے لئے ''عمر خیامانہ'' زندگی بہت موزوں ہے ___ جو خود پابند نہیں رہ سکتا اسے کیا حق حاصل ہے کہ دوسرے کو اپنا پابند کرے :

کسی کا ہو رہے آتش کسی کو کر رکھے
دو روزہ عمر کو انسان رائیگاں نہ کرے

لیکن آتش کا یہ پیام صرف ان کے لئے ہے جو کسی کے ہو کر رہ سکتے ہیں، ورنہ بیکار کسی کو کر رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ اپنی ثریا کے ساتھ خوش رہئے، ثریا نہ سہی زہرہ سہی، مشتری سہی، مریخ سہی، آنکھوں کو مطلب تو بس روشنی سے ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ آپ برباد ہو رہے ہیں، لیکن میں سمجھتی ہوں کہ کام آ رہے ہیں، کسی کے نہیں تو ثریا کے کام آ رہے ہیں،.....اس کی بہنیں بھی آخر ملک کی بیٹیاں ہیں، آپ جیسے خوش ذوق اور منچلے نوجوان اگر ملک میں نہ ہوں گے تو ملک کے وہ بیٹیاں جو شکار کے خون پر جیتی ہیں ان کے لئے شکار کہاں سے آئیں گے۔ جب تمدن اور سوسائٹی کا فیصلہ یہ ہے کہ ملک کی کچھ عورتیں حسن فروشی کی دوکانیں کھول بیٹھیں اور اسی کی روٹی کھائیں، تو جو لوگ برباد ہو کر ان کی روٹی مہیا کر رہے ہیں، انہیں برباد کہنا نہیں چاہیے۔ یہ ملک کی ایک اقتصادی خدمت ہے، اور خدا مبارک کرے کہ آپ اس خدمت

میں بہت پیش پیش ہیں، زیادہ دعائے خیر۔ اپنی ثریا کو میرا سلام کہئے اور خوش رہیے۔ لیکن کبھی کبھی یہ بھی یاد کرلیا کیجئے کہ: کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

کسی زمانے میں، آپ کی

سلیمہ''

خط کے جواب کا انتظار رہا ___ دوسرے ہفتے میں جواب آیا، لیکن کس طرح: میرا خط واپس کردیا گیا تھا، صرف اس کی پشت پر بیتاب کا یہ شعر تھا اور بس :

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بو نے کیا
بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

(۱۲)

میری داستان میرے شوہر کے بغیر نامکمل ہے ___ اس لئے آیئے آج ان کا تعارف آپ لوگوں سے کرادیا جائے، تندرست ہاتھ پاؤں مگر غیر متناسب خط وخال کا ایک معمولی آدمی، فطرت نے جس کے چہرے کی سجاوٹ میں ذرا بھی فیاضی سے کام نہ لیا ہو ___ سر بڑا مگر پیشانی چھوٹی، آنکھیں سیاہ اور بڑی لیکن کیفیت سے خالی ___ مونچھیں خوبصورت مگر ہونٹ بدنما ___ یہ تھا میرے شوہر ڈاکٹر حامد حسن بیرسٹر کا حلیہ ظاہری ___ اب رہے خصائل باطنی، سو اپنی طبیعت کا آدمی میری برادری میں تو کوئی نہ تھا، خدا کی اس لمبی چوری دنیا میں ہو تو مجھے انکار نہیں ___ ایک ایسی طبیعت کا آدمی جس نے زندگی میں ایک بار بھی کسی حاجت مند کے سوال کا نفی میں جواب نہ دیا ہو، جو دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھنے میں اس درجہ فیاض ہو کہ آپ اپنی شخصیت کو بھول جاتا ہو، جس کے نوکروں کو یہ حسرت رہ گئی ہو کہ انکا مالک ایک بار بھی ان سے جھڑک کر گفتگو کرتا، جس کی بیوی کو یہ ارمان رہ گیا ہو کہ ازدواجی زندگی کے دس سالوں میں ایک بار بھی اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی دیکھتی ___ جس نے جاڑے کی سرد رات میں اپنا لحاف ایک سردی سے کانپتے ہوئے فقیر کو دے دیا ہو اور خود ساری رات اور کوٹ اوڑھ کر بسر کی ہو۔ جس نے عید کے دن اپنے بچوں کو ایک غریب و دوست کے یہاں بھیجتے ہوئے ان کے قیمتی کپڑے اس لئے اتار لئے ہوں کہ انکا لباس دیکھ کر اس گھر کے بچوں کا غمزدہ دل اور کڑھے گا ___ جو اپنی بذلہ سنجی کے لئے اس درجہ مشہور ہو کہ بغیر اس کے شہر کی محفلیں ہمیشہ سنسان سمجھی گئی ہوں، جس کی علمی صلاحیتوں کا یہ حال ہو کہ مورخوں میں مورخ، شاعروں میں شاعر اور فلسفیوں میں فلسفی بن جاتا ہو، جس نے ملک

کے سیاسی ہنگاموں میں حصہ لیا ہو اور اپنی پالیسی پر سختی سے قائم رہنے کے باوجود اپنی خوش طبعی سے تمام مختلف الخیال جماعتوں کا محبوب بنا رہا ہو ___ اس مزاج، اس طبیعت اور اس صلاحیت کا آدمی یقیناً پوجنے کی چیز تھا ___ لیکن جیسا کہ خود ان کا بیان تھا کہ ہندوستان سے لے کر یورپ تک کسی عورت نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا، صرف اس لئے کہ وہ حسین نہ تھا، اس کے چہرے میں کوئی جاذبیت نہ تھی ___ نہ جانے تمدن نے زمانے کی نظر کو اتنا سطح پرست کیوں بنا دیا کہ اسے جلدوں اور ہڈیوں سے نیچے کی حقیقتیں سجھائی نہیں دیتیں، لیکن مجھے دوسروں پر اعتراض کرنے کا کیا حق حاصل ہے جبکہ میں خود ان کے ساتھ پرستش کا حق ادا نہ کر سکی اور عمر بھر ان کے قدموں پر رہ کر ان کے بھائی کی یاد کو پوجتی رہی۔

میری رخصتی کا تیسرا دن تھا ___ وہ آئینے کے سامنے کھڑے شیروانی کے بٹن لگا رہے تھے میں پیچھے سے آئی آئینے پر میرا عکس پڑا، کہنے لگے کہ ''قسمت کے مذاق بھی عجیب ہوتے ہیں، میرے جیسے عجیب الخلقت حیوان کو دیکھو اور پھر اس کامنی کو دیکھو، جو صرف سونگھنے کی چیز ہو'' ___ تو پھر چھوتے کیوں ہیں؟ میں نے مسکرا کر کہا، کہنے لگے کہ ''چھوئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا''۔ یہ کہہ کر آئینے میں اپنی صورت کو دیکھا پھر مجھے دیکھا اور ایک ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جس میں تاسف کا حصہ بہ نسبت خوش دلی کے زیادہ ہو۔ کہنے لگے''۔ لوگوں نے تمہارا اور ہمارا رشتہ جوڑ کر تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا، کم از کم تمہارے حسن کے ساتھ یہ بڑی ہی ناانصافی کی گئی، میرا اور تمہارا جوڑ سوسائٹی کی ایک ایسی غیر شاعرانہ حرکت ہے جس پر توضیح کی صنعت اور تناسب کا لفظ ہمیشہ ماتم کرے گا ___ یہ چند جملے غالباً انھوں نے اس توقع سے کہے تھے کہ میں اخلاقاً ہی سہی ان کے اس فیاضانہ اعتراف کی تردید کر کے ان کے دل کا بوجھ ہلکا کر دوں گی ___ لیکن اس وقت میرے دماغ پر میاں محمود بری طرح مسلط تھے ___ میں صرف ہنسی اور ہنس کر چپ ہو گئی۔

اور انھوں نے ایک مرجھائے ہوئے تبسم کے ساتھ مجھے دیکھا اور باہر چلے گئے ___ بات ختم ہو گئی لیکن تجربے کی روشنی میں جب مجھے ان کی اصل شکل نظر آئی تو میں نے خود ایک دن چھیڑ کر یہی ذکر نکالا اور پیار سے جو بلاشبہ مصنوعی تھا، ان کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا ''جی نہیں یہ آپ کا انکسار ہے، میرے لئے آپ سے زیادہ موزوں شوہر ممکن ہی نہ تھا ___ دنیا کی ہر عورت یہاں تک کہ دنیا کی سب سے بڑی عورت مسز سروجنی نائڈو بھی اگر حسن اتفاق سے آپ کی بیوی بن گئی ہوتیں تو آپ کی روح کی خوبصورتی دیکھ کر آپ کی لونڈی بن جاتیں ___ ہمیشہ کے لئے ___ رہا یہ کہ آپ اپنے کو

خوبصورت نہیں سمجھتے تو یہ بھی آپ کی آنکھوں کا قصور ہے، میرا معیار حسن آپ کے اس خیال کی تائید نہیں کرتا''۔ بہت ہنسے بہت ہنسے اور بہت ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس دن کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ کوئی بوجھ تھا جو میری اس گفتگو نے ان کے دل سے سرکا دیا ___ وہ پہلے سے زیادہ خوش نظر آنے لگے اور ان کے پیار میں جو ایک خاص قسم کی سردی تھی جسے میرے رخساروں نے اکثر محسوس کیا تھا وہ اس دن کے بعد گرمجوشی سے بدل گئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ کوئی مخلص بھی کسی مرتبہ کا کیوں نہ ہو، اگر حساس ہے تو کسی حسین عورت سے اس وقت تک محبت کا مطالبہ نہیں کرسکتا، جب تک کہ وہ خود اپنے میں عورت کے لئے کوئی کشش محسوس نہ کرتا ہو ___ گو دنیا میں برخود غلط لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے، لیکن ایسے لوگوں میں یا تو خود شناسی کا مادہ ہی سرے سے مفقود ہوتا ہے، یا پھر یہ کہ ان کا آئینہ ان سے جھوٹ بولا کرتا ہو ___ یا یہ کہ وہ دولت مند ہوں اور دولت مندی کو اپنے زعم میں سب سے بڑی خوبصورتی سمجھتے ہوں ___ یا پھر یہ کہ شاعر یا انشا پرداز فلسفی یا حکیم ہو کر اس دھوکے میں مبتلا ہوں کہ ان کا علمی اور ادبی وقار عورت کو مرعوب کرے گا۔ حالانکہ عورت کا دل ان چیزوں سے نہ مرعوب ہوسکتا ہے، نہ متاثر۔ تمدن نے ابتدا ہی سے اسے لنگھی چوٹی میں مبتلا کر کے ظاہر پرستی'' اور ''سطح پروری'' کو اس کی فطرت ثانیہ بنا دیا ہے ___ ظاہر ہے کہ وہ عورت جو ہاتھوں کو بقول غالب ''مرہون حنا'' اور گالوں کو ''رہن غازہ'' کر چکی ہو اس کی نظر کی پہونچ اگر ہوگی تو کتنی؟ ___ بہر کیف یہ سطح پرستی کچھ ہم عورتوں ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہمارے مرد اس معاملے میں تم سے کہیں زیادہ کمزور ہیں ___ ہمارے قدیم و جدید لٹریچر جنہیں ہمارے جذبات لطیفہ کی تاریخ کہنا چاہیے ہم سے یہی کہتے ہیں کہ عشق کے بازار میں ''دل کا سودا'' ہمیشہ اسی قیمت پر پٹتا رہا۔ سلیمہ اگر اپنے شوہر حامد سے باوجود اس کی بہت سی نفسیاتی خوبیوں کے، محبت نہ کرسکی تو سوسائٹی اسے کیوں گنہگار سمجھے جبکہ آپ کی آغوش میں ہمیشہ سے رنگ و روغن کی پوجا ہو رہی ہے۔ اور اس کے معلمین بھی ہمیشہ سے اسی رنگ و روغن کو اپنی بصیرت کا سرمایہ سمجھتے آئے ہیں، اور اسی خط و خال میں حقیقت کے خط و خال دیکھتے آئے ہیں۔

(۱۳)

ہاں تو میں انکا ذکر کر رہی تھی ___ پچھلی سطروں میں آپ ان کے حلیہ ظاہری اور باطنی سے واقف ہو چکے، اب رہے ان کے خیالات، تو فلسفے کی باقاعدہ تعلیم اور یورپ کے سہ سالہ قیام نے ان کے اخلاقی اور معاشرتی نظریوں کو بہت کچھ تبدیل کر دیا تھا، تو عورتوں نے کبھی ان کو اس کا موقع نہ دیا تھا

کہ وہ ان سے دلچسپی لے سکیں، تاہم وہ حقوق نسواں کی حمایت اس گرمجوشی سے کیا کرتے کہ سمجھنے والا یہ کہنا کہ عورت کے دل کی نبض ہمیشہ اس شخص کی انگلیوں کے نیچے رہی ہے ___ ایک دن میں رسالہ عصمت کے لئے ایک مضمون بھیج رہی تھی، مضمون کے نیچے میرے دستخط تھے (سلیمہ حامد حسن)۔ کہنے لگے یہ ''سلیمہ حامد حسن'' کیا بلا ہے۔ کیا تم میری ملکیت ہو کر تمہاری شخصیت پر میرے نام کا لیبل ضروری ہے۔ یہ رواج ہے یورپ کے اس عہد جہالت کا جب وہاں عورت ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ شادی سے پہلے باپ کی اور شادی کے بعد شوہر کی۔ عورت باپ کی ملک ہو تو شوہر کی تو کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ شادی معاشرتی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ ایک ٹھیکا ہے، ایک مفاہمت ہے، ایک معاہدہ ہے جیسا کہ عام طور پر، دو فریقوں میں ہوا کرتا ہے''، میں مسکرا کر چپ ہو گئی۔ اور انھوں نے قلم اٹھا کر اپنا نام کاٹ دیا، ایک دن ہندوستانی عورت کے مستقبل پر گفتگو ہو رہی تھی، کہنے لگے کہ کامنی (وہ مجھے پیار سے اکثر کامنی کہا کرتے تھے) اگر میں کسی دوسری عورت کا ہو جاؤں تو تم کیا کرو گی؟ یہی نا کہ گھر میں بیٹھی میرے نام کی تسبیح پڑھتی رہو۔ میں نے کہا کہ بھارت کی بیٹیوں کا تو دھرم ہی یہی ہے ''دھرم ہی یہی ہے''، میرا منھ چڑھا کر بولے: یہی وہ بڑھاوے ہیں، جنہوں نے عورت کے غرور کو جھوٹی آسودگی دے کر اس کے جذباتی حقوق غصب کر لئے ہیں، میں نے پوچھا کہ جذباتی حقوق کیا بلا ہیں، جھنجھلا کر بولے پہلو میں دل اگر بالکل مردہ نہ ہو گیا ہو اور تمہاری بدبخت معاشرت نے اسے بالکل مار ڈالا ہو۔ تو اس سے پوچھو۔ میں نے کہا کہ وہ تو آپ کے جوتوں کے نیچے کچلا پڑا ہے، گھبرائیے نہیں، آپ نے نہیں کچلا، میں نے خود اسے آپ کے جوتوں کے نیچے رکھ دیا ہے، ہندوستان کی بیٹیوں کا مذہب ہی یہی ہے۔ اس کے جواب میں وہ مسکرائے اور پھر اک ذرا تیور کو سنجیدہ بنا کر بولے: تو کیا اسی اخلاقی کمزوری کا نام آپ کی لغت میں وفا ہے، پھٹکار ہے آپ کی اس وفا پر ___ وہ عورت کا ہے کو ہے، مٹی کا ڈھیر ہے جو جوتے کھاتی رہے اور پنکھے کی ڈنڈی سے بھی جوتوں کا جواب نہ دے۔ شوہر ایک چھوڑ دس عورتوں سے بیک وقت کھیلتا رہے اور آپ شوہر پرستی کا دائرہ کھینچ کر وفا کا منتر پڑھتی رہیں، نعوذ باللہ یہ شوہر پرستی نہیں ہے، جذبات کا افلاس ہے۔ دماغ کی موت ہے، ارادوں کا اضمحلال ہے، میں تو تم میں یہ جذبہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ اگر میں پیمان وفا کو توڑ کر کسی دوسری عورت کے پہلو میں جا سوؤں تو تم بھی میرے جذبۂ رشک کو سزا دینے کے خیال ہی سے سہی ___ دوسرے کی آغوش میں جا بیٹھو ___ میں نے کہا، بس بس اپنا فلسفہ رہنے دیجئے۔ برائی کی تقلید سے کسی حالت میں اچھائی نہیں نکل سکتی اور پھر یہ کہ

برائی سے برائی کا علاج ممکن بھی نہیں۔ کہنے لگے بالکل نہیں، کامنی، لیکن ذرا غور تو کرو کہ یہ کیسی کڑوی حقیقت ہے۔ فرض کرو کہ میں آوارہ ہو جاؤں اور تم میری آوارگی کے باوجود مجھ سے محبت کرتی رہو تو کیا دنیا تمہیں دیوی نہیں کہے گی اور تمہارے اس اسوۂ حسنہ کو دوسری عورتوں کے سامنے بہ طور نمونہ تقلید پیش نہ کیا جائے گا۔ لیکن پھر اسی کے ساتھ ایسا کیوں ہے کہ اگر تم بدچلن ہو جاؤ اور میں تمہاری بدچلنی کے باوجود تمہیں چاہتا رہوں تو مجھے دیوتا کے لقب سے پکارا جائے اور سوسائٹی کی زبانیں اجتماعی حیثیت سے مجھ پر ملامت کی بوچھار کریں۔ آخر کیوں؟ وفا اگر بجائے خود کوئی قابل احترام جذبہ ہے تو کیوں نہ مرد کی وفا کی بھی اسی طرح قدر کی جائے۔ یہ کیسی کھلی ہوئی ناانصافی ہے، سوسائٹی کی تم عورتوں کے ساتھ۔ کیا اس کھلی ہوئی انصافی کے لئے تمہاری روح میں بغاوت کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ تم پوچھتی ہو کہ عورت کے جذباتی حقوق کیا ہیں، وہی جو مرد کو ہر حال میں حاصل ہیں۔ جذبۂ شوق ہو یا جذبۂ شک۔ تعدد پسندی ہو یا ندرت پرستی، عورت اور مرد دونوں ان فطری جذبات وخواہشات میں مساوی حصہ دار ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مرد کے ان جذبات کا تو احترام کیا جائے اور عورت کی ان خواہشوں کے ساتھ مطلق رواداری جائز نہ رکھی جائے۔ آج دنیا کی تعلیم یافتہ عورتیں ہر ملک میں اپنے حقوق کی نوحہ خوانی کر رہی ہیں۔ حالانکہ انہیں خود خبر نہیں کہ ان کے حقوق واقعی کیا ہیں، سیاسی حقوق حاصل کر کے وہ کیا کر لیں گی ___ جب تک کہ انہیں ہماری طرح جذبات کی پیاس بجھانے کی آزادی نہ مل جائے۔ میں تو یہی سمجھوں گا کہ وہ بدستور سابق مردوں کی لونڈیاں ہیں ___ تقریر کو یہاں تک پہنچا کے وہ خاموش ہو گئے۔ اور میری طرف جواب طلب نیوروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا: صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کو مردوں کی طرح آزاد کر دینے کی ایسی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہ ہو مردوں کو بھی عورتوں کی طرح پابند کر دیا جائے۔ حیا یا خود اختیاری وفا یا دوسرے لفظوں میں قیود پرستی، متمدن دنیا کے لئے اگر کسی حیثیت سے ضروری ہے تو کیوں نہ عورتوں کی طرح مرد بھی اسے اختیار کر لیں۔

ذرا غور تو کیجئے کہ نظام معاشرت کی بقا اور تمدن کی خیریت اس پابندی نفس میں ہے یا اس آزادیٔ نفس میں، نئی تہذیب جس کا خواب دیکھ رہی ہے ___ میرا یہ کہنا تھا کہ وہ کچھ سوچنے لگے، کھو گئے، ___ اور بڑی دیر تک کھوئے رہے یہاں تک کہ گھڑی نے بارہ کا گجر بجایا اور میں نے دوپہر کے کھانے کے لئے انہیں چونکایا ___ چونکے اور مسکرا کر کہنے لگے۔ کامنی تم جیتیں اور میں ہارا، بیشک عورتوں کو مردوں کی طرح خودمختار یا مطلق العنان کر دینے کی ضرورت نہیں، بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ

عورتوں کی طرح مرد بھی اپنے نفس کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔عورتوں کی طرح مردوں کے جذبات اور جنسی میلانات پر بھی قانون کا پہرہ بٹھلا دیا جائے۔یہی نہیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ مرد خود ان مراعات سے دستبردار ہو جائیں جو تمدن قدیم نے انہیں ناانصافی سے دے رکھے ہیں۔سماج کی خیریت بلاشبہ اسی میں ہے، ہماری تہذیب جو بھی کروٹ لے لیکن تمدن کے لئے بہرحال ایک ''فلسفہ اخلاق'' کی ضرورت ناگزیر ہے ___ ورنہ حکومت کا قانون آخر کس بنیاد پر کھڑا ہوگا ___ اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب تک ہمارے معاشرتی میلانات میں تبدیلی نہیں ہوتی اس وقت تک ایک ''اخلاق جنسی'' کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ___ میرا دماغ تمہاری دی ہوئی روشنی کا تشکور ہے ___ میں ہنسی اور میری ہنسی ایک فاتحانہ ہنسی تھی لیکن حیرت ہے کہ وہ اس بحث میں اپنی شکست پر مجھ سے کم خوش نہ تھے، کھانا کھاتے جاتے تھے اور کہتے جاتے کہ تم نے میرے دماغ میں ایک کھڑکی کھول دی۔

(۱۴)

میرے خط کی پشت پر محمود نے بیتاب کا جو شعر لکھ دیا تھا اس نے میرے دماغی ہیجان کو ایک بڑی حد تک سکون سے بدل کر میری خودی کے لئے تھوڑی سی غذا مہیا کر دی اور میں یہ سمجھنے لگی کہ ''محمود ثریا کے گھر میں بھی میرا ہے'' ___ لیکن اس خیال کے ساتھ دل کا وہ زخم جو موسم کی ناموافقت سے کچھ مرجھا گیا تھا پھر رسنے لگا۔ چپکے چپکے رہنے لگا۔ میں نے بھی اسے رسنے کے لئے چھوڑ دیا ___ اور حسب معمول اس کی ناز برداری کے ساتھ خانگی زندگی کی ناز برداریاں بھی کرتی رہی ___ یہاں تک کہ کہ میری شادی کا دوسرا سال شروع ہوا اور مجھے ایک بچے کی ماں بننے کی سعادت حاصل ہوئی ___ یہ زندگی کی وہ منزل ہوتی ہے جہاں پہونچ کر ایک ''معتدل عورت'' کے کانوں کو زیوروں کی جھنکار سے زیادہ کھلونوں کی جھنجھناہٹ بھلی معلوم ہوتی ہے۔اولاد کی محبت ماں کے جذبات کی فاتح ہے۔اس کے تمام مشاغل اور اس کے تمام رجحانات کی فاتح ہے ___ اس کے پورے وجود کی فاتح ہے۔

میرے فاتح نے بھی میری مملکت کے حدود میں قدم رکھتے ہی پہلی فتح میری اس ذہنی کشمکش پر حاصل کی جس کا تعلق محمود کی یاد سے تھا۔اور اس کے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا ___ یہاں تک کہ میں خانہ داری کے دھندوں کے لئے باقی نہ رہی۔اپنے شوہر کی ناز برداریوں کے لئے باقی نہ رہی، اپنی کتابوں اور اپنی سہیلیوں کے لئے باقی نہ رہی ___ انتہا ہوگئی کہ بعض اوقات نمازیں تھی چھوٹ گئیں اور مجھے اکثر و بیشتر اپنے خدا سے بھی فرصت لینی پڑی ___ ایسے عالم میں جبکہ میری زندگی

میں خدا کی گنجائش بھی مشکل سے ہو محمود کی یاد کس منھ آتی ___ اور اگر آتی تو ''ننھے'' کی ایک چیخ سن کر پرے ہٹ جاتی۔ مختصر یہ کہ اس دوران میں محمود اپنی ثریا سے مشغول رہے۔ اور میں اپنے اس کھلونے سے کھیلتی رہی۔ جذبات کا طوفان جو بڑے زور شور سے اٹھا تھا خود بخود سو گیا، دریا نے بہاؤ کا رخ بدل دیا ___ اور زندگی اپنی طبعی حالت پر چل پڑی۔

ایک سال اور گذر گیا اور میں نے میکے جانے کا نام نہ لیا۔

بچے کی ولادت سے کچھ دن پہلے میری ساس کلکتہ آئیں اور سال بھر تک میرے ساتھ رہیں۔ جب جانے لگیں تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلنے پر مصر ہوئیں۔ وہ پوتے سے الگ ہونا نہیں چاہتی تھیں اور ان کے صاحبزادے بیوی سے جدائی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ ہفتوں کشاکش رہی، نتیجہ وہی ہوا جو ایسی حالتوں میں ہوا کرتا ہے۔ ماں کی ضد نے بیٹے کی حیلہ سازیوں پر فتح پائی اور میں پورے دو سال کے بعد بادل ناخواستہ وطن چلی ___ بادل ناخواستہ اس لئے کہ محمود کی مصیبت میرے خیال میں میرے خیر مقدم کے لئے وہاں چشم براہ تھی۔ اور مجھے اندیشہ تھا کہ اس سے آنکھیں چار ہوتے ہی میرا احساس فرض کہیں مضمحل نہ ہو جائے۔

راستے بھر اسی ادھیڑ بن میں رہی، لیکن گھر پہونچتے ہی یہ خوشخبری سنی کہ محمود شہر میں موجود نہیں ہیں۔ بمبئی کی ایک ایکٹرس کچھ دنوں کے لئے ثریا کے یہاں آ کر ٹھہری تھی، جاتے ہوئے اس نے ثریا کی مہمان نوازیوں کا یہ صلہ دیا کہ اس کے محمود کو اس سے چھین کر اپنے ساتھ لیتی گئی ___ یہ خبر سن کر مجھے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا، لیکن میں مطمئن ہونے کی جگہ مضمحل ہو گئی۔ یہ معلوم کر کے مضمحل ہو گئی کہ دو سال کے بعد محمود سے ملنے کے جو امکانات تھے وہ ختم ہو گئے، آپ کو حیرت ہو گی اور ہونی بھی چاہیے کہ گھر پہونچنے سے چند گھنٹے پہلے میرے حواس اس تصور سے پراگندہ تھے کہ ''محمود سے ملاقات ہو گی تو کیا ہو گا''۔ لیکن جب وہ نہ ملا اور اس سے ملنے کا جو اندیشہ تھا وہ باقی نہ رہا تو دل اس حالت پر بھی قناعت نہ کر سکا۔ اور خواہ مخواہ کڑھنے لگا۔ یہ سوال نہ کیجئے کہ کیوں کڑھنے لگا، کڑھنا تو اس کی طبیعت ہی بن گئی تھی، داد دیجئے اس عورت کی جو سینے میں ایسا شریر دل رکھ کر بھی فرض کے راستے پر تھوڑی دور چل سکی۔ نفسیات محبت کی گتھیاں سلجھانے میں میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ صرف کیا زندگی کے شیریں ترین لمحے اس کوشش میں ضائع کئے اور اب تک نہ سمجھ سکی کہ یہ بدبخت دل جس چیز سے بھاگتا ہے پھر اسی چیز کو ڈھونڈتا کیوں ہے ___ جسے پسند کرتا ہے اسے پیار کیوں نہیں کر سکتا اور جسے پسند نہیں کرتا اس کی

جدائی میں سوگوار کیوں رہتا ہے ___ جو چاہتا ہے اس کے کرنے میں قادر کیوں نہیں اور جو نہیں چاہتا اسے بے ساختہ کیوں کر بیٹھتا ہے۔ آج بھی جب اپنی گذری ہوئی زندگی کے اوراق الٹتی ہوں تو ایسی کتنی ہی غیر ارادی حرکتیں کتنے ہی غیر شعوری افعال میرے سامنے آتے ہیں اور مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا ___ ؟ میں ان میں سے ایک کا بھی جواب نہیں دے سکتی۔ سوچتی ہوں اور پچھتاتی ہوں۔ میں شاید اس واقعہ کو عمر بھر نہیں بھول سکتی۔ جب میں نے پہلی بار اپنے شوہر کے ساتھ کلکتے کا سفر کیا تھا اور محمود ہم لوگوں کو رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تک آئے تھے۔ رخصتی کی صبر آزما گھڑیوں اور ان کی بے پناہیوں کو میں جانتی تھی۔ اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ محمود کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں گی مجھے خوف تھا میں ڈرتی تھی کہ اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر میرا احساس فرض شکست نہ کھا جائے۔ میں گھر سے چلی اسٹیشن پر پہونچی، اسٹیشن سے پلیٹ فارم اور پلیٹ فارم سے ٹرین تک کا فاصلہ طے کیا۔ لیکن اس عرصے میں ایک لمحے کے لئے بھی میرے ارادے میں ضعف نہ آیا، محمود برابر میرے ساتھ رہے اور میری آنکھیں برابر جھکی رہیں۔ جھکی رہیں، یہاں تک کہ گاڑی نے روانگی کی سیٹی دی، ڈبے کی سامنے والی کھڑکیاں بند تھیں اور میں ان کی آڑ میں سر جھکائے بیٹھی تھی ___ انجن کی سیٹی میں نہ جانے کون سی قوت تھی جس نے میرے ہاتھوں سے میرے سامنے کی کھڑکی گرا دی۔

ٹرین پلیٹ فارم کو چھوڑ رہی تھی ___ اور میری خوددار نگاہیں محمود کی بے چین نگاہوں سے گلے مل رہی تھیں۔

دل سے پوچھتی ہوں کہ ایسا کیوں ہوا؟ بس اس کے سوا کوئی جواب نہیں ملتا کہ ع یوں بھی اے مہربان ہوتا ہے ___ حافظے سے پوچھتی ہوں تو وہ کہتا ہے کہ جب ٹرین نے سیٹی دی تو دفعتا اندر سے ایک فریاد نکلی کہ اے بد بخت! محمود سے بچھڑ رہی ہے اور شاید ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہی ہے، پھر ملاقات ہو یا نہ ہو۔ رخصت کی آخری گھڑیوں میں تو ایک بار اس کی صورت دیکھ لے، یہ پکار سنتے ہی دل نے پوری طاقت سے دماغ پر حملہ کیا ___ زنجیریں ٹوٹ گئیں اور اعصاب قابو سے باہر ہو گئے ___ اور ہاتھ نے بے ساختہ کھڑکی کی طرف بڑھ کر وہ جرات کی جو ایک پردہ نشیں عورت سے عام حالات میں ممکن نہیں۔

بہر حال یہ میرا تجربہ ہے ایک ایسی عورت کا تجربہ جو زندگی کی چڑھی دوپہر سے عمر کی ڈھلتی چھاؤں تک اپنی خواہشوں کے خلاف جہاد کرتی رہی ہو ___ یقین کیجئے ___ کہ اعصاب پر جذبات

سے مغلوب اعصاب پر عزم کا پہرہ بہت دیر تک نہیں بٹھلایا جا سکتا۔ خواہشیں دل میں ایک مرتبہ پیدا ہو کر پھر کبھی نہیں مرتیں، ہاں ضبط نفس کے حملوں سے مرعوب ہو کر بھیس بدل لیتی ہیں، نقاب اوڑھ لیتی ہیں اور ان نفسیاتی لمحوں کا انتظار کرتی ہیں جب قوتِ فیصلہ حالات سے متاثر ہو اور عقل کا چراغ آندھیوں میں جھلملانے لگے ___ جب وہ نفسیاتی لمحے آجاتے ہیں، تو فطرت کی یہ بے پناہ قوت نقاب الٹ دیتی ہے۔ کیچلی اتار پھینکتی ہے اور اپنی پوری طاقت سے ہم پر حملہ کرتی ہے۔ ڈرنا چاہیے ان لمحوں سے جب محبت پرہیز گاری کا بھیس بدلے اور گناہ کا لبادہ اوڑھ لے۔ میرا جی کلکتہ کتنی مرتبہ گھر والوں سے ملنے کی لئے کڑھا، لیکن گھر آ کر معلوم ہوا کہ وہ گھر والوں کی یاد نہ تھی، محمود سے ملنے کی خواہش تھی جو بھیس بدلے ہوئی تھی۔

بہر حال ملال کی وہ کیفیت جو محمود کے بمبئی چلے جانے کی خبر سے مجھ پر طاری ہوئی تھی۔ بہت دیر تک باقی نہ رہی، میں نے اس پر قابو پالیا۔ اور میں نے کیا قابو پایا بچے نے بیمار پڑ کر خود بخود اس کے لئے گنجائش پیدا کر دی۔ سال بھر کا کمزور بچہ جاڑے کا موسم اور ساری رات کا سفر۔ سردی لگنی تھی اور لگی۔ گھر پہونچتے پہونچتے پنڈا بھیکا(کذا) ہوا اور شام ہوتے ہوئے بخار چڑھ آیا۔ اور وہ بھی اس شدت کا کہ ایک ہفتے تک آنکھیں نہ کھولیں، تیمارداری اور شب بیداری کے ساتھ مامتا نے مجھے اس کی مہلت نہ دی کہ بچے کے سوا کسی اور کے متعلق کچھ سوچ سکوں ___ فضا اگرچہ مکدر اور افق گرد آلود ہو چکا تھا، لیکن ہوا کا رخ بدل جانے سے آتی ہوئی آندھی واپس لوٹ گئی ___ بچہ جب چونچال ہوا تو عزیزوں سے ملنے کا سلسلہ شروع ہوا، ان کے بعد بچپن کی سہیلیوں نے مجھے گھیرا اور میں ان سے مل کر تھوڑی دیر کے لئے پھر زندگی کے اس سبزہ زار میں پہونچ گئی جسے وقت کی تقلید میں بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ بچپن کی یاد بھی کہیں دور نہیں گئی تھی، بلاتے ہی آئی اور اس کے اعزاز میں جھولے ڈالے گئے۔ کڑاہیاں چڑھیں پکوان پکے۔ آنکھ مچولی کھیلی گئی۔ غرض بچپن کا زمانہ اپنی تمام دلچسپیوں کے ساتھ کچھ دنوں تک ہمارا مہمان رہا، ایک مہینے تک ساس کے ساتھ سسرال رہی اس کے بعد امی جان نے مجھے میکے بلوالیا اور میں پورے ڈھائی سال بعد اس ڈیوڑھی میں قدم رکھا جہاں سے میری کنواری زندگی کا جنازہ سہاگ کے تابوت میں کہاروں کے کاندھے پر نکلا تھا۔

پیاس کی شدت میں آپ بھوک کو کیوں بھول جاتے ہیں، بھوک جب نا قابل برداشت ہوتی ہے تو ایک قحط زدہ ماں کی مامتا کہاں گم ہو جاتی ہے؟ کیا یہ غلط ہے کہ تنازع للبقا کے معرکے

ہمارے وجود کے اندر بھی چھڑے رہتے ہیں ___ اور بقائے اصلح کا قانون یہاں بھی طاقت کی حکمرانی کا ضامن ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری طرح ہمری خواہشیں بھی آپس میں ٹکراتی ہیں، اور ہمارے ہر جذبے ہر میلان ور ہر احساس کی طبعاً یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے وجود پر تنہا وہی حکمراں ہو اور ہمارے اعصاب اسی کے اشارے پر کام کرتے رہیں، جذبات کی اس کشاکش اور خواہشات کے اس تصادم میں جو جذبہ قوی ہوتا ہے وہی ہم پر حکمرانی کرتا ہے اور جو کمزور ہوتا ہے، وہ بھاگ کر نفس کی کمین گاہوں میں روپوش ہو جاتا ہے، اور روپوش رہتا ہے اس وقت تک جب تک کہ اس کا حریف غالب حالات کی بنا پر کمزور یا غافل نہ ہو جائے۔ محمود کی محبت یعنی میرا جنسی میلان بچے کی پیدائش تک مجھ پر حکمراں رہا، لیکن بچے کی پیدائش کے بعد اس کا زور کم ہوتا گیا، یہاں تک میں سمجھنے لگی کہ میں نے اس جذبے پر قابو پا لیا ___ مگر سسرال سے میکے آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ سمجھنا میری خود فریبی تھی، وہ کافر جذبہ میرے اندر اسی طرح موجود تھا، صرف میری مامتا سے مرعوب ہو کر مقابلے کے میدان سے ہٹ گیا تھا، اس کمزور اور چالاک حریف کی طرح جو غنیم کے بے پناہ حملے سے بھاگ کر گھاٹیوں میں چھپ جائے ور شبخوں مارنے کے لئے رات کا انتظار کرے۔ یہ آپ سے کہہ چکی ہوں کہ ایک مہینے کے بعد میری امی جان نے مجھے سسرال سے میکے بلوالیا، میں سسرال سے میکے آئی اور محمود کی محبت نے حالات کو اپنے موافق پا کر ایک مرتبہ پھر مجھے چھیننے کی کوشش کی۔ اب سنئے کہ وہ موافق حالات کیا تھے، پہلی بات یہ ہوئی کہ گھر آتے ہی بچہ میری گود سے نکل کر اپنی نانی کی گود میں چلا گیا اور میں عملاً اس کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام نشیلے خیالات جو مجھے مصروف دیکھ کر منتشر ہو گئے تھے پھر میرے دماغ میں ہجوم کرنے لگے اور میں ان کی کیفیت میں گم ہونے لگی، دوسری مصیبت ماحول کی مناسبت تھی، میں ان دنوں جس گھر میں اس کی فضا میں گذرے ہوئے زمانے کو اپنی گود میں لئے تھی۔ یہ وہی گھر تھا جس کی چار دیواری میں دو معصوم روحوں نے اپنے معصوم تخیلات کی ایک جنت تعمیر کی تھی، یہ وہی گھر تھا جس کی ہر دیوار پر ماضی کے ابھرے ہوئے نقوش مجھ سے میری پچھلی زندگی کی کہانیاں دہرا رہے تھے، انگنائی میں وہ امرود کا درخت اب بھی موجود تھا، جس کی ہوا میں ہماری محبت نے شعور کی پہلی انگڑائی لی تھی، سائبان میں کچی اینٹوں کا وہ گھروندا اب تک موجود تھا جسے محمود نے میرے لئے بنایا تھا اور جس کی گری ہوئی چھت اور ٹوٹی ہوئی دیواریں مجھ سے آج بھی یہ سوال کر رہی تھیں کہ ___ اس کی مزدوری؟ ___ مہتابی پر آج بھی چاندنی راتیں اسی طرح آتیں مگر مایوس لوٹ

جاتیں، دن کے اجالے میں آنکھ مچولی کھیلنے والے اب ان سے کتنے بیگانہ ہو چکے تھے۔

مارچ کا مہینہ تھا اور بسنت کا موسم جو ہندستان میں جنون کا موسم سمجھا جاتا ہے، چیت کی پاگل ہواؤں نے پنکھے جھل جھل کر راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریوں کو ابھارا ___ اور میری ہڈیاں پھر سلگنے لگیں ___ وہ ندی جو ریت کے نیچے بہ رہی تھی دفعتاً ابل پڑی ___ اور میں اس کے تیز دھاروں میں تنکے کی طرح بہنے لگی۔ پچھلی زندگی کے تمام مناظر سینما کی تصویروں کی طرح ایک ایک کر کے میرے سامنے آنے لگے اور مجھ سے اپنا فرض مانگنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں تیزی کے ساتھ بدل رہی ہوں، جذبات میں تبدیلی افکار میں تبدیلی زندگی کے روزانہ پروگرام میں تبدیلی، یہاں تک کہ ایک دن میرے آئینے نے بھی مجھ سے کہا ''سلیمہ تو کتنا بدل گئی ہے''؟

دماغ جب جذبات سے متاثر ہو تو خواب کا ''رنگ محل'' تصور کی آنکھوں کے لئے اپنے تمام دریچے کھول دیتا ہے، مجھے بھی نیند میں ___ اور اکثر بیداری میں طرح طرح کے خواب آنے لگے۔ ڈراؤنے اور ہولناک خواب، دلچسپ اور رنگین خواب ___ بے حیا اور شرمناک خواب۔ نیند کی مجھے کبھی شکایت نہ تھی، بچپن سے لے کر جوانی تک یہ میری وفادار سہیلی رہی ___ لیکن اس عالم میں وہ بھی کبھی کبھی تھوڑی دیر کے لئے مجھ سے روٹھ جاتی، اختر شماری کا تجربہ اگرچہ میری پوری حیات عشق میں باقاعدہ کبھی نہیں ہوا، لیکن زندگی میں ایک جذباتی رات کا پچھلا پہر میں نے اس مشغلے میں بھی صرف کیا، واقعہ یوں ہے کہ گھر میں میری بھتیجی کے ''کن چھیدن'' کی تقریب تھی، برادری کی تمام عورتیں دو دن تک گھر میں مہمان رہیں اور گھر کی ہر عورت ان کی خاطر داری میں سراپا انہماک میں پہلے پان کے محکمے کی وزیر قرار دی گئی اور قلمدان کی جگہ پاندان مجھے سپرد کیا گیا، میں نے دیکھا کہ یہ وزارت میرے لئے ٹھیک نہ ہوگی، مدت کے بعد میکے کی ایک تقریب میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا، چاہتی تھی کہ جی کھول کے لوگوں سے ملوں اور جی کھول کے تقریب کا حق ادا کروں اور پان کا محکمہ ایسا ہوتا، جس کا دائرہ عمل زیادہ سے زیادہ ایک کوٹھری تک محدود ہوتا ہے، غرض یہ سوچ کے میں نے اماں جان کی خدمت میں اپنا استعفی پیش کیا جو کسی طرح منظور ہوا اور اس کی جگہ مجھے استقبالیہ کمیٹی کی صدارت پیش کی گئی، اب میرے ذمے یہ خدمت تھی کہ جو بی بی تشریف لائیں ڈیوڑھی میں جا کر انہیں ان کی ڈولی سے اتار لاؤں اور جب وہ واپس ہونے لگیں تو پھر ڈیوڑھی تک انہیں چھوڑ آؤں۔ کام بظاہر دلچسپ اور آسان تھا لیکن دو گھنٹوں میں میرے پاؤں کے اعصاب نے بھی استعفی کی دھمکی دینی شروع کی نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کوئی معقول عذر تلاش کر کے یہ بلا اپنی بھاوج کے سر ٹالی اور خود مہمانوں کے

پاس آ کران کی دلجوئی کی خدمت اپنے ذمے لے لی ___ آخران سے باتیں کرنے والا بھی تو کوئی چاہیے تھا ___ غرض شام تک گھر میں خاصی چہل پہل رہی، شام ہوتے ہی مہمانوں کی بھیڑ چھٹنے لگی، رات کے نو بجتے بجتے گھر میں سناٹا تھا، کنبے کا ہر شخص تھک کے چور ہو چکا تھا جسے جہاں جگہ ملی پڑ رہا، میں بھی اسی فرش پر جہاں بیٹھی تھی لیٹ گئی اور لیٹتے ہی نیند آ گئی ___ یہی رات میری زندگی کی وہ تاریخی رات تھی جس میں میں نے وہ خواب دیکھا، جوانی کی شبہائے تاریک کا وہ سب سے زیادہ ڈراؤنا خواب، جس نے میری محبت کا مزاج اور میرے جذبات کی دنیا بدل دی، رات شاید دو پہر آئی ہوگی کہ دیکھتی کیا ہوں کہ ایک جنگل میں جو پہاڑوں سے گھرا ہے ایک چھوٹی سی ندی بہ رہی اور میں اس کے کنارے کھڑی ایک کنول کا پھول توڑنے کی کوشش کر رہی ہوں، ندی کے اس پار برگد کے سایہ میں ایک جوگی دھونی دے رہا ہے، جس کی لمبی لمبی جٹائیں کمر تک آ گئی ہیں۔ پھر کچھ تاریکی درمیان میں آ جاتی ہے اور خواب کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، لیکن پھر دیکھتی ہوں کہ جوگی کوئی اور نہیں محمود ہے اور خواب ہی میں یہ سوچتی ہوں کہ یہ جوگی کیسے ہو گیا، اتنے میں محمود آواز دیتا ہے کہ اس پار آؤ۔ میں جواب دیتی ہوں ''کیوں کر آؤں بیچ میں دریا جا حائل ہے'' ___ وہ سامنے ایک ناؤ کی طرح اشارہ کرتا ہے۔ میں کہتی ہوں ''ناؤ چڑھتے میرا جی ڈرتا ہے''۔ یہ سن کر محمود قہقہہ لگاتا ہے، اور پوچھتا ہے کہ میں آؤں؟ یہاں سے خواب پھر کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے، لیکن پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی منظر آتا ہے، اور دیکھتی کیا ہوں کہ محمود کشتی کھیتا میرے قریب چلا آ رہا ہے۔ کشتی جب بیچ دریا میں پہونچتی ہے تو ایک گھڑیال پانی سے منھ نکال کر محمود کی طرف بڑھتا ہے اور اسے کشتی سے اٹھا کر نگل جاتا ہے ___ میں چیختی ہوں اور منھ ڈھانپ کے رونے لگتی ہوں ___ خواب یہاں تک پہونچا تھا کہ امی جان نے مجھے چونکا کر کہا سلیمہ! سلیمہ تو نیند میں رو رہی تھی، کیا کوئی خواب دیکھا؟ میں نے چونک کر اپنے تکئے اور آنچل کو دیکھا تو وہ واقعی آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا ___ امی جان تو کروٹ بدل کر سو گئیں لیکن میں صبح تک جاگتی رہی۔ یہی وہ رات تھی جس کا پچھلا پہر میں نے واقعی اختر شماری میں گذارا۔ صبح تک خواب اور اس کی مختلف تعبیریں میرے دماغ کے سامنے آتی رہیں ___ کہیں دریا زندگی کا دریا نہ ہو ___ کشتی محبت کی کشتی نہ ہو، گھڑیال موت کا گھڑیال نہ ہو، کیا نصیب دشمنان محمود پر کوئی آفت آنے والی ہے ___ تو کیا میں اسی طرح کھڑی رہ کر اس منظر کا تماشا دیکھوں گی ___ کیا میری آنکھیں اس تماشے سے پہلے پھوٹ نہ جائیں گی ___ غرض ان اوہام نے جو فی الواقعی اوہام تھے میری خود اختیاری کو مجھ سے بری طرح چین لیا، اور اس خواب کی کیفیتیں میرے اعصاب کو زندگی بھر متاثر کئے رہیں۔ وہ محبت جو کل تک شوق کی ایک تشنگی تھی، نفس کا ایک مطالبہ تھی،

جذبات کی ایک خودغرضانہ طلب تھی، ایک ایسی خودغرضانہ طلب جو جنون کی شوریدگی سے خالی ہو ___ جو قربانی کے تصور سے گھبراتی اور نتائج کی المناکیوں سے ڈرتی ہو ___ آج اس میں ___ اس خواب کے بعد عزم کی تھوڑی سی گرمی اور ایثار کی ذراسی چاشنی پیدا ہوگئی ___ یہ نہیں کہتی اس خواہش میں سوز نہ تھا۔ سوز تھا لیکن سوز میں لذت نہ تھی، اس خواب نے وہ لذت بھی پیدا کردی ___ یہ نہیں کہتی اس آرزو میں درد کی تڑپ نہ تھی، درد تھا اور درد کا احساس بھی لیکن ''محمود'' کے ساتھ ہمدردی نہ تھی ___ سو وہ ہمدردی یہ خواب دیکھتے ہی پیدا ہوئی اور عمر بھر مجھ پر حکومت کرتی رہی ___ صبح ہونے ہی اس کا پہلا حکم یہ ہوا کہ محمود کو دریافت خیریت کا تار بھیجا جائے۔ میں نے کہا لوگ کیا کہیں گے جواب ملا، کیوں ری سلیمہ پھر وہی کجی، ابھی تک تیرا بل نہیں نکلا'' مجھے یاد نہیں آتا کہ بوجود اس پیاس کے جو محمود کے لئے مجھ میں موجود تھی، میں نے کبھی بھی یہ سوچا ہو کہ محمود کس حال میں ہے۔ اس پر کیا گذر رہی ہے۔ لیکن آج پچھلے پہر سے نہ معلوم دل کی کون سی رگ کھل گئی تھی کہ مجھے کسی کروٹ چین نہ آیا اور ایک لمحے کیلئے بھی یہ وہم دماغ سے جدا نہ ہوا کہ ہو نہ ہو محمود بیمار ہے ___ یا اس پر کوئی آفت آنے والی ہے۔

محمود کا پتہ مجھے ان کے دوست بھائی اختر کی زبانی معلوم ہو چکا تھا۔ میں اپنے دل کی اس فرمایش کو بہت دیر تک ٹال نہ سکی اور قلم اٹھا کر یہ تار لکھا:

''اپنی خیریت کا ایک بالتفصیل خط لکھئے''۔

خط لکھئے اس لئے کہ تار کا جواب تار سے آنے میں یہ اندیشہ تھا کہ میرے تار کا حال گھر والوں پر کھل جاتا اور اس سلسلے میں ان کے سوالوں کا جواب میرے بس میں نہ ہوتا۔ لیکن اس احتیاط کے باوجود جب میں نے تار جمراتن بوا کے ہاتھ دربان کے پاس بھجوایا تو امی جان یہ پوچھ ہی بیٹھیں کہ تار؟ یہ تار کس کو دیا جا رہا ہے؟

میں نے کہہ دیا کہ کلکتہ میں میری ایک ملنے والی ہیں، خط سے معلوم ہوا ہے کہ ان کا بچہ بیمار ہے، سو وہی اس کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے ایک تار بھیجے دے رہی ہوں۔ یہ تھا میری زندگی کا وہ پہلا جھوٹ جو میں محمود کی محبت کے لئے بولی۔ اس کے بعد سے پھر جھوٹ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

(۱۷)

فراق کی بے چینیوں کا حال جب میں کبھی محمود کی زبان سے سنتی تو اس کو ایک غزل سے زیادہ اہمیت نہ دیتی۔ لیکن ان چند دنوں میں حالات نے مجھے خود بخود اس نتیجے پر پہونچایا کہ اس قسم کی رنگین

بیانیوں میں تھوڑی سی سچائی ضرور ہوتی ہے۔ کئی دن تک میرے تار کا کوئی جواب نہ آیا۔ خط کے انتظار میں میں نے اپنے بچھونے پر جتنی کروٹیں بدلی ہوں گی اس سے کہیں زیادہ میرا دل میرے سینے میں کروٹیں بدلتا اور مجھے ایک نئی زندگی سے روشناس کرتا رہا۔ یہاں تک کہ چھٹے یا ساتویں دن کی ڈاک میں ایک لفافہ ملا جس کے مٹے ہوئے حرفوں پر محمود کے آنسو کی مہر تھی۔ کھولا تو خط نہ تھا اس کے جذبات پریشان کا ایک مجموعہ تھا:

''کیوں جی سلیمہ؟ تمہیں یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ خود جیو اور دوسرے کو جینے نہ دو۔ یہ تار مجھے کس لئے دیا گیا ہے؟ اسی لئے نا؟ کہ بمبئی کی باغ و بہار فضا میں اگر سکون کے چند لمحے میں نے کہیں سے مستعار لئے ہوں تو اسے بھی ماضی کے تصورات سے تلخ کر دیا جائے۔ اگر یہی خیال تھا تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے سکون جس چیز کا نام ہے وہ مجھ سے بہت پہلے چھین لی گئی ___ کس نے چھینا یہ کہنے کی غالباً ضرورت نہ ہوگی اور اس کا جواب میں تم سے بھی نہیں مانگتا۔ چیز تھی چھن گئی ور ہمیشہ کے لئے چھن گئی۔ میں نے گھر سے نکل کر اسے احباب کے قہقہوں اور شراب کی بوتلوں میں ڈھونڈنا چاہا اور نہ ملی۔ بازار حسن کی رنگینیوں میں تلاش کیا لیکن وہاں بھی اس کا سراغ نہ تھا ___ کالج کے حلقے سے نکل کر روحانیت کے دائرہ میں آیا وہاں بھی مجھے پناہ نہ ملی ___ ایک مغضوب روح ہے جو عافیت کی تلاش میں سر ٹکرا رہی ہے۔ راستہ تاریک ہے اور رات اندھیری، جہاں تک نظر کام کرتی ہے، گرد و پیش کوئی سرا نہیں، اور اگر ہے تو اس کا چراغ روشنی نہیں پھینکتا ___ زندگی کے چٹیل میدان میں جہاں کوسوں تک سبزہ نہیں، یا دش بخیر ایک درخت تھا چھوٹا سا سایہ دار درخت جس کی چھاؤں میں یہ مسافر لیٹ رہا کرتا تھا۔ سو اب اس کے نیچے کسی اور نے اپنا جھونپڑا ڈال لیا۔ بستر پھیلا دیا، اس طرح پھیلا دیا کہ اس تھوڑی سی جگہ میں اب کسی دوسرے کے بیٹھنے کی گنجایش نہ رہی۔ اب مسافر کہاں جائے۔ یہ سوال تم سے نہیں ان لوگوں سے ہے جو.....لیکن ان سے بھی کیوں؟ خدا سے ہو، ہاں خدا ہی سے، اس لئے کہ:

جتنے شکوے ہیں اسی سے ہیں کہ اس گلشن میں
مجھ کو بلبل کیا صیاد کو صیاد کیا

تم پوچھتی ہو کیسے ہو اپنی مفصل حالت لکھو۔ میں پوچھتا ہوں کہ تمہیں یہ سوال کرنے کا حق کیا ہے؟ یہ سوال اس کو کرنا چاہیے جس نے اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی میرے متعلق یہ سوچنے میں گذارا ہو کہ میں کیا ہوں کس حال میں ہوں کدھر جانا تھا کدھر جا رہا ہوں، وہ کہ جس نے اپنے دل کے تمام

دروازے اور اپنے دماغ کی تمام کھڑکیاں میرے لئے میری یاد کے لئے میرے تصور کے لئے بند کر رکھی ہوں، انصاف کرو اسے میرے متعلق کچھ پوچھنے کا کیا حق حاصل ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ دنیا کیوں کر بدل گئی۔ آفتاب بھی اسی طرح نکل رہا، اور سیارے بھی اسی طرح اپنے اپنے سورج کے گرد گھوم رہے ہیں، موجیں اسی طرح ساحل سے سر ٹکرا رہی ہیں اور ساحل اسی غرور کے ساتھ ان کی وارفتگی کو ٹھکرا رہا ہے۔ لیکن سلیمہ بدگئی ہے ___ اس کا دل بدل گیا ہے ___ کیسی عجیب بات ___ کیا عجیب انقلاب ___ پوچھتی ہو کہ کیسا ہوں؟ اچھا ہوں ___ زندگی کی وہ گنی ہوئی سانسیں جو گننے کے لئے ودیعت کی جاتی ہیں ان کی گنتی کو جلدی جلدی ختم کرنا چاہتا ہوں ___ راستہ کتنا ہی لمبا اور منزل کتنی ہی دور کیوں نہ ہو، دوڑ کے چلنے سے جلد پہنچ جانے کا بہر حال امکان ہے۔ اور دوڑ کے کیوں نہ چلوں، ٹھوکر سے سے ڈرتا نہیں، گڈھوں سے خوف نہیں کھاتا۔ تلوے کانٹوں کے عادی ہو چکے ہیں، سر راہ کوئی چشمہ نہیں کوئی سبزہ زار نہیں جہاں کچھ دیر بیٹھ کر ستانے اور پیاس بجھانے کا سوال پیدا ہو۔ بس سر اٹھائے بھاگا جا رہا ہوں ___ اسی طرح بھاگتے بھاگتے کسی نہ کسی دن منزل پر پہونچ ہی جاؤ گا اور تم بھی سن لوگی کہ مسافر منزل پر پہونچ گیا۔

شکر گذار ہوں ان مشغلوں کا جنھوں نے تندرستی کی بنیاد ہی ہلا دی ہیں، میرے دوستوں میں ایک صاحب ڈاکٹر ہیں، ان کی تشخیص ہے کہ میرے جسم میں شکر کے عناصر کم ہو رہے ہیں، ان احمق آدمی کو کیا معلوم کہ جس کی زندگی کی ساری شیرینیاں چھین لی گئیں ہوں اس کے جسم میں شکر کے عناصر کہاں سے آئیں گے۔ بہر حال غنیمت ہے کہ عناصر کی ایک دیوار تو گر رہی ہے جو باقی ہیں وہ بھی اسی طرح ایک ایک کر کے گر جائیں گی اور روح کا طائر پر جھاڑ کر ''انا ولا غیری'' کہتا ہوا اپنے نشیمن کی طرف پرواز کر جائے گا۔ بھائی جان کو خدا سلامت رکھے خیریت بھی پوچھتے ہیں اور ضرورت کے وقت روپے بھی بھیج دیتے ہیں، لیکن نفس کو خود اعتمادی کا سبق سکھالنے کے لئے ایک دفتر میں ملازمت کر لی ہے، صبح سے شام تک دماغ کو قلم کے اشاروں پر لگائے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، شام ہوتی ہے تو سمندر کی طرف نکل جاتا ہوں، مجھے اس کی گہرائیوں میں عافیت نظر آتی ہے، لیکن وہاں تک پہونچ نہیں سکتا۔ قدم بڑھاتا ہوں تو جی ڈرتا ہے۔ کوشش کرتا ہوں کہ نہ ڈروں لیکن ڈرتا ہوں، شاید ڈر کسی دن نکل جائے اور زندگی کا یہ کٹھن سفر بحری راستے سے بہ آسانی طے ہو جائے۔ رات ہوتے ہی یہ یاد آتا ہے کہ پروین منتظر ہوگی، چونکہ نہیں چاہتا کہ کسی کو اپنے انتظار کی تکلیف دوں اس لئے وہاں سے اٹھ کر اس کے گھر کی

راہ لیتا ہوں، وہاں پروین ہوتی ہے اس کی رعنائیاں ہوتی ہیں۔ ساز ہائے موسیقی کی خواب آور لوریاں ہوتی ہیں اور شراب کے رنگین گلاس ہوتے ہیں اور میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے دماغ کے تمام ہنگاموں کو اپنے وجود کو اپنی خودی کو یہاں تک کہ تم کو تمہارے تصور کو شراب کے انہیں گلاسوں میں غرق کر دیتا ہوں ___ غرق ہو جاتا ہوں ___ اور صبح تک ایک دوسری دنیا میں رہتا ہوں۔ صبح ہوتے ہی زندگی کی تمام کلفتیں جاگ اٹھتی ہیں، اور میرے دماغ سے اپنا خراج مانگنے لگتی ہیں، یہ ہے میری روزانہ زندگی اور اس کا نظام اوقات ___ پروین کو تم شاید نہیں جانتیں ___ یہ وہی عورت ہے جس نے مجھے ثریا کی لعنت سے نجات دلائی اور اب ایک چور کی طرح چور دروازے سے میری زندگی میں داخل ہونا چاہتی ہے۔ میں تم سے مایوس ہو کر محبت کی تلاش میں ثریا تک پہونچا تھا۔ اور اس پیاسے کی طرح جو پانی کی جستجو میں چمکیلی ریت کی طرف بڑھے۔ وہاں پہونچ کر اپنی تشنگی پر سر دھن رہا تھا کہ پروین ایک راہ چلتے مسافر کی طرح ادھر سے گذری اور میری تشنگی پر رحم کھا کر اپنی چھاگل سے تھوڑا سا پانی دیا اور میں پانی کے لالچ میں اس کے پیچھے چل پڑا ___ یہ ہے میرے اور پروین کے تعلقات کا خلاصہ۔ وہ تمہاری طرح حسین نہیں ہے لیکن میری طرح وفادار ہے۔ ثریا میری طرح وفادار نہ تھی، مگر تمہاری طرح حسین تھی۔ اس کے حسن کے نقوش تمہارے حسن سے بہت ملتے جلتے تھے اور اسی مشابہت نے مجھے اس کی طرف کھینچا تھا، لیکن میں نے بہت جلد یہ معلوم کر لیا کہ کسی سے محبت کرنا اس کے پیشے کے اخلاق کے منافی ہے ___ اور میں نے پھول کے دھوکے میں چنگاری پر ہاتھ ڈال دیا ہے ___ پروین نے میرے قریب آ کر محبت کا ہاتھ بڑھایا اور جب سے میری محبت کا ہاتھ جھٹکا گیا مجھ سے محبت کے کسی بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹکنے کی طاقت نہیں رہی۔ میں نے اسے قبول کر لیا، لیکن قبول کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا تم کسی طرح میری زندگی میں آ نہیں سکتیں۔ اس کے دروازے ہیں اور دروازوں پر کسی نے قفل چڑھا رکھے ہیں لیکن یہ غدار عورت قفل توڑ دینا چاہتی ہے۔ چور دروازے تلاش کرتی ہے نقب لگانے اور دیوار پھاندنے کی دھمکی دیتی ہے ___ میں اس سے بھاگنا چاہتا ہوں ___ اس نے مجھ سے وہ چیز مانگی ہے جو میں نہیں دے سکتا جو میرے پاس نہیں۔ میں اس کے احسانات کے معاوضے میں دل کہاں سے لاؤں۔ جس نے لیا ہے وہ آج بھی واپس کر دے تو میں پروین کی یہ چیز پروین کی طرف بڑھا دوں اس لئے کہ وہ اس کی مستحق ہے، اور قدرداں بھی۔

بہر حال بھاگ جاؤں گا۔ مقصد کی تلاش میں بھاگنا اور دوڑنا ہی زندگی کی سب سے بڑی

حقیقت ہے۔ میں بھی جب سے زندگی کا ہوش آیا ہے بھاگ رہا ہوں، اور بھاگتا رہوں گا، یہ وجود روح مطلق سے جدا ہو کر جب سے انفرادیت کے عذاب میں مبتلا ہے، اس وقت سے ڈھونڈ رہا ہوں، اپنے ساتھی کو اپنے ''جیون ساتھی'' کو اپنی روح کے شریک کو اپنے وجود کے دوسرے ٹکڑے کو ڈھونڈ رہا ہوں۔

آتش کہتا ہے: عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے

اور بلاشبہ تلاشِ یار ہی روح کا سب سے بڑا مقصد ہے، اور سب سے قوی رجحان ___ انسانی زندگی میں شوق کے تمام ہنگامے نفس کی تمام گمراہیاں اور جنسی جذبات کی تمام بے اختیاریاں اسی ''تلاش یار'' کا نتیجہ ہیں۔ ایک روح جب کسی دوسری روح کو دیکھتی ہے جو کسی عالم میں اس سے ہم آغوش تھی یا کسی زندگی میں زندگی کی شریک تھی تو بے اختیار بڑھتی ہے۔ لیکن جب ایک جزو نور دوسرے جزوِ نور کو، ایک مانوس روح دوسری مانوس روح کو کھینچتی ہے تو سماج دونوں کے بیچ میں دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

سلیمہ! غور تو کرو کہ یہ فطرت کا کتنا بڑا گناہ ہے، میں نے فطرت کے اشارے پر اپنے دل کی رہنمائی میں اس گناہ کے خلاف جہاد کرنا چاہا تھا، یہ ایک مقدس جہاد ہوتا لیکن تم نے سماج کے خود ساختہ اصولوں کی غلامی کو اپنے لئے بہتر سمجھا ___ یہ جواب ہے تمہارے ان خطوط کا جو میری محبت کے فطری تقاضوں کے جواب میں طمانچوں کی طرح آتے رہے۔

بہر حال جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے میری شاعری نہ سمجھو، سماج کے لئے یہ بہت ہی آسان ہے کہ ان حقیقتوں کو جو اس کی سمجھ میں نہ آئیں یا جو اس کے مذاق کے موافق نہ ہوں، انہیں شاعری کہہ کے جھٹلا دے اور تم بھی اسی سماج کی ایک سعادت بیٹی ہوتا۔

غالباً بھولی نہ ہوگی میرے اور ثریا کے تعلقات کی خبر پا کر جو عتاب نامہ تم نے کلکتہ سے بھیجا تھا، اس کے جواب میں میں نے لاڈلے صاحب بیتاب کا یہ شعر کافی سمجھا تھا:

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ بو نے کیا
بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

کبھی تم نے سوچا کہ زندگی کی کتنی بڑی حقیقت اس شعر میں بند ہے، نظر کا مطلوب اور روح کا انتخاب جب کسی شخص سے چھین لیا جاتا ہے، تو یہی ہوتا ہے ___ یہی ہوتا ہے کہ باغ کا ہر پھول جاذب نظر ہو جاتا ہے، ہر کلی دعوت دیتی ہے ہر خوشبو پکارتی ہے، کہ ادھر آ جس چیز کی تجھے تلاش ہے وہ میرے پاس ہے ___ شوق کی ماری ہوئی روح ایک ایک کلی کو سونگھتی ایک ایک پھول کا رس لیتی ہے

اور جب وہ چیز نہیں پاتی جس کی تلاش ہے تو بھاگتی ہے یہ کہتی ہوئی بھاگتی ہے کہ:

ع عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

اور بھاگتی رہتی ہے اس وقت تک جب تک کہ اس کی چیز اسے نہ مل جائے، وہ اس زندگی میں ملے یا کسی دوسری زندگی میں لیکن تلاش ختم نہیں ہوتی ــــــ یہی ہے فطرت کی آواز کی اور اسی کا نام ہے عیاشی سماج کی اصطلاح میں۔ کاش ان عیاشوں کے دل کی آگ کوئی پہچانتا۔ کاش ان کی بیقراری کی حقیقت تک پہونچنے کی کوئی کوشش کرتا۔ خدا کی اس دنیا میں کوئی نہیں جو ان غریبوں پر رحم کھائے۔ مذہب ان سے تیوریاں چڑھائے ہے۔ قانون ان سے ہمدردی کی ضرورت نہیں سمجھتا ــــــ سوسائٹی ان کا مضحکہ اڑاتی ہے اور سماج ان کی آوازوں پر کان نہیں لگاتا۔ یہ کیسا اندھیر ہے کہ روح اگر روح کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتی پھرے تو اس گھڑی کا، اس قابل رحم گھڑی کا اس معصوم گھڑی کا نام گناہ رکھ دیا جائے۔ سلیمہ! جو پیاسا نہیں ہو پیاس کی قدر کیا جانے۔ وہ تمام اخلاق کی بلندیوں سے گرے ہوئے لوگ جو معاشرت کی سیدھی سڑک سے کٹ کر بازار حسن کی خاک چھان رہے ہیں، اگر ان کے دلوں کو ٹٹولا جائے۔ ان کے وجود کے پردوں کو چاک کر کے دیکھا جائے، ان کی زندگیوں کے اوراق الٹے جائیں تو ہر کتاب یہی کہانی کہے گی کہ جس چیز کی تلاش تھی وہ نہ ملی اور اگر ملی تو چھین لی گئی۔ ان کشتگان تلاش میں کچھ تو ایسے ملیں گے جنہوں نے پا کر کھویا اور کچھ ایسے جنہوں نے پایا ہی نہیں، روح کا مقصود نظر کے دائرے میں آیا ہی نہیں۔ اس لئے نہیں آیا کہ دونوں کے درمیان میں زمان و مکان کی بہت سی دیواریں حائل تھیں۔ زندگی کی دوڑ میں ایک پیچھے رہ گیا تھا اور ایک آگے بڑھ آیا تھا، یا پھر آدم و حوا کی طرح ایک لنکا میں اتارا گیا تو دوسرا حجاز کے ریگستان میں۔ آدم و حوا کا افسانہ جو تحقیق جدید کی روشنی میں واقعی ایک افسانہ ہے، بہت ممکن ہے کہ اسی تلخ حقیقت کی ایک تمثیل ہو۔ بہت ممکن ہے کہ انسانیت کے سلسلۂ ارتقا کی موجودہ کڑی کے آدم نے اپنے جوڑے کی تلاش میں اسی طرح مشرق و مغرب کی خاک اڑائی ہو۔ وہ آنسو وہ روایتی آنسو جو بہشت کے فراق میں آدم کی آنکھوں سے نکلے بہت ممکن ہے کہ وہ بہشت کے فراق میں نہ ہوں، اس خیر و نور کی تلاش میں ہوں جو عالم ازل میں اس کے وجود کا شریک ہو۔ بہت ممکن ہے کہ اس عہد کا فوق البشر فوق البشر کو ڈھونڈھ رہا ہو، روح اعظم کی متلاشی ہو ایک نئی حقیقت کے ظہور کے لئے، اور جب وہ جوڑا زمین کے کسی حصے پر مل گیا ہو تو اس کے اتحاد سے یہ نسل چلی ہو۔ اور شاید یہی وجہ ہو کہ انسانیت کی اس نسل میں تلاش جنسی کا یہ جذبہ تمام جذبوں سے زیادہ قوی

ہے اور زیادہ سرکش، اس طرح کہ نہ معاشرت اس پر اخلاق کا پہرہ بٹھلا سکی نہ قانون اسے اپنے دائرے میں نظر بند کر سکا۔ بہر حال یہ ہمارے تاریخی عہد سے پہلے کی داستان ہے کیوں نہ اپنے بیان کی تصدیق میں تاریخ کے اوراق تمہارے سامنے کھول کر رکھ دوں: نور جہاں کو تم جانتی ہو جہانگیر کا یہ روحانی جوڑا جہانگیر کو بہت دیر میں ملا اور جب تک نہیں ملا اس کے نفس کی آوارگی محبت کے گھروندے بناتی اور توڑتی رہی۔ شاہجہاں کو ممتاز محل ابتدائے عمر ہی مل گئی، اس لئے شہزادہ ہونے کے باوجود اس کی پوری جوانی بے داغ رہی، لیکن عمر کی دوپہر ڈھلنے سے پہلے موت نے ممتاز محل کو اس سے چھین لیا اور مورخ جانتا ہے کہ اس حادثے کے بعد اس نے اپنا اخلاقی توازن کس طرح کھو دیا، انگلستان کا بادشاہ ہنری ہشتم جنتری کی طرح بیویاں بدلتا رہا، اور مورخ آج بھی مشتبہ ہے کہ مسلسل آٹھ بیویاں کرنے کے بعد بھی اسے جنسی اور روحانی سکون میسر ہوا یا نہیں۔ مصر کی ملکہ قلوبیطرہ کی پوری جوانی اسی تلاش میں صرف ہوگئی ہر رات ایک نیا مرد اس کے پہلو میں ہو، اور ہر صبح اس کی نظر ایک نئے جوان کی تلاش میں اپنا سفر شروع کر دیتی۔ جوانی کی شام ہو رہی تھی کہ روم کا سپہ سالار انٹونی اس سے ملا اور تلاش دفعتاً ختم ہوگئی ____ مشہور رومانی شاعر شیلی کی ساری زندگی اسی تلاش جنسی کی سوگوار رہی اور باوجود اس اخلاقی حس کے جو ایک مفکر اور شاعر ہونے کی حیثیت سے اس میں بہت قوی تھی، وہ اپنی بیوی کو ''ہمدردی'' سے زیادہ کچھ نہ دے سکا۔ اور تمام عمر اپنی روح کی بیقراری پر ماتم کرتا رہا۔ کون جانتا ہے کہ میری زندگی بھی انہیں افسانوں کی طرح ایک افسانہ نہیں بنا رہی ہے۔

یہاں پہونچ کر تم یہ سوال کر سکتی ہو کہ عشق یا اس نوع کا کوئی تعلق اگر نتیجہ ہے دو روحوں کی، دو مانوس روحوں کی، باہمی کشش کا باہمی میلان کا تو اکثر حالتوں میں یہ کشش یہ میلان یہ جھکاؤ یک طرفہ کیوں ہوتا ہے، ہر حالت میں محبت کا جواب محبت سے کیوں نہیں ملتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک روح دوسری روح کو کسی عالم یا کسی زندگی میں آزردہ کر دیتی ہے، اپنی کسی حرکت یا کسی عمل سے۔ اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ آزردگی دوسری زندگی میں طبیعت کی رکاوٹ بن کر نمایاں ہوتی ہے، اور بعض اوقات تو یہ رکاوٹ اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ اس کے مقابلے میں کشش عنصری بھی کمزور پڑ جاتی ہے۔ شاید اسی قسم کی کوئی رکاوٹ میری جانب سے تمہاری طبیعت میں بھی ہے ____ ورنہ تم اور میری محبت کے حملوں کا مقابلہ، سلیمہ؟ ____ فطرت کا سیلاب فرض کا حصار باندھنے سے نہیں رکتا۔

سلیمہ! میری اپنی سلیمہ ____ یقین کرو کہ میں جب اپنی روح کی گہرائیوں میں اتر کے دیکھتا

ہوں مجھے نظر آتا ہے کہ تم نہ صرف ایک زندگی میں بلکہ کئی زندگی میں میری جیون کی ساتھی تھیں، میرے جذبات کی شریک تھیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ میری ہستی کی شریک تھیں، عالم ازل میں میرے وجود کا نصف حصہ تھیں۔ عالم ارواح میں میری روحانی رشتہ دار تھیں، اور عالم عناصر میں جسمانی حیثیت سے مجھ سے میرے عناصر سے میرے ذرات سے قریب تھیں ___ تم یہ سن کر تعجب تو نہ کروگی کہ روحیں روحانی تعلق کے علاوہ جسمانی تعلق سے بھی متاثر ہوتی ہیں، اور ان تاثرات کو کئی زندگیوں تک لئے رہتی ہیں۔ عشق کیا ہے، روح کے اندر انہیں تاثرات کا ایک شعور ___ اور حسن کیا ہے روح کے حافظے میں ان مانوس چہروں کی ایک جھلک، جو کسی عالم یا کسی زندگی میں ہمیشہ پیش نظر تھے۔ اور روح جن کی قربت سے لطف اندوز تھی ___ چہرے کی ترکیب اور جسم کی بناوٹ میں تناسب و ترصیع کی فنی قلم کاریوں کا شعور جو تہذیب کی برکت سے ہم میں پیدا ہو گیا ہے، قطع نظر اس کے، حسن اگر کچھ ہے تو وہی چہرے کی مانوسیت ___ دو مانوس صورتیں ___ جن سے کسی عالم میں انس تھا جب ان کا عکس کسی دوسرے چہرے میں نظر آتا ہے دل بے اختیار کھنچتا ہے اور طبیعت بے ساختہ لپکتی ہے، اور اس کے مقابلے میں کوئی صورت فنی اعتبار سے کتنی ہی معیاری کیوں نہ ہو مگر آنکھوں میں نہیں کھپتی اور اگر نظر میں چڑھ بھی جاتی ہے تو دل میں اپنی جگہ نہیں بنا سکتی ___ کچھ تو یہ مانوسیت عشق کا باعث ہوتی ہے۔ اور کچھ روحانی رشتہ داری یعنی عام ارواح میں روحوں کی باہمی قربت، یا پھر بعض حالتوں میں عناصر کی کشش، ان عناصر کی کشش جو پچھلی زندگی میں اپنے جسم کے شریک تھے اور اس زندگی میں ایک دوسرے کے جسم کے اجزا بنے ہوئے ہیں ___ اس کے علاوہ ان اجزائے نور میں بھی، روح کی جن سے ترکیب ہے، کشش ہوتی ہے، یہ کشش تمام کششوں سے زیادہ بے پناہ ہے۔ روحوں میں جنسیت کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ یوں سمجھو کہ نور کے ایک ٹکڑے سے جب دو روحیں بنتی ہیں تو ایک ٹکڑے میں دوسرے ٹکڑے کے لئے قدرۃً کشش ہوتی ہے، اور یہی کشش زندگی میں جنسی کشش بن جاتی ہے، اور ایک جز و نور دوسرے جز و نور کو بے اختیار ڈھونڈتا ہے، زمانہ حال کے صوفیوں کا خیال ہے کہ جب تک دونوں بچھڑے ہوئے ٹکڑے ایک انفرادیت میں آ کر گھل مل نہیں جاتے ہیں، اس وقت تک وہ وصال حقیقی حاصل نہیں ہوتا جو روحوں کے ارتقا کی آخری منزل ہے۔

اب تو تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ جس عشق کا تم مضحکہ اڑاتی ہو اس کی بنیادی حقیقت کیا ہے؟ ہر انسان انفرادی حیثیت سے کیوں بے قرار ہے، حقیقی سکون اسے کیوں نہیں ملتا، عام طور پر ازدواجی زندگی

کیوں کامیاب نہیں ہوتی ___ تم نے دیکھا ہوگا اور دیکھا نہیں تو سنا ہوگا کہ ہماری سوسائٹی کے اکثر منچلے لوگ حسن کی سینکڑوں دوکانوں پر اشرفیاں کوڑیوں کے مول لٹانے کے بعد سیکڑوں حسین کھلونوں سے کھیلنے کے بعد ایک کالی کلوٹی کمر وعورت پر بری طرح ریجھتے ہیں۔ اور زندگی بھر کے لئے اسی کے ہو کر رہ جاتے ہیں، آنکھوں کا سرکش سے سرکش جادو اور وفاء محبت کا مہلک سے مہلک منتر انہیں اس عورت سے جدا نہیں کر سکتا۔ ایسی درجن سے زیادہ مثالیں میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ کہو تو گنوادوں، اس کے علاوہ پندرہ سال کی چھوکریوں کو ساٹھ سال کے بوڑھوں پر اور سبزہ آغاز جوانوں کو پچاس سال کی بڑھیاؤں پر جان چھڑکتے بھی دیکھا ہے۔ دنیا یہ سارے تماشے حیرت کی آنکھوں سے دیکھتی ہے، اور نہیں جانتی کہ یہ کیا ہو رہا ہے ___ صرف چیختی ہے اور غل مچاتی ہے، وہ روحانیت کا یہ گہرا راز کیا سمجھے وہ کیا جانے کہ زندگی کے سفر میں چند قدم آگے یا پیچھے رہنا محبت کی نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، وہ تو صرف یہ جانتی ہے کہ سلیمہ محمود سے چند مہینے پہلے دنیا میں آگئی، اس لئے برادری کے قانون اور عورتوں کی شریعت کے رو سے محمود کی بیوی نہیں بن سکتی ___ سلیمہ! مجھے تم سے کوئی شکایت ہے تو یہی کہ تم دوڑ کے کیوں چلیں اور مجھ سے پہلے کیوں پہنچ گئیں۔ یہ کیوں نہ دیکھا کہ میں پیچھے آ رہا ہوں۔ مجھے آگے کیوں نہ بڑھنے دیا۔ یہ کیوں نہ سمجھیں کہ چند قدم سست چلنے کے جرم سے تم مجھ سے چھین لی جاؤ گی، ایک پوری زندگی کے لئے چھین لی جاؤ گی۔ سلیمہ اگر تناسخ کا عقیدہ صحیح ہے تو تم کئی زندگیوں میں میری رہی ہو اور میں کئی زندگیوں سے تمہارا پیچھا کر رہا ہوں، اگر تناسخ کے عقیدے کے مطابق میں اس دنیا میں اپنا پچھلا قرض ادا کر رہا ہوں۔ یاد نہیں آتا کہ یہ قرض کیسا ہے۔ پچھلی زندگی میں مجھ سے کون سی ایسی بھول ہوئی تھی یہ جدائی جس کی پاداش ہے ___ تمہیں بتاؤ کہ تم کس جرم پر مجھے چھوڑ کر بھاگ آئیں۔ اچھا کیا بھاگ آئیں، میں بھی بھاگ رہا ہوں ___ بھاگ جاؤں گا اتنی تیزی سے بھاگوں گا کہ تم پیچھا نہ کر سکو، اتنی دور نکل جاؤں گا کہ کئی زندگیاں میرے اور تمہارے درمیان میں حائل ہو جائیں۔

بس اب زیادہ نہیں لکھ سکتا، دماغ جذبات سے مغلوب ہو رہا ہے۔ تمہاری یاد آوری کا شکریہ، میری حالت نہ پوچھا کرو اپنی زندگی کا ماتم دار ہوں۔ کاش تم اس ماتم میں شریک ہوتیں، تعزیت دیتیں ہمدردی کرتیں۔ آنسو پوچھتیں، لیکن اے گھروندے کی بیوفا ساتھی ___ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا ___ اپنی ہی آستیں اور اپنے ہی آنسو ___ قابل رحم ہے یہ بیکسی، جن آنسوؤں کو تمہارے دامن میں جگہ ملنی چاہئے، انہیں بمبئی کی خاک جذب کر رہی ہے ___ کیا کسی زندگی میں تم اپنی یہ امانت اس

سے واپس لے سکو گی؟ اچھا خدا حافظ! دل کی آنکھیں کھول کر دیکھو، ایک ٹوٹی ہوئی کشتی سمندر کی لہروں سے کھیلتی طوفان کے جھونکوں کا مضحکہ اڑاتی ___ ساحل سے قریب ہوتی جا رہی ہے ___ پہچانتی ہو؟ یہ کشتی نہیں میری زندگی ہے ___ میری زندگی کی بولائی ہوئی ناؤ جس پر چڑھنے سے تم نے انکار کیا تھا اور میں جسے آج کل تنہا کھے رہا ہوں۔ گو تنہا نہیں کھے سکتا بازو شل ہو رہے ہیں اور دم پھول رہا ہے ___ بہت ممکن ہے کہ پتوار ہاتھوں سے چھوٹ پڑے اور میں اپنے کو موجوں کے رحم پر چھوڑ دوں ___ مگر نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ___ پروین میرے پیچھے تیرتی ہوئی آ رہی ہے وہ میری کشتی پر زبردستی چڑھنا چاہتی ہے ___ میں اپنی کشتی تیز بھگاؤں گا اور بہت جلد اس کی پہونچ سے باہر جاؤں گا ___ اچھا سلام لو ___ ساحل قریب ہے اور ___ تم بہت دور ___

اپنی زندگی کا سوگوار،

محمود

مجھے خط کی ہر سطر میں محمود کا دل کروٹیں لیتا ہوا نظر آ رہا تھا، میں خط پڑھتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی، دل اس کے قلم کے چرکوں سے ململا رہا تھا اور میں محسوس کر رہی تھی، ان چرکوں کے بعد میرا احساس فرض پھر پنپ نہیں سکتا، یہاں تک کہ اس نے اپنے فلسفہ عشق کی تفسیر شروع کی اور میرا دماغ اپنی نم شعوری حالت سے چونکنے لگا اور جذباتی کیفیت کی جگہ ایک ذہنی کیفیت مجھ پر طاری ہونے لگی۔ اس کی دلیلوں کے جواب خود بخود میرے سامنے آنے لگے۔ لیکن خط کے اختتام پر پھر ایک طوفان اٹھا اور میری خودی پھر اس میں ہچکولے کھانے لگی ___ آخری سطروں میں اس نے اپنی زندگی کا کشتی سے استعارہ کیا تھا ___ نظر وہاں تک پہونچی ہی تھی کہ مجھے اپنا ہولناک خواب اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ یاد آیا ___ اور میں پھر بے چین ہو گئی۔ دو دن تک میں خط کو بار بار پڑھتی رہی اپنے اوہام کو ٹالتی اور اپنے دل کو سمجھاتی رہی، اسی عالم میں میں نے یہ فیصلہ کیا کہ مجھے فوراً کلکتہ واپس جانا چاہیے، ورنہ جو زندگی آج کل شروع ہو گئی ہے وہ مجھے ایک نہ ایک دن گرہست آشرم کی چار دیواریوں سے باہر نکال کر رہے گی، چنانچہ یہ سوچ کر میں نے محمود کے خط جواب لکھنے سے پہلے اپنے شوہر کو خط لکھا اور یہ فرمائش کی کہ پہلی فرصت میں مجھے کلکتہ بلوا لیا جائے، طبیعت کچھ ٹھکانے ہوئی تو محمود کے خط کا جواب لکھنے بیٹھی اور یہ سوچ کر بیٹھی کہ اپنے دل کی تمام کیفیتوں کو کھول کر اس کے سامنے رکھ دوں گی ___ اس لئے کہ مجھے خوف تھا کہ وہ میری محبت کی طرف سے قطعی مایوس ہو کر کہیں واقعی خودکشی نہ کر لے ___ اور اس کو ہر

قیمت پر زندہ دیکھنا چاہتی تھی ___ بہر حال میرا خط ملاحظہ ہو:

''میرے اچھے محمود،

خدا تمہیں توفیق دے کہ تم مجھے اور میرے دل کو پہچاننے کی کوشش کرو، ایک گھروندے کے کھیلے ہوئے دو بچے جوان ہو کر ایک دوسرے سے اتنا بھی اجنبی ہو سکتے ہیں؟ ___ جتنا کہ تم اپنی سلیمہ سے ہو ___ ارے دیوانے! محبت کوئی چراغ نہیں ہے جسے پھونک مار کے بجھا دیا جائے ___ یہ دل کی آگ تو ہڈیوں تک کو سلگا کے رہتی ہے، یہ اور بات ہے کہ دھواں نہ اٹھے، یا نہ اٹھنے دیا جائے۔ چولھے میں آگ جب موجود ہو تو یہی غنیمت ہے کہ شعلے نہ بلند ہوں ___ اس سے زیادہ تو میں نے کبھی بھی حوصلہ نہیں کیا ___ آنچ تیز تھی، اسے دھیمی کرنے کی کوشش ضرور کرتی رہی اور کئی مرتبہ اسے دبا رکھنے میں کامیاب بھی ہوئی۔ لیکن نہ جانے کون سا ہاتھ تھا؟ ___ کس کا ہاتھ تھا؟ جو کجلائی ہوئی چنگاریوں کو اکساتا رہا اور آنچ دھیمی ہو ہو کر تیز ہو گئی ___ اے جذب و کشش کے فلسفی ___ دیکھ تو کہیں اس آگ کو بھڑکائے رکھنے کی ذمہ داری تجھ پر تو نہیں ہے ___ میں نے چاہا تھا کہ جلنا جب مقدر ہو چکا ہے تو خود جلوں گھر کو نہ جلنے دوں ___ مشیت نے جس امتحان میں ڈال دیا ہے اس سے سرخرو ہو کر نکلوں ___ زندگی کے معرکے میں ___ فرض کی قربانگاہ پر ___ ایک مجاہد کی طرح ثابت قدم رہوں۔ بزدلوں کی طرح میدان چھوڑ نہ بھاگوں ___ اپنے کام نہیں آسکتی تو دوسروں کے کام آؤں۔ خود وہ دسروں کے لئے جیتی رہوں ___ اور تجھے اپنے لئے جیتا رکھوں ___ لیکن اپنے کار زار حیات کے بزدل سپاہی جب تجھے یہ منظور نہیں ___ اور زندگی سے بھاگ کر موت کی گود میں پناہ لینا ہی تیری نظر میں حیات عشق کا سب سے بڑا کارنامہ ہے ___ تو اے مشیت کے ہٹیلے بچے بسم اللہ کر ___ تیری سلیمہ اس راہ میں تجھ سے پیچھے نہ ہوگی۔

صحرائے زندگی کی آوارہ گردی مبارک!

لیکن اے منزل کی طرف تیزی سے بھاگنے والے مسافر! قریب آ کر دیکھ ___ وہ درخت وہ سایہ اور درخت جس کی چھاؤں میں تیرا بسیرا تھا، اور جس کے نیچے کسی دوسرے نے اپنا بستر پھیلا دیا ہے زندگی کے کیڑے اس کو چاٹ رہے ہیں، اور حالات کی رفتار اس میں گھن لگا رہی ہے۔ گو اب بھی کھڑا ہے، لیکن گرد و پیش کی تند و تیز ہواؤں کا مقابلہ اب اس سے نہیں کیا جاتا، طوفان کا ایک تند جھونکا اور بس ___ گر رہا ہے اور گر جائے گا، اس کو گرتا ہوا دیکھ لے ___ اور اس کے بعد اپنی راہ لگ۔

بیوفائی کا الزام شکریئے کے ساتھ قبول، لیکن اے میرے عادل کس نے کس سے بیوفائی کی ___ میں نے ایک سے محبت کرنے کے بعد دوسرے سے محبت کی ہوتی ___ دل کا تحفہ ایک سے چھین کر دوسرے کو بڑھا دیا ہوتا تو شاید یہ الزام انصاف کی نظر میں کوئی وقعت رکھتا۔ لیکن واقعات تو کچھ اور کہتے ہیں ___ میں زبردستی ایک مرد کی گود میں پھینکدی گئی، اور تم شوق سے ایک عورت کے آغوش کی طرف بیتابانہ بڑھے ___ محمود گریبان میں سر ڈالو۔ کیا یہ حقیقت نہیں؟

میں نے تم سے محبت ضرورت کی لیکن پیانِ محبت باندھتے ہوئے میں نے تم سے یہ معاہدہ کب کیا تھا کہ میں تمہیں وہ سب کچھ دے دوں گی جو میرا نہیں ہے۔ دل میرا تھا سو وہ میں نے تم کو بہت پہلے سونپ دیا، میں اپنی نہ تھی پھر میں اپنے کو تمہیں کیوں کر دے ڈالتی۔ تم اپنے کو اپنی ملکیت سمجھو لیکن میں اپنے کو اپنی ملکیت کیوں کر سمجھتی، میں اپنی نہ تھی اپنے ماں باپ کی تھی، اپنی برادری کی تھی اپنے خدا اور اپنے سماج کی تھی اور انھوں نے اپنی چیز جس کو چاہا اٹھا کر دیدی ___ میں نے بہت سے لوگوں کی امانت چپکے سے اٹھا کر تمہیں کیوں نہ دیدی، سماج اور فرض کی دیواریں پھانک کر تمہارے ساتھ نکل کیوں نہ کھڑی ہوئی ___ ہندوستان کے بہت سے رومانی افسانوں میں حسن و عشق کی ایک رنگین داستان کا اضافہ کیوں نہ کر سکی ___ اگر یہی میرا جرم اور اسی جرم کا نام تمہاری لغت میں بیوفائی ہے تو مجھے فخر کے ساتھ اعتراف ہے کہ میں بیوفا ہوں۔

اب رہا اس بیوفائی کے جرم میں اگر تمہاری عدالت کا فیصلہ یہ ہے کہ تمہارا دل مجھ سے چھین کر پروین کو دے دیا جائے ت تو یہ فیصلہ بہت مبارک ہے ضرور دے دیا جائے، لیکن عذر صرف یہ ہے کہ جس چیز کو میرے پاس سمجھا جا رہا ہے وہ میرے پاس نہیں، اگر میرے پاس ہوتی تو ثریا کے پاس کیوں کر پہونچ جاتی ___ وہ شاید ثریا ہی کے کوٹھے پر چھوٹ گئی ہے ___ جبھی تو پروین غریب اس سے اب تک فائدہ نہ اٹھا سکی۔ تم لکھتے ہو کہ پروین اس کی مستحق بھی ہے، اور قدرداں بھی ہے۔ بہت درست لیکن میرے خیال میں ایک استحقاق اس کا اور بھی ہے یعنی یہ کہ وہ مستحق اور قدرداں ہونے کے علاوہ اس کی منھ مانگی قیمت بھی دے رہی ہے، جو کم از کم میں نہ دے سکی، اور یہ حقیقت کتنی ہی کڑوی کیوں نہ ہو، لیکن بہر حال حقیقت ہے کہ کچھ لوگ محبت کرتے اور کچھ لوگ محبت کے نام سے تجارت کرتے ہیں ___ تم شاید عاشق نہیں، عاشق کے بھیس میں تاجر تھے، جو کسی کو دل دے کر اس کی قیمت مانگتے رہے، اس کے معاوضے میں اپنے نفس کے مطالبات کی ایک طولانی فہرست پیش کرتے رہے اور جب وہ مطالبات

پورے نہیں کئے گئے تو بدمعاملگی کا الزام دیتے رہے۔ میں بدمعاملہ ضرور ہوں، لیکن تم سے نہیں تمہارے بھائی سے ___ اس شریف ترین انسان سے جس نے مجھ پر اعتماد کیا مجھ سے محبت کی ___ محبت نہیں غلامی کرتا رہا، اور میں اس کے ان مخلصانہ جذبات کے معاوضے میں اپنے دل کا ایک ٹکڑا بھی توڑ کر نہ دے سکی۔ کیوں نہ دے سکی، اس لئے نہ دے سکی کہ دل میرا نہ تھا، یہ چیز دوسرے کی ہو چکی تھی۔

ایک کے ساتھ خوش معاملگی دوسرے کے ساتھ بدمعاملگی ہو جاتی ___ میں اپنے شوہر کی قرضدار ہوں، لیکن یہ قرضداری کسی بدنیتی کی بنا پر نہیں ہے، میری مفلسی کی بنا پر ہے، میں دل کی پونجی اور جذبات کا سرمایہ لٹا کر مفلس ہو چکی تھی، قرض کہاں سے ادا کرتی ___ نتیجہ یہ ہوا کہ قرض رہ گیا۔ اور قرض داری کے احساس نے روح کو اتنا ڈرپوک کر دیا کہ وہ اب اس سلسلے میں کسی دوسری خیانت کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔

محمود؟ ہوش میں آؤ کیسی تلاش اور کیسا سکوں ___ یہ چیز تو انہیں ملتی ہے جو کچھ نہیں چاہتے ___ جو کچھ چاہتے ہیں یہ چیز انہیں نہیں ملا کرتی ___ وہ کہ جو اپنی ہر خواہش کا پجاری ہو ___ وہ کہ جس کی زندگی اس کے نفس کے مطالبات کی آواز ہو ___ وہ کہ جو اپنے دل کے حکم پر غلاموں کی طرح دوڑتا ہو ___ سکون کی تلاش کا حق اسے حاصل نہیں ___ خواہش اور سکون نیازمندی اور بے نیازی، آگ اور پانی۔ یہ اچھا رشتہ تم نے لگا رکھا ہے، تڑپنا بھی چاہتے ہو اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی چاہتے کہ نہ تڑپو۔ یہ کیسی دیوانگی ہے، تم نے تڑپنا چھوڑا ہوتا، خواہش کی غلامی ترک کی ہوتی، نفس کی باگ موڑی ہوتی تو سکون بھی شاید تمہیں کہیں نہ کہیں مل جاتا۔ اور پھر یہ کہ سکون کی اگر تلاش ہی تھی تم نے اسے لال پانی کی رنگین بوتلوں میں کیا ڈھونڈھا بازارِ حسن کی چمکیلی دوکانوں پر کیا تلاش کیا، ڈھوڈھنا ہی تھا تو ایک دن مامتا کی گود میں اسے ڈھونڈھا ہوتا۔ ماں کے پیار سے مانگا ہوتا، ماں کے پیار سے، اس ماں کے پیار سے جو روزانہ آدھی رات سے پچھلے پہر تک تمہارے جینے کی دعائیں مانگا کرتی ہے ___ اور جب سے تمہارے بمبئی جانے کی خبر سنی ہے، اس دن سے آج تک جس کی آنکھوں کی برسات کسی طرح ختم نہیں ہوتی، حالانکہ موسم بدل رہا ہے، جاڑا تھا گرمی آئی، لیکن اس کے آنسو کی جھڑی جو لگی تھی سو لگی ہوئی ہے، تمہاری بہنیں تمہارے لئے بے چین ہیں اور تمہارا بھائی تمہارے مستقبل کے لئے متفکر ہے، لیکن تم کس عالم میں ہو کہ وہاں تک کسی کے دل کی آواز نہیں پہونچتی۔ محمود اگر وہ تمام جذبات لطیف جو کل تک تمہارے سینے میں موجود تھے اگر آج مجھے پا لیتے اور مجھے پا کر خوب بھینچ بھینچ کے پیار کرنے کی

خواہش میں گم نہیں ہو گئے ہوتے، تو میرے بھائی تمہیں شرم آنی چاہیے کہ تمہاری ایک ذلیل سی خواہش نے کتنے مقدس جذبوں اور کتنی معصوم تمناؤں کو پامال کیا ہے۔ کاش تم نے یہ دیکھنے کی ضرورت سمجھی ہوتی کہ جس راہ میں تم چل رہے ہو، اس راہ میں کتنے دل تمہارے قدموں کے نیچے بچھے ہوئے سسک رہے ہیں ___ مگر نہ جانے تمہارا ضمیر کتنی گہری نیند سو رہا ہے۔ تم اپنی موجودہ حالت پر غور کرنے اور شرمانے کی جگہ الٹا اس پر اصرار کرتے ہو۔ اپنی کمزوریوں میں فلسفے کا رنگ بھرتے ہو، اپنی حماقتوں کو خرد کا فیصلہ بتلاتے ہو ___ محمود اس دنیا میں تم شاید پہلے شخص ہو جس سے عیاشی کے جواز میں روحانیت کی مدد سے ایک فلسفیانہ استدلال پیش کیا ہے۔ کہتے ہو کہ جب نظر کا انتخاب اور روح کا مطلوب کسی سے چھین لیا جاتا ہے، تو یہی ہوتا ہے ___ میں پوچھتی ہوں کہ کیوں ایسا ہوتا ہے؟ کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ اپنے محبوب نظر پھول کے چھین لئے جانے کے بعد دنیا کا ہر پھول نظر سے گر جائے ___ کوئی کلی بہ اعتبار رنگ و بو کتنی ہی جاذب روح کیوں نہ ہو، لیکن جدائی کی سوگواروں کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے ___ یہ بات تو خیر میری سمجھ میں آتی ہے، کہ جب تک روح کا مقصود نظر کے دائرے میں نہ آئے، اس وقت تک آتما اس کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتی رہے، لیکن مل جانے کے بعد اگر وہ چیز اپنی ملکیت نہ ہو تو ادھر ادھر اس کی تلاش میں سرگرداں پھرنے کے کیا معنی؟ ___ سلیمہ کو کھو کر ثریا کی چوکھٹ پر سجدہ کرنے کے کیا معنی۔ کیا تمہاری سلیمہ نے ثریا سے اپنا جسم بدل لیا تھا، محمود میاں؟ یہ آپ نے عشق کی تعریف کی ہے یا عشق کا مضحکہ اڑایا ہے، ذرا سوچئے تو:

ع ہم الزام انکو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

مصیبت یہ ہے کہ آپ نے ضرورت کے احساس کو عشق سمجھ لیا ہے، خود فریب میں مبتلا ہیں اور مجھے بھی اس کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر آپ یہ کہتے کہ سلیمہ کو کھو کر مجھے ایک ثریا کی ضرورت تھی تو آپ کی ضرورت کے اس احساس پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا، مگر آپ تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ سلیمہ کی تلاش میں ثریا تک پہونچے حالانکہ سلیمہ ثریا کے کوٹھے پر نہیں، کلکتہ میں تھی۔ اور یہ جاننے کے باوجود آپ نے ثریا کے کوٹھے کے سفر کو کلکتے کے سفر پر ترجیح دی۔ شاید اس اقدام میں روحانیت کا کوئی بہت ہی گہرا راز ہو، کوئی بہت ہی پیچیدہ فلسفہ ___ کوئی بہت ہی لطیف شاعری جو کم از کم میری سمجھ سے باہر ہے۔

اب رہے اس سلسلے میں دوسرے مسائل، تو کشش روحانی کی میں قائل ضرور ہوں، اور یہ

بھی سمجھ سکتی ہوں کہ روحیں اپنے پیکر خاکی میں آنے سے پہلے ایک عالم میں رہتی ہیں اور اس عالم میں ایک دوسرے سے محبت اور نفرت بھی کر سکتی ہیں، اور ان کی اس محبت و نفرت کا اثر اس دنیا کی زندگی میں بھی نمایاں ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ اجزائے نور کی کشش بھی مسلم، ذرات کے مقناطیسی جذب کا فلسفہ بھی صحیح، اور روحانی رشتہ داریوں کا تصور بھی غلط نہیں، لیکن اس سے یہ نتیجہ کیوں کر نکالا جا سکتا ہے کہ بعض حالات کے ماتحت اگر دو اجنبی روحوں میں ازدواج کا رشتہ قائم کر دیا جائے تو یہ رشتہ ازدواج فطرت کے قانون کی خلاف ورزی ہوگی۔

فطرت کا تو کاروبار ہی یہی ہے کہ وہ موافق اور ناموافق ذرات کے اختلاط سے زندگیاں بناتی ہے، آگ و پانی کے امتزاج سے خاک و باد کے اتحاد سے نور و ظلمت کی ترکیب سے طبیعتیں تعمیر کرتی ہے ___ عناصر کی دنیا میں اگر اس کا قانون یہ ہے تو اس کے ساتھ اگر میں یہ بھی سمجھوں کہ روح کی دنیا میں بھی اس کا یہ قانون اسی طرح کام کرتا ہے، تو میرا یہ عقیدہ کیوں غلط سمجھا جائے۔ میں کیوں یہ نہ سمجھوں کہ فطرت کا قانون اجنبی عناصر اور اجنبی ذات کی طرح اجنبی روحوں میں رشتہ ازدواج و رشتہ اتحاد باندھ کر روحانی رشتہ داری اور روحانی برادری کے دائرے کو وسعت دینا چاہتا ہے ___ اور ہمارا سماج اور اس کا قانون بھی اسی قانون طبیعت کی پیروی میں دو اجنبی روحوں کو میاں بیوی بنا کر یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ حالات سے مفاہمت کرنا سیکھیں ___ اور باہمی تعلقات سے ایک دوسرے کی روحانی اجنبیت کو دور کرنے کی کوشش کریں ___ ہمارا تمدن اور ہمارا سماج اپنے بچوں کو جزو نور کی جستجو اور روحانی رشتہ داری کی تلاش کے لئے مطلق العنان کیوں کر چھوڑ دے، ان میں سے ہر ایک کو وہ شاعر نہیں آدمی بنانا چاہتا ہے ___ ہر ایک سے کچھ کام لینا چاہتا ہے۔ ایک انسانیت کبریٰ کی تعمیر اس کے پیش نظر ہے۔ اس کے تمام بچے بچیاں اگر لیلیٰ جنوں ہی بن جائیں گے تو اس کا کارخانہ کون چلائے گا۔ اس کے خوابوں کو پورا کون کرے گا۔ فطرت کے مقصد آفرینش کی تفسیر کیوں ہوگی ___ تم شاعر آدمی شاید بول اٹھو کہ مقصد آفرینش، تو یہی تلاش ہے، اچھا مقصد آفرینش ہے کہ انسانیت اگر اجتماعی حیثیت سے جی کھول کے اس کا حق ادا کرنے لگے تو شاید نصف صدی کے اندر تمدن کی یہ محفل نجد کا جنگل بن جائے، جس میں اس کنارے سے اس کنارے تک سوائے ماتم فراق کے کوئی آواز سنائی نہ دے۔ اچھا مقصد آفرینش ہے کہ دونوں کو محبت کی تڑپ دے کر ایک کا سراغ دوسرے پر گم کر دے اور گم کر کے ان کی گمرہی اور پریشانی کا تماشا دیکھے، غور تو کرو کہ یہ جدائی ہوئی یا بازی گری ___ عوام کی ٹھیٹھ اصطلاح

میں ایسے آدمی کو شیخ چلی کہتے ہیں ___ اور خدا شیخ چلی نہیں ہے:

بس کھل گئی حقیقت نقاشی خیال
سب اپنے رنگ بھر دئے تصویر یار میں

روحانی رشتہ داری کو میں حقیقت ضرور سمجھتی ہوں، لیکن اس میں میرے فکر کی لکیر بالکل سیدھی ہی ہے، جو تمہاری فکر کی لکیر کی طرح خم کھاتی اور قدم قدم پر نئی نئی پگڈنڈیاں نکالتی ہوئی نہیں چلتی، یہی وجہ ہے کہ میرا سفر ایک نتیجے پر پہونچ کر ختم ہوتا ہے، تمہارا دماغ چوراہوں پر بھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ جنسی تفریق کا تعلق جسم سے ہے یا روح سے؟ پھر یہ کہ نور کے ٹکڑے سے صرف دو ہی روحیں ایک زنانی اور ایک مردانی کیوں بنتی ہیں، دو سے زیادہ کیوں نہیں بن سکتیں۔ فرض کرو کہ اگر تین بن جاتیں تو تیسری کا جنسی جوڑ کہاں سے لایا جائے گا؟

بات یہ ہے کہ یہ سب تمہاری شاعرانہ خوش فکری ہے، تم روح کی ترکیب میں خواہ مخواہ جنسیت کو شامل کر کے غلط بنیاد پر غلط تصور قائم کرتے ہو۔ ورنہ روحوں میں نہ کوئی جنسی تفریق ہے۔ نہ جنسی لگاؤ، ہاں روح کا وجود نورانی ہے اور اجزائے نور بھی مادی عناصر کی طرح آپس میں کشش رکھ سکتے ہیں، اور اس کشش کے ماتحت روحیں عالم ارواح میں ایک جگہ رہ سکتی ہیں۔ اور ایک ملک ایک سماج ایک خاندان اور ایک بطن میں کھچ کر آسکتی ہیں، دوسرے لفظوں میں ہمارے دنیاوی تعلقات اور یہ دنیاوی رشتہ داریاں اسی روحانی رشتہ داری کا پرتو ہوسکتی ہیں ___ تمہارے روحانی تعلق کے فلسفے سے اگر کوئی معقول نتیجہ نکالا جا سکتا ہے تو بس یہی ___ ورنہ ہمارے جنسی میلان کا ہماری روح سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہارا فلسفہ رومانی طبیعتوں کے لئے کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، لیکن اجتماعی حیثیت سے اس کا عملی رخ اتنا بھیانک ہے کہ انسانیت اسے کبھی قبول نہیں کر سکتی، اس لئے کہ اس کے قبول کر لینے کے بعد زندگی کے سامنے کوئی مستقبل نہیں رہتا ___ ظاہر ہے کہ جب ایک مغرب میں پیدا ہوسکتا ہے اور دوسرا مشرق میں، تو غور کرو کہ ایک عمر تک جیون ساتھی کی تلاش میں زندگی کا سرمایہ لٹانے کے بعد انسان کی جھولی میں کیا رہ جائے گا، جسے لے کر وہ ارتقاء کا سفر شروع کرے گا۔ زندگی کی شام ہونے کے بعد روحانی جوڑا کسی شخص کو اگر مل بھی گیا تو کیا؟ ارتقا کی منزلیں تو یونہیں رہی جاتی ہیں، اور پھر یہ کہ مل جانے کے بعد بھی کون جانتا ہے کہ فطرت کا بیرحم قانون پھر جدائی کی خلیج پیدا نہ کر دے گا۔ فرض کرو کہ موت نے اسے چھین لیا اور عدم کے سفر میں ایک دوسرے سے پیچھے رہ گیا تو پھر وہی تلاش۔ فرض کرو کہ تلاش کا

سودائی اپنی زندگی ختم کر کے اس کی تلاش میں عالم ارواح تک پہنچے لیکن اس کے وہاں پہونچنے سے پہلے اس کا ساتھی عالم عناصر کی طرف منتقل کر دیا جائے تو پھر وہی تلاش۔ آخر تلاش کے اس غیر متناہی سلسلے کا کچھ اُور چھور بھی ہے کوئی مقصد بھی، کوئی نتیجہ بھی، یا بس یونہیں اللہ میاں کا ایک شاعرانہ ذوق اور کارکنان قضاوقدر کی ایک شاعرانہ خوش فعلی۔

میں نے ایک مسلمان گھر میں آنکھیں کھولی ہیں، میری فکر ایک خالص اسلامی ماحول میں پلی ہے اس لئے تناسخ کے عقیدے سے مجھے طبعا کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی، لیکن چونکہ تم تناسخ کے قائل ہو چکے ہو، اس لئے تم سے پوچھتی ہوں کہ زندگیوں کا یہ تسلسل اور حیات مادی کی یہ تکرار اگر تربیت کی غرض سے ہے، اگر مختلف زندگیوں کے مختلف تجربات سے روحوں کی ارتقا مقصود ہے تو ذرا سمجھ کے جواب دو کہ روح کی ارتقا اپنی خواہشات پر قابو پانے میں ہے یا اپنی خواہشات کے پیچھے آوارہ پھرنے میں، روح کی عظمت اور روح کی پاکیزگی کائنات کی تمام اجنبی روحوں سے مانوس ہو جانے میں ہے، یا صرف اپنے جزونور سے محبت کرنے میں اور اس کی محبت میں تمام خلق اللہ کے حقوق سے بے پروا ہو جانے میں۔ ایک روح حالات سے مفاہمت کر سکتی ہے، دوسری نہیں کر سکتی، ایک روح زندگی کے معرکوں کو جھیل رہی ہے، دوسری اس سے بھاگ رہی ہے، ایک روح اپنی ہر خواہش کی غلامی کر رہی ہے دوسری اپنے ہر جذبے پر ایک شاہانہ تسلط کے ساتھ حکمراں ہے، اپنے روحانی گرو سے پوچھو کہ ان دو روحوں میں کون منزل سے قریب ہے، اور کون صراطِ مستقیم سے بھٹکی ہوئی ہے، اگر یہ جواب ملے کہ وہ روح جو نفس پر حکمراں ہے، تو پھر کوشش کرو اپنے نفس اور اس کے تمام میلانات پر حکومت کرنے کی، ترک کرو غلامی اس خواہش کی جو تم سے کبھی سلیمہ کو پجواتی ہے کبھی ثریا کی چوکھٹ پر ناک رگڑواتی ہے، اور کبھی پروین کے نخل حیات پر جھولہ ڈالتی ہے۔ اگر کسی زندگی میں کسی خاص چہرے کی کوئی خاص نوک پلک تمہیں محبوب تھی اور اس زندگی میں تمہارا ذوق نظر اس کی جھلک میرے یا ثریا کے چہرے میں دیکھ رہا ہے تو تم اپنے نفس کی ضد پر ادھر نہ دیکھو ___ اور سماج کے قانون کے رو سے رشتہ ازدواج باندھ لو ایک ایسی عورت سے جس کی آنکھیں میری آنکھوں کی طرح بڑی اور کٹیلی نہ ہوں، بلکہ بلی کی آنکھوں کی طرح گول اور چھوٹی ہوں۔ جس کی ناک میری ناک کی طرح اونچی اور سڈول نہ ہو، بلکہ بندر کی ناک کی طرح چپٹی اور مسطح ہو، جس کا رنگ میرے رنگ کی طرح شہابی نہ ہو، بلکہ جمراتن بوا کے رنگ کی طرح آبنوسی ___ مجبور کرو اپنے دل کو ایک ایسی عورت سے محبت کرنے پر ___ مجبور کرو اور کرتے رہو

یہاں تک کہ واقعی وہ اس سے محبت کرنے لگے۔ اگر ایسا کر سکتے ہو تو پھر روحانیت کے دائرے میں بیٹھنے کا تمہیں حق ہے، ورنہ نفسانیت کا کوئی ادارہ تلاش کرو، قیس وفرہاد جیسے لوگ جس کے سرگرم ممبر ہوں، ''شبابیات'' اور ''زنانیات'' کی ترویج واشاعت جس کا محبوب مقصد ہو، مامتا کی کراہ قرض کی پکار اور وقت کا پیام جس کے دروازوں تک نہیں پہونچ سکتا ہو۔ ایک ایسے ادارے کی صدارت تمہارے لئے بہت موزوں ہوگی، اس لئے کہ ___ ایک عورت کے لئے تم نے ایک کنبے کے حقوق کو اپنے پاؤں سے روندا ہے۔ ایک دنیا کی ذمہ داریوں کو پس پشت پھینک کر بھاگے ہو ___ ماں کو رلایا ہے، بہنوں کو جھڑکا ہے، بھائی سے حسد کیا ہے، تمدن سے خفا ہو، سماج سے بگڑے ہو ___ خدا سے الجھے ہو ___ اور نفسانیت کی تاریخ میں نفس کی غلامی کی مثال اس سے زیادہ بہتر اور اس سے زیادہ مکمل کیا ہوگی۔ تمہارے روحانی ادارے کے ''اصول دین'' سے تو میں واقف نہیں ہوں، لیکن تمہارے بھائی نے تھیاسوفیکل سوسائٹی کا ایک رسالہ مجھے لاکر دیا تھا جسے ___ دیکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہونچی کہ یہ نئی روشنی کے صوفی بھی ہمارے قدیم صوفیوں کی طرح اپنے نفس اور اپنے نفس کی ہر خواہش سے جہاد کرنے میں روح کی ارتقا سمجھتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو روح کی اس خواہش کا جس کا تعلق جذبات جنسی سے ہو، اتنا احترام کیوں کیا جائے، آرزو کے اس تخم کو جو روح کا ایک ہمیشہ رسنے والا ناسور ہو جائے ایک ہمیشہ رہنے والا ناسور جو بقول تمہارے ہر زندگی میں رستا رہتا ہے، ٹپکتا رہتا ہے ___ کیوں نہ اسے کاٹ کے پھینک دیا جائے، کیوں اسے پال کے رکھا جائے، کیوں اس کی پرورش کی جائے۔ کیوں اس کے لئے اپنے پندار کو اپنی خودی کو اپنی عزت نفس کو اپنے مقصد حیات کو اپنے روحانی ارتقا کو خطرے میں ڈالا جائے۔ تم کہو گے اسی پندار اسی غرور اور اسی خودی کے علاج کے لئے تو محبت کی جاتی ہے ___ یہ کہو گے اور شاید مولانائے روم کا یہ شعر پڑھو گے:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیب جملہ علتہائے ما

میں تم سے نہیں مولانا سے کہوں گی کہ ہماری جملہ علتوں کا یہ علاج خود ایک بہت بڑی علت ہے۔ ایک ایسی علت، ایک ایسی بیماری جو نفس کے سرکش ترین پندار کو اپنے آغوش میں لئے ہے، حسن نام ہے اگر ذوق نظر کی ایک فرمائش کا اور عشق نام ہے اس فرمائش پر مسلسل اصرار کا۔ تو کیا یہ مسلسل اصرار خودی سے خالی ہے۔

اور کیا یہ خودی انسان کو حقوق العباد و حق الناس سے، بے پروا، اور زندگی اور اس کے فطری تعلقات کی طرف سے بے رحم نہیں بنا دیتی ___ اپنی زندگی کا جائزہ لو اور جواب دو۔ کیا ہم نے اپنے جذبے کے مقابلے میں کسی دوسرے کے جذبے کا احترام کیا ___ اپنی شکستگی پر دوسرے سے ہمدردی کے مدعی رہ کر کبھی دوسروں کی شکستگی پر رحم کھایا ___ سچ بولو کیا تم نے اپنے خیال کے گھروندے یں ایک ایسی دنیا نہیں بنائی، جس میں تم اور تمہاری سلیمہ کے سوا تیسرا کوئی نہیں ___ کیا یہ خالص ترین خودغرضی نہیں، اور کیا محبت خودغرضی خودفروشی اور خود پرستی کا ایک خوبصورت نام نہیں ہے، لیکن اگر تم خودی کو بے خودی کہو ___ اور خرد کا نام خواہ جنوں رکھ لو، تو اس کا ہمارے پاس بجز یہ کہنے کے اور کیا علاج ہے کہ:

ع جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

اب اگر یہاں پر یہ سوال پیدا ہو کہ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں عشق سے عشق مجازی نہیں عشق حقیقی یعنی خدا کا عشق مراد لیا ہے، تو میں یقیناً ہار جاؤں گی، اس لئے کہ میری نظر میں نہ خدا سے عشق کیا جا سکتا ہے، اور نہ اس کی اس کو ضرورت ہے، اور نہ وہ اپنے بندوں سے اس کا متقضی ہے۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی کی تفریق کی میں قائل ہوں، لیکن میں اس کو اس طرح سوچتی ہوں کہ عشق اس وقت تک مجازی ہے، جب تک کہ وہ ایک کئے لئے ہے، ایک کو پوج رہا ہے، ایک پر مٹ رہا ہے، لیکن جب کسی سے محبت کرنے کرتے طبیعت میں یہ گداز پیدا ہو جائے کہ دنیا میں کسی کا درد دیکھا نہ جائے، ہر سانس لینے والی مخلوق کے لئے دل میں ہمدردی کی تڑپ ہو، ہر رونے والی کی آنکھ کے لئے تمہاری آنکھوں میں آنسو ہوں، ہر حالات کے ستائے اور روندے ہوئے انسان کے لئے تمہاری روح میں اعانت کا جذبہ ہو تو سمجھ لو کہ عشق حقیقی کی منزل آ گئی، سچ پوچھو تو خدا کا عشق اگر کچھ ہے تو یہی عالمگیر ہمدردی اور یہی عالمگیر جذبہ ہے۔ جو اس کی مخلوق سے محبت نہیں کرتا، وہ اس سے بھی محبت نہیں کرتا۔ اس کے قانون سے محبت نہیں کرتا۔ اس کی سنتوں سے محبت نہیں کرتا۔

اپنے اس نظریہ عشق کی روشنی میں جب تمہیں دیکھتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ تم اس راستے پر چل کر بھی الٹے پاؤں چل رہے ہو ___ تم کیا الٹے پاؤں چل رہے ہو، تمہارا ادب، جس نے تمہاری ذہنیت بنائی الٹے پاؤں چل رہا ہے، ہمیشہ سے الٹے پاؤں چل رہا ہے ___ کسی سے محبت اور کسی سے محبت کے بعد ترک علائق اور ترک فرائض اور ترک علائق و ترک فرائض کے بعد خدا سے عشق، یہ ترتیب عمر بھر میری سمجھ میں نہیں آ سکی محمود، چہرے کی نوک پلک کا دھوکہ نہ کھاؤ۔ یہ آب و گل کی ایک افتاد

ہے، عناصر کا ایک طلسم ہے، فطرت کا ایک مذاق ہے، ہماری تمہاری آنکھوں سے ___ مجاز سے حقیقت اور سراب سے پانی نہ مانگو، اپنی پسند پر اصرار نہ کرو۔ مشیت کے دروازے اور سماج کی عدالت سے جو مل جائے، اس پر قناعت کرو۔ گو خود نہیں قناعت کر سکی، جو پوجنے کی چیز ہے، اسے نہیں پوج سکتی، اور جسے نہیں پوجنا چاہیے، اسے پوج رہی ہوں ___ مگر تمہاری طرح اپنی کمزوری کو فلسفہ نہیں بناتی ___ جانتی ہوں کہ یہ کمزوری یہ نفس کی کمزری، یہ فتنہ، یہ شعور کا فتنہ۔ یہ فساد یہ آب وگل کا فساد، یہ اوچھاپن یہ جذبات کا اوچھاپن، بہت دنوں کے لئے نہیں ہے، اس کی عمر شباب کی دوپہر کے ساتھ ڈھل جائے گی ___ اور خون کی حرارت اور ذرات کی گرمی کم ہوتے ہی، وہ چراغ جو آج تو دے رہا ہے، خود بخود بجھ جائے گا ___ آندھی رک جائے گی طوفان تھم جائے گا، اور حقیقت اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ زندگی کے ہر گذرے ہوئے لمحے سے اپنا خون بہا مانگ رہی ہوگی اور لمحہ یہ فریاد کر رہا ہوگا کہ معاف کر میں تجھے نہیں جانتا تھا ___ ڈرتی ہوں اس وقت سے ___ محمود! ڈرو اس وقت سے جب تمہارے شوق کی آنکھوں کے سامنے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہوگا اور میرے چہرے کی جھریاں تمہارے جذبات عشق کا منھ چڑھا رہی ہوں گی۔

اگر میں اس دن کے لئے زندہ رہی اور تمہارے بھائی خدانخواستہ زندگی کے سفر میں مجھ سے آگے بڑھ گئے ___ تو اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب کے جواب دو کہ کیا تم اس وقت بھی مجھے اپنے شبستان حیات کی دلہن بنانے پر اسی طرح مچلے رہو گے، یا ایک ٹھنڈی سانس بھر کے ایک نئے جنم کا انتظار کرو گے ___ ہاں تو جواب دو ___ میرے اس سوال کا جو جواب ہوگا، اعتبارات کی دنیا اسی کے موافق تمہارے جذبات کی قیمت لگائے گی۔

محمود اپنی زندگی کی قدر کرو ___ یہ گنوانے کی چیز نہیں، اس کے ایک جائز استعمال سے تم لاکھوں انسانوں کی قسمتیں بدل سکتے ہو ___ تمہارا وہ حوصلہ جو ہندوستان میں ایک اشترا کی جمہوریت کا خواب دیکھ رہا تھا، اور اس جمہوریت میں اپنے لئے صدر کی کرسی تجویز کر رہا تھا، آخر کس کروٹ سو گیا ہے، اس کو جگاؤ، سلیمہ نہ ملی تو نہ ملے تمہاری کوشش سے ہندوستان کو ایک اشترا کی جمہوریت تو مل جائے، ہندوستان کے بھوکوں کو روٹیاں تو مل جائیں ___ جان ہی دینا ہے تو سلیمہ کے لئے کیوں جان دو۔ وطن کے مستقبل کے لئے کیوں نہ جان دو۔ مرنا ہی ہے تو سمندر میں ڈوب کے یا موت کے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کے کیوں مرو، برطانوی سنگینوں کی چھاؤں میں سینہ پر گولیاں کھا کے کیاں نہ مرو۔ یہ بھی

کوئی بات ہوئی کہ اس بچے کی طرح جو کسی بھیانک چیز سے ڈر کے ماں کی گود کی طرف بھاگے، زندگی سے ڈر کے موت کی طرف بھاگے جا رہے ہو ___ اگر اس فریب میں مبتلا ہو؟ اگر یہ حرص تمہیں موت کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی ہے کہ کسی دوسری زندگی میں مشیت کا ہاتھ تمہاری روح کے شریک کو تمہاری روح تک پہونچا دے گا ___ تو مشیت کی نبض کس نے ٹٹولی ہے، کون جانتا ہے کہ اس زندگی میں تمہاری بہن نہ ہو جاؤں گی ___ بہت ممکن ہے کہ ذرات نور کی یہ کشش جو آج ایک دوسرے کو کھینچ رہی ہے کل ہمیں اور تمہیں ایک ہی بطن میں کھینچ کر لے جائے ___ اور پیدا بھی کرے تو اس طرح کہ میں بھائی ہوں اور تم بہن۔ اس لئے کہ جہاں تک میں تناسخ کو جانتی ہوں، اس کی روحانی رشتہ داریوں میں جنسیت کو کوئی دخل نہیں، گو عناصر کی کشش اور روح کا میلان نہیں بدلتا لیکن زندگی کے ساتھ جنسیت بدل سکتی اور اکثر بدل جاتی ہے، پھر یہ کیوں سمجھتے ہو کہ سلیمہ پہلی زندگی میں تمہاری بیوی ہی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ شوہر ہو، بہت ممکن ہے کہ بھائی ہو بہت ممکن ہے کہ پچھلی زندگی میں ایک عورت ہو۔ ایک حسین عورت۔ اور تمہاری باجی جو آج بھی تم پر جان چھڑکتی ہیں پچھلی زندگی میں مرد ہوں، تمہاری عاشق ہوں تم سے اپنے جنسی ذوق کی تسکین چاہتی ہوں، اور تم ان سے بھاگتے ہو، بہت ممکن ہے کہ آج بھی ان کی یہ خواہش نہ شعور کی گہرائیوں میں غیر محسوس ہو، اور ایک دن فعتاً محسوس ہو جائے اور وہ تم سے تناسخ کی روشنی میں وہی تقاضا شروع کریں، تو تم ان کی اس خواہش کا کیا جواب دو گے؟ محمود! جھنجھلاؤ نہیں، تم ہار گئے اور یہ کوئی نئی بات نہیں، تم بچپن سے بحث میں مجھ سے ہارتے رہے ہو اور میں مناتی رہی ہوں، اس وقت بھی جھنجھلا رہے ہو گے ___ اچھا روٹھو نہیں، میں تصور کی آنکھوں سے تمہاری جھنجھلاہٹ کو پیار کرتی ہوں ___ لو اب تو خوش ہوئے؟

اچھا ایک سوال ___ ایک گذارش۔

ایک بھیک ___ وہ سلیمہ جو بقول تمہارے تمہارے دل کی تمہارے جذبات کی تمہاری تمناؤں کی سرمایہ دار ہے، آج اس کی پھر تم سے کچھ مطالبہ کر رہی ہے ___ کیا تم، اس کے مطالبے کو ٹھکرا دو گے ___ نہیں سلیمہ بیوفا ہے تم تو بیوفا نہیں، اچھا تو اے وفا کے مبلغ دل کی آنکھیں کھول کر دیکھو، کہ تمہاری سلیمہ تمہارے پاؤں پر سر رکھے آنکھوں میں خون جگر کا تحفہ لئے تم سے تمہاری زندگی کی بھیک مانگ رہی ہے ___ خدا کے لئے اس چیز کو جو تمہاری نظر میں اتنی حقیر ہے کہ اسے سمندر میں پھینک دینے کا ارادہ کر رہے ہو ___ غیر سلیمہ ہی کو دے ڈالو۔ اس کی نظر میں اس کی بڑی قیمت ہے۔ وہ اس کی قدر

کرے گی اور اس کا صحیح مصرف لے گی دیتے ہو؟ دیکھو میرا آنچل پھیلا ہوا ہے ___ دو دو خدا کے لئے دے دو اور آج سے اس چیز کو میری امانت سمجھو ___ اور میں اس کے متعلق جو فیصلہ کروں اس میں مداخلت نہ کرو ___ یہ ہے میری معصوم محبت کا معاوضہ اور یہ ہے میرے ان انمول آنسوں کی قیمت جو میں فرض کے مندر میں بیٹھ کر تمہارے لئے بہاتی رہتی ہوں۔ یقین کرو کہ میں تم سے بچھڑ کر زندگی کا ہر کام کر سکتی ہوں صرف جی نہیں سکتی ___ مجھے جینے دو اور اگر وفادار ہو تو گڑھو۔ تڑپو۔ جلو۔ مگر جیتے رہو۔ گو یہ جانتی ہوں کہ عشق کی خلقت میں بیرحمی ہے، وہ کبھی در پر تو خیر خود حسن پر بھی رحم نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے باوجود تمہارے عشق کی عدالت سے انصاف چاہتی ہوں ___ ہاتھ جوڑتی ہوں، ناک رگڑتی ہوں۔ روتی ہوں گڑگڑاتی ہوں۔ کیا یہی انصاف ہے کہ خود پروہوں گی کی طرح صبح تک جلتے رہنے کے لئے اکیلا چھوڑ جاؤ ___ خری اگر موت مجھ سے زیادہ محبوب ہے تو میں ہیں روکتی خدا حافظ جاؤ ___ لیکن جانے سے پہلے اپنی روانگی کی اطلاع تو دیتے جانا تا کہ میں بھی رخت سفر باندھ لوں۔ اگر یہ بھی وعدہ نہیں کر سکتے تو سمجھ لو کہ تم انتہا درجہ کے خود غرض ہو اور دو جہاں کی لعنتیں تمہاری منتظر ہیں۔ خبردار محمود!! اگر ایسا کیا تو یقین جانو کہ تم میری روح کو اس حد تک آزردہ کرو گے کہ فنا کے بعد روح تو روح میرے عناصر وجود کا ایک ذرہ بھی تمہارے ذروں سے ہم آغوش گوارا نہیں کرے گا۔

بہر حال خط ختم کرتی ہوں ___ اور ایک بار پھر تمہیں یقین دلانے کی کوشش کرتی ہوں کہ تم میری زندگی میں ایک تلخ حقیقت کی طرح شامل ہو اور رہو گے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اب تک

تمہاری سلیمہ''

(ندیم، بہار نمبر، ۱۹۴۰)

☆☆☆

پیشکش: ڈاکٹر فرد الحسن

ظ۔ انصاری کے خطوط

بنام ڈاکٹر محمد حسن

بمبئی، ۲۰/ جولائی ۶۵ء

میاں، ہم چار ملک ہو آئے اور متاع دین و دانش لٹا آئے، سمجھے یہ کیوں کر؟ نہیں بتاتے، دبتے ہیں کیا کسی سے! (جرمنی، پولینڈ، روس، مصر) بڑا جی خوش ہوا، اور ڈی ویلیوایشن کی بدولت ایسے پھنسے کہ قاہرہ سے واپسی پر، ''گھر کا راستہ نہ ملا''، آخر ادھار ٹکٹ خریدے اور اب چار ہزار دوسو روپیہ ایرانڈیا کو بھرنا ہے۔ جورؤ خوش ہے کہ یورپ دیکھا، اور خوش ہوتی اگر ہم واپس نہ آتے۔ جورؤ کا یہ ناز بردار خوش ہے کہ ''P'' فارم کے ڈنڈے پر سے چھلانگ لگا کر گھوما پھرا اور پھر اپنے باڑے میں آ گیا۔ اب یونیورسٹی ہے اور ہم ہیں۔ عربی کے مشہور اخبار ''الاخبار'' سے ہفتہ وار ڈسپیچ بھیجنا طے کیا ہے، دیکھیے کب تک چلے۔

جس سلیقے سے آپ خط لکھتے ہیں وہی سلیقہ آپ کی زندگی میں ہے، وہی آپ کا کاروبار الفت میں ہے (میاں، بیوی سے چھپا کر باہر، پرانی خط و کتابت، پیام و سلام قائم رکھنا کوئی آسان کام ہے کیا؟) ادھر یہ حال ہے کہ ناہمواری اور بے ضابطگی سے خانۂ آفتاب و آفتابہ ست۔ کوئی کوئی لفظ خوبصورت اور نہایت پختہ لکھتا ہوں، کوئی سطر سیدھی، کوئی ٹیڑھی، کوئی جملہ بے مثال، کوئی مہمل۔ آپ کا خط آتا ہے تو سرعنوان دیکھ کر بتا سکتا ہوں؛ ''یہ آپ ہوئے'' میرے ایک خط کو دوسرے سے ملا کر دیکھیے دوا لگ کردار ٹپکیں گے۔ ''آئینہ'' کو بھی منجملہ اسی ناہمواری کے سمجھیے، جی جان سے چاہتا ہوں ایسا پرچہ نکلے، ہم بھی لکھیں، وہ بھی لکھیں اور سب پڑھیں، تھک ہار کر بیٹھ رہا، بمبئی سے یہ فی الحال ممکن نہیں۔ صرف دلی سے ہوسکتا ہے۔ یوسف شاہراہ تو خطوں کا جواب تک نہیں دیتے۔ ان سے کیا امید رکھوں، کون کرے، دوبار دلی کی خاک چھان آیا؟ کچھ حاصل نہ ہوا۔ مہنگائی کتنی ہی ہو جائے، دس ہزار خریدار

اس ملک میں بستے ہیں جو ایسے پرچے کی قدر دانی کریں گے۔ غصے اور بے بسی کے مارے میرا جگر پانی ہوا جاتا ہے ___ کیا کروں؟ کچھ سمجھائیے۔

ہرنرائن صاحب سے پہلے فون پر (ارونا ہال، میر مشتاق احمد ڈائرکٹری میں ملیں گے)، بات کیجئے، پھر آگے کا سلسلہ دریافت کیجئے۔ ایک نہ ایک دن دلی آنا ہوگا اور شاید وہیں رہ پڑوں۔ اس لئے بھی خیال ہوتا ہے کہ آپ ایک گھر بنوالیں، اسی پر اپنا بھی آشیانہ ہو جائے گا۔

غالب شناسی، ایک خلاصہ ہے۔ اصل تو ابھی فائل کی صورت میں رکھی ہے۔ دیکھیے کب اس لحاف سے نکلے، کتاب نکلی تو خوب بٹی، خوب بکی، جتنی بکی اس سے لاگت واپس نہ آئی جو بٹ گئی اس کی پوری داد نہ پائی، ذاکر صاحب قبلہ کا خط آیا تھا۔ بڑی تعریف کی تھی، اور خاص کر ۱۶۳ء پر نشان لگایا تھا کہ تصوف کی یہ توجیہ نئی، انوکھی اور فکر انگیز ہے، ہم اتنے میں ہی خوش ہو لیے۔ دیکھنا ذرا ہم ایسوں کے بارے میں عرفی نے اپنے اوپر رکھ کر کیا خوب کہا ہے ؎

سنم آں میوہ ارزندہ بہ بستانِ کمال
کہ بدست و دہن ذائقہ ارزاں رفتم

اگر اس میں ''بستاں کمال'' کا لفظ نہ ہوتا تو اسے ایک تختی پر لکھوا کر گلے میں لٹکا لیتا اور بایوگرافی پوچھنے والوں کو تختی پڑھوا دیتا۔ Recommeded books میں اگر آپ اسے شامل کر لیں گے تو اساتذہ آپ کے شاکی اور طلبا شکر گزار ہوں گے، جو بات اب کہہ رہا ہوں، وہ بہر حال آپ کے تجربے میں آجائے گی، تھوڑے سے صفحوں میں کام کی کئی باتیں آگئی ہیں۔

یو پی کے ایجوکیشن بورڈ اور شکشھا و بھاگ ''لینگویج ڈیولپمنٹ'' والوں کو آٹھ آٹھ کتاب بھیجی تھی۔ الو کے پٹھوں نے رسید تک نہ بھیجی۔ یہ کون کمینے ہیں مصنف (خریداری یا انعام کی امید میں) ۱۶/ کتابیں بھیج کر چپ سادھ لے؟ ذرا مجھے ان کا ٹھیک سے پتہ بھیجئے گا، اگر ہو تو۔

جگن ناتھ آزاد کے ہاتھ آپ کو کتاب گئی ہے اور مئی مہینے میں گئی ہے۔ رسید کا منتظر ہوں۔

اچھا صاحب آپ نے پھر فارسی کا مصرعہ کچھ سے کچھ لکھا ہے۔ کچھ سے کچھ میں بنتا بگڑتا نہیں، لیکن بات یہ ہے کہ جب آپ ہماری زبان، فارسی میں دخل دیتے ہیں تو مصرعہ ناموزوں ہو جاتا ہے، کوئی عدالت نہیں جس میں فریادی جا سکے۔ کوئی فریاد نہیں جس کا رسپونس آپ سے پا سکوں، مصرعہ

یہ ہے ۔ ہر چہ آید بر سر فرزند آدم بگزرد (آپ نے بگوشت کیوں لکھا؟)

اب یہ تیسرا موقع ہے، تیسرا نہیں تو چوتھا یا پانچواں ہوگا، سزا کے بغیر جانے نہ دوں گا۔ سزا یہ کہ ان بد بخت اور بد ذوق ''پانچ صوبوں'' میں (جن کا سفر آپ کر کے آئے ہیں) مہاراشٹر کو چھٹی جگہ دیجئے اور کسی چلے، کسی بہانے ہفتے عشرے کے لئے یہاں ہو جایئے، آپ کو ۳ برس ہو گئے ہیں، ادھر آئے ہوئے، فون پر مجھے مطلع کیجئے گا۔ اسٹیشن یا ایر پورٹ سے اٹھا کر لے آؤں گا۔ خاطر کروں گا۔ اور تو اور اگر سر یا کپڑوں میں جوئیں ہوں گی، وہ بھی بینوں گا، جوتے سیئوں گا، مینڈک کی ٹانگ دم پخت کھلاؤں گا (مجھے یہ غذا پسند ہے) کچھوے کے انڈے ناشتے میں سجاؤں گا۔ اب اور کیا چاہیے [ہائے یہ مقام مولانائے روم نے حضرت موسیٰ کے سلسلے میں کس کیفیت اور حسن کے ساتھ بیان کیا ہے]۔

باقر Aesthetics میں ایم۔ اے کر رہے ہیں، دوسرا سال ہے، کبھی ملاقات ہو جاتی ہے، میں ان سے ناراض ہوں اور ظاہر ہے کہ وہ بھی مجھ سے ناراض ہوں گے اور جوان کے جی میں آئے گا، میرے سر جوڑ دیں گے۔

یہ خط پڑھ لینے کے بعد وہ پرزہ نکال کر بھابھی کو پڑھوا دیجئے ورنہ وہ کہیں گی لو، ایسے نکمے لوگ ہوتے ہیں، مجھے سلام تک نہ لکھا۔ ظ انصاری

☆

بمبئی، ۲۳/ دسمبر ۶۵ء

سرکار! اب آپ کی کتاب کھول کر اول سے آخر تک پڑھی اور جی خوش ہو گیا صل علی! اس کام کی ضرورت تھی ہماری زبان کو۔ اب تک آپ نے جتنے بہت سے کام کیے ہیں ان سب میں، سب سے مربوط قیمتی مدلل اور مفصل مجلد یہی ہے۔ کوئی جملہ اس بھاری بھر کم عطیے کی داد نہیں ہو سکتا، البتہ کوئی اچھا سا مضمون ہو تو ہو۔ ''فکری اور تہذیبی پس منظر'' پر اب تک ہماری زبان میں ایسا وزنی کام نہیں ہوا تھا۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر ایک سنگ میل ثابت ہوگی۔ میرا شکریہ اور مبارک باد قبول کیجئے۔

باقر مہدی ابھی ابھی آئے ہیں، اور ان سے میں نے ذکر کیا، وہ پڑھیں گے تو رائے دیں گے، ان کا سلام قبول ہو۔ ظ انصاری

(خدا کرے یہ سطریں آپ تک پہنچ جائیں، گم نہ ہوں، جو آپ کے شعبے کا دستور ہے)۔

☆

بمبئی، ۷/فروری ۶۷ء

ایھا الدکتور! یہ سطریں پھر بے اختیار لکھ رہا ہوں۔

ہمارے یہاں اردو میں جو کتابیں چھپتی رہتی ہیں، اور ظاہر ہے کہ وہ زیادۂ تر دلی سے نکل رہی ہیں، انہیں ایک بار ورق الٹنے کی احتیاج ہوتی ہے، ان کے ذرائع پہنچ اور رجحان دونوں پر نظر پہنچ جاتی ہے، پھر سوائے کسی تاریخ یا نام کے حوالے کے لئے ہی دوبارہ ان کی تلاش ہو تو اور بات ہے، ورنہ عموماً ضرورت نہیں پڑتی۔

بھائی میرے، آپ کو اندازہ ہے کہ ''.....تہذیبی اور فکری پس منظر'' لکھ کر کیا اعلا درجے کا اور بیش قیمت کام پیش کیا ہے؟ پچھلے سال اول سے آخر تک پڑھ گیا تھا، اور نشان لگا لگا کر محفوظ کر لی تھی، کل پھر کئی بار دیکھنے کے لئے اٹھائی تو اول سے آخر تک پڑھے جا رہا ہوں ___ اور اب کی بار میری دلچسپی اور بھی زیادہ ہے۔ خدا کی قسم میں ساہتیہ اکاڈمی کا اگر ممبر ہوتا تو سب سے جنگ کر کے بھی اس کتاب کو پچھلے سال اور اس سے پچھلے سال اور موجودہ سال کی کتابوں پر افضل قرار دیتا ___ اور دلوا کر رہتا۔

آپ نے اس مفلس زبان کا اگلا پچھلا سارا قرض ادا کر دیا ہے، اس ایک تصنیف کے ذریعے۔ یہ کم و بیش 51 / 01 سال کے مطالعے کا حاصل ہے اور پڑھنے والے کی آتش شوق اور بھڑکتی ہے۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند''

ایک میں مردہ ہوں کہ صرف آرزو کو تدبیروں کا قائم مقام بنائے جاتا ہوں۔

☆

بمبئی، ۲/ دسمبر ۶۷ء

بیرن مورے! کیا حال ہے؟ میم صاحب اور بابا لوگ کیسا ہے؟

ہم تو آپ کی میزبانی کا لطف اٹھا کے، آپ پر دو چار ڈانٹ پڑوا کے، (بیوی کی ڈانٹ کی لذت وہ جانے جس پر پڑتی ہو) دلّی کی بستی سے غائب ہو گئے۔

آپ پھر اپنی کتابوں میں لگ گئے ہوں گے، خدا کی قسم اکسیر کا کشتہ کھائے ہوئے ہیں آپ، زندگی کے اتنے بہت سارے جھمیلوں میں، پھیپھڑوں کی پوری قوت سے ہنس لیتے ہیں اور یہ ذوق برقرار رکھتے ہیں کہ گھر میں غسل کا ٹب یا حوض ہونا بھی ایک نعمت ہے۔ میں Immune (بے حس معذور؟) ہو چکا ہوں۔ رشک سے آپ کو دیکھتا ہوں اور چشم حوض پر آب ہو جاتی ہے۔

بھئی ان نوجوانوں نے ___ محلّہ قبرستان کے ترکمانوں نے ___ ''ادبی تبصرے'' اچھا نکالا! ان کے ایک مداح کو ۲۵ نام اور پتے دے دیے ہیں ایسے لوگوں کے جو چار چار روپے دے کے فوراً سالانہ خریدار بن جائیں گے ___ بات بھی کر لی ہے، لیکن اب تک یہاں ایک پرچہ بھی نہیں آیا۔ وہ ادھر سے ۲۵ پرچوں کا پارسل انجینئر صاحب کے نام کر دیں۔ بندہ ادھر سے ۱۰۰ روپے بھجواتا ہے۔ ایک دوست کے ہاں دیکھا۔ پرچہ اور سنور جائے گا، اور بھی بامعنی ہو جائے گا، اس کی امید ہے۔ اسے چلا لے جانا کوئی بڑا سرمایہ نہیں محض لگن اور محنت چاہتا ہے۔ اور ایسا پرچہ نکالیں کہ کسی کو نہ بخشیں (انہوں نے مجھے نہیں بخشا اس پہلے پرچے میں) ہزار خریدار بن جائیں گے تو خرچ نکلتا چلا آئے گا اور پرچہ جم جائے گا۔

اب میں مستقل طور سے شب خون میں لکھنے پر کمر بستہ ہو رہا ہوں، آپ کی رضا کیا ہے؟

آپ کا ایک تازہ مضمون پیش نظر ہے، پڑھ لوں تو قاعدے سے اظہار خیال کروں۔

کیا آپ کے پاس وہ ہے ڈاکٹر محمد عقیل کی کتاب منظوم مثنویوں پر۔ ہو تو مجھے ہاتھ کے ہاتھ بھیج دیجئے۔ مہینہ بھر بعد واپس کر دوں گا۔ ظ+

(آپ بمبئی آنے کی دھمکی دے رہے تھے یا سچ مچ آنے والے ہیں؟ سچ مچ لکھیے! کب تک وارد ہو گے؟)

☆

بمبئی، ۱۳/ دسمبر ۶۸ء

بیرن مورے! کیسے کیسے یاد آئے ان دنوں!

میں نے پچھلے خط کا جس میں فقیر کے تعاون سے ایک ادبی علمی سہ ماہیہ نکالنے کی خواہش کا ذکر تھا، تاشقند ایئر پورٹ سے جواب دیا، یعنی اس پہلی صبح کو جس کی رات مکمل آرام کے ساتھ بسر کی تھی۔

درشہر کابل:

ایئر پورٹ پر مجھے ۴/ گھنٹے ملے، پہلا کام آپ کو سو فیصدی تعاون کی پیشکش (خط نہ پہنچا ہوگا اس کے ساتھ کے باقی خط بھی نہ پہنچے)، ہر پرچے کو (ہر شمارے کو) ۱۰۰ کی مدد پہنچے گی چاہے وہ میری جیب سے جائے، چاہے اشتہاروں سے آئے، چاہے آسمان سے ٹپکے، چاہے زمین سے اگے، آپ آیئے تو میدان میں، فقیر وہ سب کرے گا جسے تن من دھن سے نسبت ہے۔ کیوں کہ تن بھی میرا ہے، من بھی، دونوں میں سے کسی کا ''ہرّاج'' نہیں کیا۔

(مزے کی بات دیکھو، جب ہمیں ضرورت تھی تو کسی نے بولی نہ لگائی۔ روسیوں نے منھ پھیر لیا، Gol نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ یاران تیز گام نے ایک ایسا ماحول تیار کیا جس میں مجھے اپنی یتیمی یا بے بسی یا بے بضاعتی کا احساس ہونے لگے۔ یقین کیجئے گا سال بھر کی بے روزگاری ۶۴/۱۹۶۳ء کے بعد مجھے سرکار سے ایک پرسش نصیب ہوئی تھی۔ وہ بھی کیسی بے جا!

بلاوا آیا کہ روس سے سرکاری سرکس (Circus) آیا ہے اس میں ترجمان بنو گے؟ میں نے ہاں، نا کچھ نہ کہا، صرف یہ پوچھا کہ میری اس لیاقت کا سراغ کہاں سے ملا؟ معلوم ہوا کہ شاعر اعظم آف بمبئی۔ ۲۶ کے گھر سے (نمبر ۲۶ء کے شاعر اعظم کو آپ میرے کرم فرما کی حیثیت سے پہچانتے ہیں اور سرکار پدم شری کی حیثیت سے)۔

میاں، فقیر نے اپنا تکیہ تھامے رکھا اور نکلا ہی نہیں۔ چرس کہو، یا بھنگ، ایک انجانے نشے میں دن گزار دیے (اس نشے کا ذکر حدیث شریف میں ''الفقر فخری'' کے نام سے آیا ہے۔ یہ پرانے زمانے کا L.S.D تھا، آج کل ذرا نایاب ہو چلا ہے، ہم نے اس کا ذکر مرزا بیدل کے ہاں سنا تھا، جب انہوں نے فرمایا۔

درہائے فردوس وا بود امروز
از بے دماغی گفتم کہ فردا

آپ کو وہ دوپہر یاد ہے جب فقیر آپ کے اکسانے یا التانے پر آقائی خواجہ (آف کیویلری لین) کی درگاہ پر گیا تھا۔ فون کر کے اور ۲۰/ ۲۵/ منٹ باہر سے اندر نہیں جا سکا تھا، کیوں کہ خواجہ اپنی گلی میں ہر ایرے غیرے کو نہیں بلاتا، میں نے خواجہ کو ۴/ خط ماسکو سے لکھے ____ جہاں میں پچھلے چار ماہ میں

دوبار آیا گیا اور ایسی تواضع ہوئی کہ اللہ دے اور بندہ لے، دورِ جام کچھ ایسے چھلک چھلک کے، مٹک مٹک کے آیا کہ مجھے شبہ ہونے لگا ___ یار کہیں ''ساقی نے کچھ.....'' میرے ایک پرزے کا بھی جواب نہ آیا۔ البتہ ہندستانی سفیر کو کئی خط گئے اور ان کے ہی نام وہ مضمون پہنچے جو پہلے دو ایک جگہ چھپ چکے ہیں اور جن میں سے کوئی بھی! خیر کیسے تھے، آپ اہل نظر ہیں، جانتے ہوں گے، شری کول سنگھ نے پیکٹ میرے حوالے کرتے وقت مسکرا کر کہا ___ کیا انھیں شامل کریں گے؟ عرض کیا صرف اس لئے کہ یہ بزرگ کوئی الزام فقیر کی نیت پر نہ لگائیں ___ ایک تو شامل کر ہی لینا چاہیے۔

بہر حال، میرے محترم، ہوا یہ کہ اپنے دیمک خوردہ ورقوں کو پھر سے ٹائپ کرانا، ادھر ادھر کتر بیونت کی اور تھیسس کے طور پر حوالے کر دیا۔ A-I کے درجے میں تھیسس پاس ہوئی اور وہ دم جس کا چپکا لینا یونیورسٹی میں نوکری برقرار رکھنے کے لئے کچھ کارآمد ہوتا ہے، لگالی۔ اس سے کم یا زیادہ کچھ نہیں۔ کام میں نے کیا ہے اور اتنا کیا ہے کہ رخصت کے وقت سفارت خانے سے اور آنے کے بعد یہاں کے وزارت خانے سے دریافت کیا گیا کہ جناب کو منظور ہے اگر (وہی شاعر اعظم والا خطاب) ''دبیر الملک'' کے خطاب کی سفارش کی جائے؟ ___ عرض کیا ___ ''ابھی قبل از وقت ہے۔ اور دو چار سال ٹھیر جایئے، مجھے کچھ پتہ نہیں ___ میں اگلے ۳، ۴ برسوں میں کہیں جیل میں ہوں گا یا آشرم میں؟ دونوں کا امکان برابر ہے۔ یک گام سوئے کعبہ نہم، یک قدم بہ دیر!

میاں اسے دنیا اور عالم اسباب کہتے ہیں ___ لاحول ولاقوۃ!

جشن وشن ہم کچھ نہ منائیں گے، ہاں، کبھی اگر ڈھنگ کا کوئی کام کیا اور خاندان حالؔی کے باوجود حسنِ اتفاق سے ساہتیہ اکادیمی نے نوازا تو پھر منائیں گے جشن ___ یاروں کے ساتھ۔ ٹائمز آف انڈیا نے زور کا مضمون چھاپا ہے، فقیر پر۔ ابھی ایک اور طول طویل انٹرویو چھپے گا ٹائمز میں اور بلٹز میں۔ ملاحظہ کیجئے گا اور بتا دیجئے گا کہ میں نے کہیں تن یا من کا ہرّ اج تو نہیں کیا؟ (حیدرآباد والے نیلام کو جو وہاں اکثر ہوا کرتا ہے، ہرّ اج کہتے ہیں) لطف اس لفظ کا اس کو دولخت پڑھنے میں محسوس ہوگا)۔

پرچہ نکالیے، چاہیے تو ''آئینہ'' کا ڈیکلریشن حاضر ہے، ذرا سینہ زوری کرنا پڑے گی، کام نکل جائے گا، آپ کی کتاب باصواب [تہذیبی پس منظر] پھر ماسکو گئی ہے، صاحب معاملہ نے پڑھ کر، میرے ہوٹل آ کر اتنا کہا کہ اگرچہ اس کی زبان میرے لئے مشکل تھی، تاہم جتنی مدح آپ نے کی تھی،

اس میں مبالغہ نہیں نکلا، میں نے کہا ___ ترجمہ ہو جائے روسی میں، ایک نہ ایک دن وہ ہوگا اور میں ہی اسے ایڈیٹ کروں گا۔

کیا کبھی بھولے بھٹکے آپ نے مرزائے بلیماران کے کسی خاص پہلو پر بزبان فرنگیاں خامہ فرسائی کی ہے؟ ___ اگر کی ہو تو تار برقی نہ سہی، اکسپریس سے مجھے اس کی ایک کاپی بھیج دیجئے۔ میں تار کی زبان میں اسے ماسکو بھیجوں گا۔ اور یہاں سے شایع ہونے والی کتاب میں بھی شامل کروں گا، فوری توجہ شرط ہے۔

میم صاحب اور بابا لوگ کو درجہ بدرجہ سلام، دعا اور پیار پہنچے۔ ظ+

☆

بمبئی ۱۴/ اگست ۶۹ء

جی ہاں سرکار! غالب اکادیمی میں تو عتیق صاحب سکریٹری ہیں، میموریل کی کرسی (جب وہ نئی عمارت میں لگائی جائے گی)، اپنا مالک تلاش کرے گی۔ فخر الدین علی احمد صاحب سے گفتگو بھی ہوئی تھی، موصوف جب ادھر آتے ہیں، فقیر کو نوازتے ہیں۔

یونیورسٹی کے پیسوں میں (اب کوئی ۹۰۰ سے اوپر ملتے ہیں)، اور میموریل کی تنخواہ میں جو فرق ہے، اس سے آپ واقف ہوں گے۔ اول غذا زود ہضم، دوسری ثقیل پھر دلی کا سا افواہ بار شہر ___ جہاں لوگوں کو کیڑے نکالنے کی فرصت بہت۔ میں تو موصوف کے آفر پر خاموش رہا۔ معاملہ رقم کا ہرگز نہیں اختیار کا ہے۔

کسی بدبخت سے بات کیجئے کہ دو کتابیں چھاپ دے:

o غالب پر مجموعہ مضامین ___ تقریباً ۲۰۰ صفحات

o مثنوی کا فن اور غالب کی مثنویاں ___ ۲۵۰

(o تیسری یہی، جس کے ابواب دل صد پارہ کی طرح تقسیم ہو رہے ہیں، یہ طالب علموں کے لئے ہے، محمد حسن صاحبان کے لئے نہیں ہے)۔

بس اچھا اور بے اغلاط چھپے ___ اور کچھ التزام نہیں۔

آج کل شب و روز تاریخ پڑھتا ہوں۔ گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، کرنٹ بک ہاؤس

کے ''فرزانہ مہیش داس'' سے کتاب اور یاران طریقت کے پرمٹ سے شراب آجاتی ہے، مولانا ظ۔ انصاری رحمۃ اللہ علیہ خوش ہیں، کمزور ہوگئے ہیں ذرا ___ (اس میں قدرت کی مصلحت ہوگی تاکہ پھر نئی شادی نہ رچالیں)، ماضی کے ٹیلے پر چڑھ کر حال کے سیاسی واقعات کا درو مستقبل کچھ کچھ نظر آنے لگا ہے۔

میاں، جسم سے لہو جاتا ہے، قطرہ قطرہ کر کے۔ اب ایک سال ہوگیا، پینے سے پہلے رغبت نہ تھی، اب ممانعت بھی ہوگئی، چلیے ہمیں کون آشوب آگہی'' تھا جو غم کریں۔

یہ رسہ کشی جو ملک میں تیزی سے شروع ہوئی ہے، غور کیجئے کہ وہ کیا کہتے ہیں، بمبئی دلی کا حریف اور رجعت پرستوں کا گڑھ بنتا جا رہا ہے، گجرات برابر میں لگا ہوا ہے، ہمارے ایک پنجابی دوست کی نظم تھی: ع بڑا کچھ ہونے والا ہے، بڑا کچھ ہونے والا ہے! وہ آج کل زبان پر رہتی ہے۔ اور دل اس ''بڑا کچھ'' کا منتظر۔ اگر ''کچھ'' ہونے لگا۔ میں نوکری چھوڑ کر کود جاؤں گا، خدا کی قسم۔

باقر نے دو سال تیاری کی، دونوں بار ایم اے (Aesthetics) کا امتحان نہ دیا، ظاہر ہے کہ اب وہ اس کی Futility پر بتکارتے پھرتے ہوں گے، کہیں مل جاتے ہیں تو سڑک پر آواز دے کر خلوص کا نعرہ لگا دیتے ہیں۔ ڈاڑھی، کہ پہلے سینے کا داغ تھی، آج کل جن سنگھی تراش کی علامت بن گئی ہے: ''دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا''۔ (ظا)

☆

بمبئی، ۱۷/ جولائی ۶۹ء

اے تغافل شعار! میں کوئی بار بار گھر نہیں بدلتا کہ آپ میرے گھر کا اڈریس بھول جائیں، یہ کیا قیامت ہے کہ دوسطری پرزہ تک نہیں آیا، ۶/ مہینے سے۔ بھائی اگر میں نے اپنے مقالے (غالب سیمینار، دہلی) سے مایوس کیا ہو تو یہ ایسا جرم نہیں جسے درگزر نہ کیا جا سکے۔

شب خون میں اس جشن پر میرا تبصراتی مضمون چھپا ہے، آہنگ میں بہت پرانا لکھا ہوا مضمون (غالب پر) آیا ہے۔ گفتگو میں ''جگر صاحب'' مجھے خود بھی پسند آیا اور ہاں اور ان سب سے سوا، (زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا)۔ پوشکن کی نظم و نثر کے ترجمے نظم و نثر میں (نثر میں ''حکم کی بیگم'') میرا کام ہے، نہایت نفیس، ماسکو سے چھپ کر آ گیا ہے، کوئی ڈیڑھ سو (150) صفحے کا کام ہے، کیا ان کے طفیل

میں بھی آپ مجھے گوشہ چشم سے نہیں نوازنے والے؟

بھائی ''مسلمان کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا''۔

آپ نے حضرت وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنا مضمون مجھے روسی زبان میں اشاعت کے لئے دے دیں گے۔نہیں دیا۔نہیں بھیجا۔اب وہ کتاب بھی چھپ گئی۔صرف ۳ روپے قیمت ہے،خدارا بازار سے منگا کر دیکھیے۔ ظا

☆

بمبئی،۲۸/ جولائی ۶۹ء

لیجئے صاحب! ''نسبتیں ہوگئیں تشخص.....'' مداح،عقیدت مند، فیضیاب اور ہم نوا! یہ دلّی ایسا نامعقول شہر ہے کہ توبہ،نئی دہلی میں رہو تو ماڈل ٹاؤن پہنچنا مسئلہ، وہاں ٹھہرو تو سرکار دربار کے سلام،ممبری اور خلعت سے محروم۔

ماسکو سے میرا مستقل بلاوا ہے،شاید اگلے سال چلا ہی جاؤں،دو برس کے لئے۔پھر بلاؤں گا،اپنے پاس ٹھہراؤں گا،عزت آبرو سے سیر کراؤں گا۔

دیکھیے ڈرامے دونوں پڑھوں گا،اور مقالے کا ذکر اپنے ایک مقالے میں کر چکا ہوں، جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ہو جائے گا مفصل ہے۔

وہ جو آہنگ میں چھپا ہے،صبا میں چھپے گا،کتاب میں شائع ہوگا،اردو ادب ۶۱ء میں چھپ چکا اور شاعر کے غالب نمبر میں نکلا۔یہ سب مختلف باب ہیں فقیر کی اس بد بخت کتاب کے،جس سے ''پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا''،ترتیب وار دیکھتے تو داد دیتے۔یوں دل صد پارہ کی قاشوں سے کیا داد پاؤں گا،کیا وہ کتاب گوشۂ چشم حاصل کر کے زیور انطباع سے آراستہ ہو سکتی ہے؟؟ ظا

(''تحریر'' سے کہئے کہ وہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں سے میرا مقالہ لے کر شامل کر لیں)

☆

بمبئی،۲۸/ستمبر ۶۹ء

بھائی،ایک خط ملا ہے! باتیں بہت سی کرنی ہیں لیکن بستر پر ہوں، بیمار ہا،کمزور ہو گیا کافی۔

آپ یہ غیر رسمی سر جوڑ (Get Together) اکتوبر کی سولہ اور ۲۴ کے درمیان رکھیے تو

فقیر موت کی رسی میں لوٹا لٹکا کر ہوا میں معلق ہوکر موڈل ٹاؤن پر اتر پڑے۔ دو چار دن ٹھیر کے جن قہقہوں کو ترس گیا ہے، ان کی دولت بیدار آپ سے مل کر بانٹے، ذہن پر صیقل کرے اور رسالے و سالے کا معاملہ طے کر کے وہاں سے نکلے۔

کوشش کروں تو اس شہر سے 40/50 ایسے خریدار جو پچیس روپے دے کر آپ کو اور مجھے بھول جائیں بٹورے جا سکتے ہیں۔

فقیر میں دم نہیں کہ کرسی پر بیٹھ کر خط لکھ سکے۔ درد کی شدت نے لٹا رکھا ہے، مگر اس درد کی ایسی تیسی کرنے میں دس بارہ دن لگ جائیں گے۔

جمشید پور میں جام پر جام انڈیلے تھے، پھر کٹورے بھر بھر کے بدن کا لہو گیا۔ اب افاقہ ہے۔ یونیورسٹی جاتا ہوں، تنخواہ بڑھ گئی ہے۔ یعنی لکھٹیا ہاتھ لے کر بزار میں کھڑے ہونے تک کا فاصلہ دو قدم اور بڑھ گیا۔ احمد آباد کے بعد میرے جی میں ادب نہیں کچھ اور ہے۔ ملوں گا تو بات ہوگی۔

گر کوئی دن زندگانی اور ہے! وغیرہ وغیرہ! ''ہے رام''

فوراً مطلع کیجئے تا کہ پروگرام فیصل کر سکوں، ۲۵/ ۲۶/ کو ممبئی آگرہ روڈ کے ایک صنعتی مقام دھولیہ میں پبلک کے بے حد اصرار اور کمپنی کی مشہوری کی خاطر جلسے رکھے گئے ہیں جنہیں لوٹنا مد نظر ہے۔

بمشکل یہ سطریں پڑے پڑے لکھی ہیں، کل علی جواد زیدی صاحب ملنے آئے تھے، آج دلی پہنچے ہوں گے۔

بیگم صاحب سے کہئے گا کہ ہم اتنے بگڑے ہوئے نہیں ہیں کہ وہ آپ پر رکھ کر، دوسرے کے گھر میں، ہمیں ڈانٹ پلائیں، اب ایسی خطا نہیں ہوگی۔ والسلام، ظا

☆

موسکو، ۲۳/ جولائی ۷۰ء

خط وہ بھیجے رقیب کا لکھا
یہ بھی اپنے نصیب کا لکھا

صاحب! میں نے یہاں نازل ہونے سے پہلے اور نازل ہوتے ہی پے در پے دو خط سرکار

کو لکھے، پتہ جتنا زبانی یاد تھا یعنی 7, Model Town اتنا ہی لکھا، ایک کا جواب نہ آیا۔ سوچا صاحب شاید مراقبے میں ہے۔ اٹھے گا تو جواب دے گا۔

میں نے پوچھا تھا کہ ایک عجب کیفیت طاری ہے جسے آپ الہامی کہیں گے، شعر اتر رہے ہیں خیالات کا ریلا ہے، سفرنامے کی صورت میں لکھوں؟ ''چھاپیں گے؟

جواب نہ آیا تو سوچا یا تو پروپوزل پسند نہ آیا یا پھر پتہ غلط لکھا گیا۔ یا پھر کثرت کار مانع آئی۔ یا پھر وہی مراقبہ کی کیفیت رفتہ رفتہ اتر گئی : جیسے دریا اتر جاتے ہیں یہ خط اترن کا حصہ ہے۔

اچانک ایک روز فیض انصاری کے نام کا خط بمبئی سے میرے لفافے میں آ پہنچا۔ جس میں پرسش احوال بھی شامل تھی۔ اب یونیورسٹی کے معروف پتے پر زحمت دے رہا ہوں تا کہ ''رہے خطرہ نہ چوری کا.....''۔

حضرت میں یہاں دو برس کے لیے آیا ہوں۔ کام کئی ہیں: امیر خسرو، ان کا تاریخی زمانہ، اس زمانے کی معاشرت، معیشت، کلچر، ہندستان کی اردو فارسی شاعری از عہد خسرو تا ۱۹۴۷ء وغیرہ وغیرہ۔

شروع ہو گیا ہوں۔ دیکھیے شاید کچھ نکلے۔

مجھے (۱) مولوی اسماعیل میرٹھی کی مرتبہ قران السعدین، (۲) پروفیسر حبیب کی مرتبہ خزائن الفتوح (تھیکرس اینڈ کو) اور (۳) فضل احمد حافظ کا مرتبہ دیوان وسط الحیوٰۃ نہایت سخت درکار ہے۔ آپ کی یونیورسٹی لائبریری ورنہ نذیریہ لائبریری میں تو ضرور ہوں گی، یہ کتابیں ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک چھپ گئی تھیں۔ پہلی اور تیسری علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے، دوسری تھیکرس کے یہاں کلکتہ سے۔ کیا آپ یہ خطرہ مول لے سکتے ہیں کہ دو تین مہینے کے لئے مجھے، اپنے نام پر نکلوا کر عاریۃً دے دیں۔ باقی کتابیں میں لے آیا ہوں۔ یہاں تک کیوں کر پہنچیں اس کا اہتمام میں خود کر لوں گا۔ آپ صرف ''ہاں'' کر دیجئے۔

اپنی یونیورسٹی سے چھٹی لے لی ہے، ۷۲ء میں واپس ہو جاؤں گا۔

میم صاحب کو وعلیکم السلام۔ خیریت سے ہیں؟ ظا

☆

موسکو، ۹/ستمبر ۷۰ء

کیوں صاحب! بزدل جان کر ہمیں ڈراتے ہو کہ تمہارے خط چھاپ دیے جائیں گے؟

بھلا آپ تک وہ خط پہنچے کب، جن کے چھپنے کے اندیشے سے میں ڈر جاؤں؟ وہ خط تو ڈاک میں ڈالے ہی نہیں گئے ہیں۔ دیوار کے کان تک بھی نہیں پہنچے، اور صبح سویرے کی مصلحت اندیش روشنی انہیں کاغذ کا زینہ اترنے سے پہلے کھا گئی ''شب ہائے ہجر'' کے ان خطوں کو ''بھی رکھوں گر حساب میں'' تب واقعی ڈر جاؤں اور خوشامد کر کے، بہلا پھسلا کے آپ کو راضی کر لوں، جو لکھا گیا، وہ تو سمجھیے کاغذ قلم کی سنسر سے گزارا گیا اور اس کے منظر عام پر آنے سے نہیں گھبراتا یہ گناہگار۔

پھر آپ اور مجھ ''نبرد پیشہ'' کو دھمکائیں، ڈرائیں! ارے برادر،

کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں؟

☆

موسکو، ۱۰/ جولائی ۷۲ء

ہے رام، کیا کروں! کیسے ہوا کے دوش پر ادھر سے ادھر اڑا لاؤں آپ کو؟ بے انتہا یاد آ رہے ہیں آپ!

اور یہ ۲۷/ جون والا خط مجھ سے وہ سب کچھ کہہ دے رہا ہے جو آپ یوں سیدھے سبھاؤ نہ کہتے۔

یہاں سے وارسا گیا تھا، اشتراکی ملکوں کے مستشرقین کی کانفرنس تھی، وہاں مجھے مقالہ پڑھنا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اچھی خاصی تیاری کے ساتھ شریک ہوا مگر سارا کھیل مصنوعی نظر آیا۔ کچھ اور ناگواری کا سبب پیدا ہو گیا اور میں سامان اٹھا کر ہوٹل سے چل دیا ''نالت'' بھیجی۔ یوں بھی مغرب کا ایک چکر کاٹنا تھا، لائبریریاں دیکھنی تھیں (دیکھنا ہی دیکھنا رہ گیا ہے، برتنے کی سب چیزوں سے وہی ''میرا حصہ دور کا جلوہ'' برتاؤ) تو صاحب یوں دونوں برلنوں میں گھومے۔ ان شہروں کا ۵۷ء سے اب تک تیسرا چکر تھا۔ ''اولی الابصار'' کو عبرت حاصل کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے، اور وہ اپنا شاعر کہہ گیا ہے کہ :

اگر بدل نہ خلد ہر چہ از نظر گذرد
زہے روانی عمرے کہ در سفر گذرد

میں تو دونوں مرحلوں سے گذر چکا۔ کچھ اور ہی عالم ہو جاتا ہے میرا۔ لاکھ چاہوں کہ اسے لکھ ڈالوں، ایک تو وہ لفظ کہاں سے لاؤں جو بعینہ ذہنی کیفیت اور بکھری ہوئی سوچ کو کاغذ پر اتار لائیں، اور لکھوں تو کون ہے جس کے لئے لکھوں۔ آپ دو چار معتنم روزگار ہیں جن کی خاطر لکھنے کو بھی جی چاہے، سنانے کو بھی۔ سو اتنی مختصر ملاقات ہوتی ہے، میرا تو دل بھر آتا ہے، بہت ساری باتیں سوچ سوچ کر۔ ممکن ہے یہ دیوانگی کا اول یا ثانوی درجہ نہ ہو۔

☆

موسکو، ۱۰/ جولائی ۷۲ء

پھر وہاں سے ہسپتال پہنچ گیا (آج ہی ۹۰۰ مارک، یعنی ۱۸۰۰ روپے کا بل بذریعہ ڈاک آیا ہے) پھر وہاں سے فرار کر گیا۔ بروسلز، پیرس، لندن، آکسفورڈ وغیرہ کے کتب خانے چھان کر (یعنی اپنے متعلق موضوع کے مخطوطات جھانک کر) جون کے آخر میں یہاں آ پہنچا اور آ کر جو بستر پر گرا ہوں تو پتہ چلا کہ پوشکن کے منظوم ترجموں پر جو دیباچہ لکھنا تھا اس کی بھی قوت نہیں۔ بس، رہ گیا سب۔

صاحب مجھے عصری ادب کی جتنی پیاس ہے، اتنا ہی وہ مجھ سے گریزاں رہتا ہے، خدارا کوئی معقول سبیل کیجئے اور مجھے سب جلدیں یکجا کر کے بھجوا دیجئے، ستمبر کے آخر تک ۷۰/۶۰ صفحے کا ایک اہم مقالہ لکھا جانا ہے (بزبان روسی) اردو کا عصری ادب از ۱۹۶۰ء تا ۱۹۷۰ء اور اس کے اہم رجحانات

مگر بھیجنے کا انتظام بڑا پکّا ہو۔

یونسکو کی طرف سے ستمبر میں ایک کانفرنس وسط ایشیا کی تاریخ و تہذیب پر عشق آباد میں (کہ نہایت غیر عاشقانہ اور غیر شاعرانہ شہر ہے، برعکس نہند نام زنگی کا فورم ہونے والی ہے، نئی عمارتوں، شاندار ہوٹلوں، شاداب باغوں اور تیکھے نقشے، چھریرے بدن کی دراز قد (شاہِ شمشاد قداں'' مارکہ) لڑکیوں کی وہاں کمی نہیں، مگر ذہن مفلس، دین مفلس، باورچی خانے مفلس، شہر کے اطراف مفلس اور کتب خانے مفلس۔ میں نے نکلنے سے دو ڈھائی مہینے پہلے آپ کے نام درج کرا دئے تھے کہ بحث وغیرہ کے بعد داخل فہرست ہو جائیں۔ نہیں معلوم بعد میں کیا گزری۔ یہاں بھی وہ جنہیں دوست کہیے گنے چنے ہی ہیں، مگر نادرۂ روزگار۔ رہے خدائی خوار، سو ان سے نہیں بٹتی۔

اب آپ منہ چھپوا کر پھنس گئے ہیں۔ پوشکن تو عصری نہیں ہے۔ اگر میں جان لگا کر مضمون یا

تعارف سا لکھ کر اس کی ایک دو طویل نظمیں (جنہیں بیلے یا اوپیرا کا روپ دیا جا چکا ہے) بھیج دوں اور آپ کا ذوق اور دل دونوں گواہی دیں کہ ہاں واقعی کیا خوب کام کیا ہے، تو چھاپیں گے کیسے؟ عصری جو نہیں ہے! اچھا ذرا ہاں تو کیجئے بھیجتا ہوں، اور دیکھتا ہوں آپ کی ہمت اڈیٹرانہ! میاں ''ہم تو نوکر ہی اس بات کے ہیں'' (ملاحظہ ہو جوش کی یادوں کی برات، اولین صفحات، سپاہی کی واردات) شہباز حسین صاحب کا خط آیا، بورڈ کی طرف سے چیخوف پر ۱۰۰/ صفحے کی کتاب لکھنے کو کہتے ہیں، نثر میں دستویسکی پر اور نظم میں پوشکن پر میں نے سچ مچ خصوصی محنت کی ہے۔ اگر زور لگا کر چیخوف پر، جس کی عظمت میرؔ کی عظمت کی طرح بیان سے باہر اور کھلا راز ہے، لکھوں بھی تو ۱۰۰ صفحے میں! ننگی کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی۔

نومبر ۷۲ء کی ۱۲ کو بالکل ہی ''لاد چلے گا بنجارہ'' دیکھنا کہیں اس سے پہلے ہی ہسپتال کے آپریشن روم میں ''سب ٹھاٹھ پڑا'' نہ رہ جائے۔ والسلام، ظا

☆

موسکو، ۲۵/ اکتوبر ۷۲ء

اوپر کی تاریخ اور کاغذ کی ''تازگی'' دونوں گواہ ہیں کہ میں نے یہ خط بھیجنے کے ارادے سے لکھنا شروع کیا ہوگا۔ کل رات شمس الدین احمد صاحب سری نگر روانہ ہو گئے، کل رات نہیں آج صبح جہاز گیا، ان کے ہاتھ کچھ نذرانہ بھیجنا چاہتا تھا، مگر ان کے سوٹ کیس (کیسوں) میں جڑواں بچے بھرے تھے۔ مجبوری۔

D7, Model Town کے پتے پر فقیر نے کئی مہینے پہلے (گرمیوں میں) یہ عرض کیا تھا کہ اگر چھاپیے تو پوشکن کی طویل نظم مع تعارف وغیرہ کے بھیجوں۔ ۲۰ ویں صدی کے شعراء کے بھی منظوم ترجمے کئے ہیں ان پر بھی جدا جدا مضمون لکھے جا سکتے ہیں۔ خط تو پہنچا ہوگا کیوں کہ ان دنوں آپ دہلی پہنچنے والے تھے، جواب نہ آیا۔ دیکھیے آپ اس دھمکی سے مرعوب ہو گئے، سوچا ہوگا کہ اول تو یہ آدمی بھلا شعر کو شعر میں کھپانا کیا جانے، اس کے لئے خود اچھا شعر ہونا لازم۔ دوسرے یہ کہ کہیں سچ مچ نظم طویل اور بحر طویل نکلی تو بقول شتر ستان والوں کے: کُلّ طویل احمقٌ، ہر ایک طویل احمق ہوتا ہے (انہوں نے یہاں یہ استثنا بڑھا رکھا ہے، اِلاّ عمر (لیکن عمر نہیں) غرض کہ چپ سادھ

گئے۔ایسے موقعوں کے لئے کہا ہے:

''دیکھا جو مجھ کو، چھوڑ دیئے مسکرا کے ہاتھ''۔

نہیں بھیجوں گا، نہیں بھیجوں گا، توبہ میری، اب آپ بمبئی کے پتے پر فقیر کو یاد تو کیجئے۔

والسلام، ظا

☆

بمبئی، ۲/ دسمبر ۷۲ء

سرکار! گھر ٹھیک کر رہا ہوں۔ سب تباہ ہو گیا۔ بجلی، پانی، ٹیلیفون سب کٹ، اب یہ سارے علائق پھر جوڑے جا رہے ہیں، اس وقت تک کے لئے جب ان سے پھر بیزاری بڑھ جائے گی ''آشیاں'' اور ''تنکے'' والی نسبت غالب نے صحیح معنوں میں استعمال کی تھی: مثال یہ مری.....قفس میں فراہم کے لئے۔

موسکو سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ عصری ادب کے سارے پرچے بھیجوں یا بھجواؤں گا، وہاں کوئی پرچہ آپ کا بھیجا ہوا نہیں پہنچا۔ کتاب کے داخل خارج ہونے میں وہاں بڑی دشواریاں ہوتی ہیں۔

کیوں جی، اگر آپ، محمود ایاز، عابد سہیل اور یہ فقیر ملک ایک ہی نام کے پرچے پر (خواہ عصری ادب ہو) اتنی محنت، صلاحیت اور سہولت وقف کر دیں (مسلک کے اختلاف کے مطابق پرچے میں بھی رنگا رنگی رہے) تو کیا؟ اپنی ایجنسیوں، قدردانوں اور طلب گاروں کو بھی جوڑ لیں، طباعت و اشاعت کا انتظام بھی بہتر ہو جائے گا۔ فرادہ کے بجائے باجماعت ہو جائے گی نماز۔ قلب کو اختلاج سے اور مریضوں کو علاج سے کسی قدر نجات ملے گی تو لکھنے لکھانے کا بھی لطف رہے گا۔

اگر ایسی کسی تجویز پر محض اصولاً آپ راضی ہوں تو ۴۰۰، ۳۰۰ روپے مہینے کے خسارے کو ہم دوستوں کی مدد سے پورا کر لیں گے، کوئی اور ہامی نہ بھرے تو فقیر اپنی زنبیل یا کشکول سے کچھ نکالے گا، فرمایئے، اصولاً یہ بات آپ کو گوارا ہے؟؟

جو ہو تو سلسلہ داروں کی میں زنجیر ہلاؤں! منتظر جواب۔ ظ انصاری

☆

بمبئی،۱۹/اگست ۷۸ء

یا شیخ!

کون کہتا ہے: نہ غیروں پہ تم امداد کرو
ہم فراموش ہوؤں کو بھی کبھی یاد کرو (میر)

جمشید پور گیا تھا۔ کلکتے والے سمی نار کی رودار سنی۔ اداس ہوا : آشنا اپنا بھی واں اک سبزۂ بیگانہ تھا۔ ظا، بمبئی

اردو، نمائش (جو لکھنؤ میں کی تھی) بمبئی لائیں گے آپ؟ کب لا سکتے ہیں؟

☆

بمبئی،۱۲/ جولائی ۷۳ء

کیوں صاحب، صدر صاحب آل انڈیا.....وغیرہ۔

''اب تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے؟''

اورنگ آباد تک آ کر نکل گئے چپکے سے، ریل کی پٹری بمبئی تک آتی ہے۔ آپ نہ آئے، انتظار رہا۔

میری سنیے!

o جاں نثار اختر پر جو مضمون لکھا ۳۳ صفحے کا ہو گیا، نظموں غزلوں کے حوالے الگ ساتھ ساتھ مل کر چھپے تو عصری ادب کے ۵۰ صفحے پر جائے، ہمت ہو تو ہاں کیجئے لیکن چھپے بھی فوراً ہی اور اغلاط کے بغیر۔

o چیخوف پر تین باب لکھ دیے۔ چوتھا ہو جائے تو کتاب بنے، ایسی سوانح عمریاں کہاں لکھی جاتی ہیں کہ جسم کے ساتھ ذہن کا سفر بھی مرحلہ بہ مرحلہ نظر آئے اور پڑھنے والا بھی ساتھ سفر کرے۔

وہ کام کیا ہم نے جو رستم سے نہ ہوگا!

اور جو کام مرحوم رستم کیا کرتے تھے، وہ ہم سے ہوتا نہیں (یعنی سہراب کے لئے مومیا لانا)

o فقیر کی کتاب پوشکن علیہ الرحمہ پر آ گئی، ساسکو سے، ایک اعلا درجے کے تبصرے کی طلب ہے، فرمایئے!

o اس کے بعد پوشکن پر چار باب لکھ کر نظموں کے حوالے کے ساتھ چھپوانا چاہتا ہوں کون چھاپے گا؟ یعنی کون ہے مائی کا لال جو میری مرضی کا چھاپ دے اور اپنی عاقبت میری دنیا سدھار دے؟؟

o جدید رومی شعراء کی جو میں نے ریڑھ ماری ہے (لفظ ریڑھ زور دے کر پڑھیے) وہ بھی عبرت ناک ہے۔ ان پر مضمون لکھوں، حوالے دے کے لکھوں، ۴۰، ۵۰ صفحات بنیں گے، کوئی محل استعمال؟ ظا

میم صاحب کو پیار، بابا لوگ کو سلام (ارے نہیں لف ونشر غیر مرتب ہو گیا)

ہم سمجھے تھے خط پوسٹ ہو گیا۔ آج محمد مہدی کے نام خط لکھنے کو جو پیڈ نکالا تو یہ کاغذ وہیں چپکا ہوا ہے۔ لا حول ولا۔

☆

ظ انصاری۔ ۲۳، شیریں، کولابا پوسٹ آفس، بمبئی۔ ۳۰

۱۵/ جولائی ۸۲ء

اے ادیب العصر حاذِق فی النثر نباض زمن ڈاکٹر محمد حسن مدظلہ العالی الموالی، طال اللہ عمرہ، و ''عمر گھر والی''

اس فقیر دل گیر کا سلام پہنچے اور اس روشن ضمیر پر مخفی نہ رہے کہ:

چھ سات مہینے کرب وتنہائی کے گزارنے کے بعد کل رات سے، جب گھنگھور گھٹاؤں نے دردِ ہجر کچھ دھویا، بدن بھگویا، آپ کی یاد نے ستایا، ایک بہانہ ہاتھ آیا کہ حکیم حاذق کنور اسرار حسن خاں (مسٹر ایم ایس پوری) کے تعلق سے جو خمیرہ مروارید آپ نے تجویز فرمایا ''عصری ادب'' میں مع تصویر وانتخاب کلام سجایا، اس کی داد دی جائے۔ الحق اس موصوف پر یہ پہلا تجزیاتی مضمون ہے کہ لائق ذکر ہے، اس کی وسعتِ نظر قابلِ فکر ہے۔ خود حکیم صاحب اسے اپنے نسخوں میں تجویز فرمانے لگے ہیں، اس کے کلمات حکمت دہرانے لگے ہیں، ''کتاب نما'' میں بھی اس کا خلاصہ نظر سے گزرا، خلاصہ کیا تھا، جو شاندہ کا پھوک تھا کہ تاثیر برائے نام رہی اور اصل بات رہ گئی ان کہی۔

غزل کی بلوری بوتل میں میں ہر چند کہ جذبی، فیض اور مجروح نے علی الترتیب عصری حسیت

کا عرق کیوڑہ اور لعوق (س) پستاں یکجان کر کے رکھ دیا ہے، تاہم ۵۴-۱۹۵۳ء تک کی پڑیوں میں حکیم صاحب کے یہاں جو بے تکلفی اور از دل خیزد، بر دل ریزد، والی کیفیت ٹپکتی تھی، وہ بعد کے دس پندرہ اشعار چھوڑ کر [اوسط حاصل یک قطرہ (ایک مصرعہ) فی سال] پھر نہیں ملتی۔ مریض مطب سے جو شے لے جاتا ہے اس میں دوا کم اور پر چہ ترکیب استعمال زیادہ پاتا ہے، تاہم اس فن خاص میں اولیت جذبی اور مجروح کو پہنچتی ہے اور مقبولیت بیشتر فیض کو، باقی عند الملاقات عرض کیا جائے گا۔

ایک جلد کتاب شناسی کی بھی نبض دکھانے والے مریضوں کے مونڈھے پر بیٹھی ہوگی۔ اس کا حال احوال بھی پوچھ لیجئے۔ قارورے کی شیشی اس کے ہمراہ ہے۔ ہلا کر دیکھ لیجئے خون میں حدت پایئے۔ صفراوی یا سوداوی خلط میں شدت پایئے تو اس کی طرف سے سرد مہر نہ ہو جایئے اور اس فقیر کو مانیے، نہ مانیے مگر زندہ جانیے۔ گاہ بہ گاہ اعضائے رئیسہ (اعضائے خبیثہ از کار رفتہ ہوئے) کے لئے کوئی مقوی نسخہ، جو آپ کے خط شکست نے پکڑا ہے اور جسد خاکی کو مہلک تنہائی نے جکڑا ہے۔

فقیر بعد تراویح اور قبل از سحر [ی] آپ کے حق میں دعائے خیر کرے گا کہ پاک پروردگار، شاعروں کے گمراہوں کے اتباع سے باز رکھنے والا شاعر اعظم آپ کو نثری شاعری کے مرض سے محفوظ رکھے اور آپ کے کل کو آج سے زیادہ قوی اور مفرح بنائے رہے۔

وما علینا الا الدعاء ولا دواء

فقط، آپ کا مریض قدیم نیم حکیم، ظ انصاری

☆☆☆

پروفیسر محمد انوار الحق تبسمؔ

پورنیہ کی تاریخ و ثقافت صدیوں کے آئینے میں

پورنیہ کی سرزمین اپنی زرین تاریخ اور اعلیٰ ثقافتی سرگرمیوں کے لئے عہد قدیم سے ہی مشہور رہی ہے۔ موجودہ دور کے مورخوں اور عالموں نے بھلے ہی اس کی تہذیبی اور ثقافتی دین کو قابل اعتنانہ سمجھا ہو لیکن اسوڑھ گڑھ، بڑی جان گڑھ، بینو گڑھ، ننھا کنھا کا گڑھ، کسم گڑھ، دھرہرا کے کھنڈر جو سیتلی گڑھ کے نام سے مشہور ہے، رانی کرنتی کے گڑھوں کے کھنڈر، بھیم پہاڑ کے باقیات، بلی گڑھ، کرسیلا، ٹھاکر گنج، کرن دیگھی، راج بنیلی، موہنی ٹیکاپور، راجا سہیل گھاٹ، امور، کھگڑا، پورنیہ سیٹی، چمنی بازار، گڑھ بنیلی، جلال گڑھ، منیہاری، سیف گنج اور بلدیہ باڑی جیسے تاریخی مقامات کے باقیات کو دیکھنے سے پورنیہ کی قدامت اور تاریخی و تہذیبی عظمت اور خصوصیات کی تصدیق ہوتی ہے۔ کچھ ایسی یادگاریں بھی ہیں جن کے تحریری ثبوت نہیں ہیں۔ ان میں تخت بھنگڑوا اور کھترا باڑی کے کھنڈر وغیرہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ 1826ء کا ناگہانی سیلاب انہیں بہالے گیا۔ لیکن مقامی لوگوں کی زبان پر آج بھی یہ بات ہے کہ تخت بھنگڑوا راجا وراٹ کی راجدھانی میں تھی اور کھترا باڑی راجا کرن کی راجدھانی تھی۔ (1)

پورنیہ کی تاریخ و تہذیب کی مفصل جانکاری کے لئے مآخذ کی کمی تو ہے پھر بھی مہا بھارت، ہری ونش، منوا سمرتی، چینی سیاح ہوین سانگ کا سفر نامہ اور عہد وسطیٰ کی مشہور فارسی تاریخوں، طبقات ناصری، تاریخ فیروز شاہی، تاریخ فرشتہ، اکبر نامہ، آئینِ اکبری اور مآثر جہانگیری میں اِس کے تذکرے ملتے ہیں۔ 18ویں صدی کی قابل قدر فارسی تاریخی کتابوں سلیم اللہ کی تاریخ بنگالہ، یوسف علی کی احوال مہابت جنگی، کرم علی کا مظفر نامہ، غلام حسین طباطبائی کی سیر المتاخرین اور غلام حسین سلیم کی ریاض السلاطین میں اس خطے میں رونما ہونے والے واقعات کا آنکھوں دیکھا حال پڑھنے کو ملتا ہے۔ کیتھی رسم الخط میں 1729ء میں شیخ کفایت اللہ کی تخلیق کردہ مشہور پریم

کتھاودیادھر میں پورنیہ کی تاریخ و ثقافت کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ انگریزی زبان میں فرانسس بوکانن کی کتاب این اکاؤنٹ آف پورنیہ ان 1809-10ء، بائرن کی فائنل رپورٹ ''آن دی پورنیہ سروے اینڈ سیٹلمنٹ آپریشن اِن پورنیہ 1901-1908ء''، اومالے کا بنگال ڈسٹرکٹ گزیٹیئر پورنیہ، پی سی رائے چودھری کی پورنیہ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر، بنگلہ زبان میں بابو بھوانن سنگھ کی پورنیہ ایتو بریتو اور اردو زبان میں مولانا یوسف رشیدی کی احسن التواریخ (تاریخ پورنیہ) اور اکمل یزدانی کی پورنیہ پر فوجداروں کی حکومت اور ہفتہ وار انسان کشن گنج کا پورنیہ نمبر اس خطے کی تاریخ و ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر قیمتی معلومات فراہم کرتی ہیں۔ مشہور ماہر لسانیات گریرسن اور جان بیمز نے اس خطے کی زبان اور ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے یہاں کی آبادی کا تذکرہ کیا ہے۔ راج بنیلی کے راجا کرتیانند سنگھ کی کتاب پورنیہ-اے شکار لینڈ مطبوعہ 1914 اور شکار اِن ہلس اینڈ جنگلس (مطبوعہ 1934) میں پورنیہ کے جنگلوں اور جنگلی جانوروں کے متعلق قیمتی معلومات ملتی ہیں۔

راقم الحروف نے ودیادھر کی خصوصیات، پورنیہ اور کٹیہار میں شیخ برادریوں پر تاریخی نوٹس، پورنیہ کی تاریخ و ثقافت اور تاریخ نویسی کے مختلف پہلوؤں پر متعدد مقالے سپرد قلم کیے ہیں۔ اول الذکر پروفیسر سید حسن عسکری اور قیام الدین احمد کی ''کمپری ہینسیو ہسٹری آف بہار'' میں بطور ضمیمہ شامل ہے۔ بقیہ مقالے بہار ریسرچ سوسائٹی جرنل، پرگیاں بھارتی، خدابخش خاں لائبریری جرنل کے متعدد شماروں اور انڈین ہسٹری کانگریس اور بہار اتیہاس پریشد کی پروسیڈنگس کے مختلف شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس مختصر مقالے کی تیاری میں مندرجہ بالا کتابوں کے علاوہ کے پی جیسوال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر وجے کمار چودھری کی اطلاع کے مطابق متھلا اور ترہت علاقوں کے ایک مشہور لوک گیت میں پورنیہ کا نام آیا ہے وہ اس طرح ہے:

علیا گے، جھلیا گے، گورا برد کھیت کھائے چھو گے-کتوگے، دیہہ پرگے، رکھوا کے-
بابارے، بابا گیلو پورنیہ گے، لل لل بچھیا آنتو گے۔ (2)

پورنیہ کے عہد قدیم اور عہد وسطیٰ میں موجودہ بنگلہ دیش، مغربی بنگال، نیپال کی ترائی اور ضلع مونگیر کے بھی کچھ حصے شامل رہے ہیں۔ میجر رینیل نے 1779ء میں تیار کئے گئے نقشے میں اس کا رقبہ 6264 برطانوی مربع میل اور بوکانن نے 10-1809ء میں اس میں 76 مربع

میل کی کمی بتا کر اس کا رقبہ 6340 مربع میل لکھا ہے۔ 1911ء میں اومالے نے اس کا رقبہ 4994 مربع میل لکھا ہے۔[3] 1956ء میں 750 مربع میل کا علاقہ مغربی بنگال میں ملا دیا گیا اور اب یہ کٹنے چھٹنے اور بٹنے کے بعد صرف پورنیہ، کٹیہار، ارریہ اور کشن گنج ضلعوں پر مشتمل ایک کمشنری کی حیثیت سے موجود ہے۔

بہار کے شمال مشرقی سرحد پر واقع پورنیہ کمشنری کا مشرقی حصہ، جو کشن گنج، ارریہ پورنیہ اور کٹیہار ضلعوں پر مشتمل ہے، کوسی حلقے کا اہم حصہ اور کوسی اور اسکی معاون ندیوں میں آنے والے تباہ کن سیلابوں اور ان کی سرکش لہروں کا ہمیشہ شکار رہا ہے۔ کوسی ندی کی تباہ کن خاصیتوں کے باعث ہی عہد وسطیٰ کے فارسی مورخوں نے اسے ''دریائے الم'' اور عہد جدید کے جغرافیہ دانوں نے شمالی بہار کے ابھیشاپ (عذاب) کا نام دیا ہے۔ کوسی کے علاوہ یہاں بہنے والی ندیوں میں کجری (سونڑا) پنار، بکرا، کنکئی، پروان، کٹھیا، مہانندہ، کراتو، ڈونگ، بھیسنا اور ہیچھا موتی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ابتدا میں اس خطے کو مچھ دیش، کرات دیش اور وراٹ دیش بھی کہا گیا ہے۔

پورنیہ کی وجہ تسمیہ کے متعلق جانکاروں نے مختلف خیال کا اظہار کیا ہے۔ یوسف رشیدی کے خیال میں بنگال کے راجا پورن نے اس مقام کا نام اپنے نام پر پورنیہ رکھا اور اسے اپنا دارالسلطنت بنایا۔ ریاض السلاطین کے مطابق پورنیہ پہلے پرگنہ حویلی کے نام سے مشہور تھا۔[4] پورنیہ ایتو بریتو کے بنگلہ مؤلف بابو بھوانن سنگھ کے خیال میں بنگال کے راجا لکشمن رائے سین نے اپنے عہد حکومت میں اسے آباد کیا تھا۔[5] لیکن تاریخ دانوں کی اکثریت یہاں کے گھنے جنگلوں کے باعث اسکی اصل سنسکرت لفظ پورن (+) ارنیہ بتاتے ہیں۔

کچھ عالموں نے اس کی اصل ایک مقامی خودرو پودا ''پورین'' یا کنول (Lotus) کو تسلیم کیا ہے جو آس پاس کے ندی نالوں میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ چینی سیاح یوآن-چوانگ نے بھی یہاں مختلف قسم کے پھولوں کی کثرت کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر سید محمود پورنیہ کو لالہ و گل کی سرزمین کہا کرتے تھے۔[6] میرے خیال میں پورنیہ کا اصل پورن (+) ارنیہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

کچھ مورخوں نے اس علاقے کو ستیہ یُگ سے آباد بتایا ہے۔ اس زمانے میں پورنیہ راجہ ہرن کنش کے زیر حکومت تھا۔ اس کے قلعوں کے باقیات اب تک موجود ہیں۔ ہندو روایات کے

مطابق ستیہ یُگ میں نرسنگھ اوتار پورنیہ میں ہی نازل ہوئے تھے۔ جس مینار میں وہ ظاہر ہوئے وہ مانک تھام یا پرہلاد استمبھ کے نام سے مشہور ہے۔اس خطے کے قدیم باشندے کول، بھیل، کیرات، پول اور جین وغیرہ تھے۔ان کے بعد آریوں کے دو خاندانوں انگ اور پنڈاری نے یہاں سکونت اختیار کی۔ مشرقی حصے یعنی مہانندا سے مشرق میں پنڈاری اور مغربی حصے میں انگ قبیلے کے لوگ آباد ہوئے جس کی مغربی سرحد کوسی ندی تھی۔پنڈاریوں کی شمالی سرحد پر کیرات قبیلے کے لوگ آباد تھے۔اسی قبیلے میں راجہ بھرت کی ایک رانی کرنتی نام کی تھی، جس نے پانڈؤں کے ''بن واس'' کے زمانے میں ٹھاکر گنج میں واقع اپنے قلعے میں انہیں پناہ دی تھی۔اس قلعے کے باقیات اب تک موجود ہیں۔اومالے کے مطابق انگ قبیلے کے لوگ چھ، سات سو سال قبل مسیح سے یہاں اقامت پذیر تھے۔مہابھارت کے مطابق پانڈؤں نے اپنے ''بن واس'' کیلئے ویدویاس سے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے ویراٹھ راجیہ، جو موجودہ کشن گنج ضلع کے شمال-مغربی حصے اور نیپال کے ترائی پر مشتمل تھا، جانے کی صلاح دیتے ہوئے کہا''سب سے دھنی، سب سے سکھی اور سب سے اچھی آب وہوا والا راجیہ راجا ویراٹھ کا ہے جہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں، اناج کا انبار لگا رہتا ہے، بہترین سوتی کپڑے تیار ہوتے ہیں اور جنگلوں کی ہریالی میں ہرنیں چوکریاں بھرتی ہیں، وہیں جا کر رہیں۔''(7)

بھیم نے وراٹھ راج پہنچنے کے بعد بن واس کے دوران راجا وراٹ کے سالا کیچک کو محض اس لئے مار ڈالا کہ اس نے دروپدی کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی تھی بعد میں بھیم نے اس سارے خطے کو فتح کر ڈالا۔اس کی یادگاروں میں دو بلند ٹیلے اب بھی اس کی یادگار ہیں اور بھیم وہار کے نام سے مشہور ہیں۔اس نے راجا کرن کو بھی شکست دی تھی۔(8)

519 قبل مسیح میں مگدھ کے راجا بمبسار نے انگ قبیلے کے راجا کو شکست دے کر پورنیہ پر قابض ہو گیا۔ پھر یہ علاقہ گپت راجاؤں کے زیر نگین آگیا اس کے بعد یہ راجا بالادتیہ کے ماتحت رہا۔ چینی سیاح یوآن-چوانگ جو 640ء میں گنگا ندی پار کر کے یہاں پہونچا تھا، کے سفر نامے سے پتہ چلتا ہے کہ مہاتما گوتم بدھ یہاں تین مہینوں تک رہ کر اپنے دھرم کا پرچار کرتے رہے ۔اس سفر نامے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بودھ راجاؤں نے یہاں حکومت کی تھی۔اسنے تین ہزار بودھوں اور 20 بودھ مٹھوں کی یہاں موجودگی کا تذکرہ کیا ہے 647ء تک یہاں ان کی حکومت

قائم رہی۔ یوآن-چوانگ نے اس خطے کا نام پُن-نا-فا-ٹن-نا یعنی پُن-نا-ود-دھنا لکھا ہے۔ کچھ عالموں نے اسے پوندھر ورد ھناپڑھا ہے جس کی شناخت فرگوسن نے موجودہ رنگ پور سے کی ہے۔ جو اس زمانے میں پورنیہ کا مشرقی علاقہ تھا۔ اس نے اس خطے میں بھری پوری آبادی، تالابوں، سرایوں اور باغیچوں کا ذکر کیا ہے۔

اس نے یہاں کی فصلوں، پھولوں اور پھلوں کی کثرت خاص طور سے کٹھل کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یہاں کی آب وہوا کو خوشگوار، زمین کو نشیبی اور نم، عوام کو علم دوست بتایا ہے۔[9] اس خطے پر پال اور سین خاندانوں کے راجاؤں کا بھی تسلط رہا۔ بابو بھوانن سنگھ کے مطابق آخری سین راجا لکشمن سین یا رائے لکھمنیا نے اپنے عہد حکومت میں پورنیہ شہر کو آباد کیا تھا۔ اس کی یادگاروں میں ایک تو بیر بان ہے جسے اس نے پہاڑی قوموں سے حفاظت کے لئے بھاگل پور تک بنایا تھا۔ دوسرا لکشمن ہار کے نام سے ایک تالاب ہے جو کلیا گنج تھانے میں واقع رام گنج کے مضافات میں اب تک موجود ہے۔[10]

مسلمانوں نے دلی سلطنت کے قیام سے پہلے ہی اس خطے پر قبضہ کر لیا تھا۔ بختیار خلجی نے 1200ء میں لکشمن سین کو شکست دے کر اپنا تسلط جما لیا اور نادیا کی بجائے لکھنوتی یا گوڑ کو یہاں کی دارالحکومت بنایا۔ یہی پوربی سلطنت ہے جسے بنگالہ بھی کہا گیا ہے، فرشتہ کے مطابق سونار گاؤں، لکھنوتی، بہار، جاج نگر اور اس کے سرحدی خطے کو مشرقی سلطنت کہتے تھے۔ یہی وہ بنگالہ ہے جسکے حکمراں غیاث الدین (1394-1410ء) نے ایران کے مشہور شاعر حافظ شیرازی کو بنگال آنے کی دعوت دی تھی۔ حافظ سندھ ندی کی طغیانی اور دریا عبور کرنے کی صعوبت دیکھ کر واپس لوٹ گیا اور سلطان کی خدمت میں ایک غزل بھیج دی جس کے ایک شعر نے ہندوستان میں دھوم مچا دی ہے۔

شکر شکن شوند، ہمہ طوطیان ہند　　زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

اس غزل کے مقطع نے سلطان کو زندہ جاوید بنا دیا۔

حافظ ز شوق مجلسِ سلطان غیاث دیں　　خامش مشو کہ کارِ تو از نالہ می رود[11]

1200ء سے 1770ء تک پورنیہ دلی کے سلاطین ، مغل بادشاہوں ،بنگال کے خود مختار سلطانوں اور مغلیہ صوبیداروں کے ماتحت رہا۔بنگال کے خود مختار حکمرانوں نے اپنے عہد حکومت میں بنگال میں امن و شانتی اور نظم و نسق کو کافی چست و درست رکھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوریوں کو ختم کرنے میں مثبت کردار ادا کیااور ہندوؤں کے تئیں غیر جانب دارانہ حکمت عملی اپنائی اور انہیں بڑے بڑے عہدوں پر بحال کیا۔ان حکمرانوں کے عہد میں بنگال ایک خوشحال اور طاقتور سلطنت تھی اور اس عہد میں علمی اور ثقافتی شعبے میں قابل ذکر ترقی ہوئی۔انہیں کی حوصلہ افزائیوں کی وجہ سے بنگلہ ایک ادبی زبان بنی۔ رامائن ،مہابھارت اور متعدد سنسکرت کتابوں کا ترجمہ ہوا۔[12]

بنگال میں مسلم صوفی سنتوں ، پیروں فقیروں کی موجودگی اور ان کی سادہ زندگی نے معاشرتی تبدیلی کا راستہ ہموار کیا۔اسلام نے غریبوں اور نچلے طبقوں کے عوام کی زندگی کو کافی متاثر کیا۔اسلام کی کامیابی کی وجہ اس کی مساوات،اخوت اور روحانی فکر میں پوشیدہ تھی۔یہ شہروں سے زیادہ دیہاتوں اور اونچی ذاتوں سے زیادہ نچلے طبقوں میں پھیلا۔پورنیہ کا علاقہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہا لیکن یاد رہے کہ جن ہندوؤں نے اسلام قبول کیا ان میں زیادہ تر اپنے قدیم رسم و رواج اور دیوی دیوتاؤں کی پرستش سے خود کو الگ نہیں کر سکے۔جب چیتنیہ (1483-1533ء) نے اپنی بھکتی تحریک شروع کی۔تو مسلم حکمرانوں، مسلم صوفیوں اور مسلم معاشرے کے لوگوں نے ان کی کافی مدد کی۔ان کی یہ تحریک اتنی زوردار تھی کہ آگے چل کر تبدیلی مذہب نہ صرف رک گئی بلکہ بہت سے لوگ اس کے اثر سے ہندو دھرم میں واپس آگئے۔ بنگال کے حکمراں علاؤالدین شاہ (1493-1518ء) کی ستیہ پیر تحریک پورنیہ ضلع کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان یکساں طور پر مقبول تھی۔ پورنیہ کے ہندو اور مسلمان بنگال کے صوفیوں میں خاص طور سے شیخ جلال الدین تبریزی پنڈوہ کے شیخ علاؤالحق اور نور قطب عالم اور دیناج پور پورنیہ کے شیخ حسین دھکڑ پوش سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ وہاں کے مزاروں کی زیارت کرنے اکثر جایا کرتے تھے۔ہنٹر کے مطابق ، ان لوگوں کے لئے جن میں غریب ، مچھیرے ، شکاری، چور،ڈاکو اور کسان تھے۔ اسلام ایک ایسا بابرکت عطیہ تھا جو آسمان سے نازل ہوا تھا۔[13]

بنگال کے حکمراں محمود شاہ 1533-1538ء کے عہد میں 1536-1537ء کا ایک مزار پورنیہ سیٹی کے کوئلہ محلہ کی ایک مسجد میں ملا ہے۔ جس کا ذکر پروفیسر قیام الدین احمد نے اپنے کورپس میں کیا ہے۔(14)

اس عہد میں کئی فیصلہ کن جنگیں لڑی گئیں جن میں ہمایوں اور شیر شاہ، سراج الدولہ اور پورنیہ کے فوجدار شوکت جنگ کے درمیان کی جنگیں بھی شامل ہیں۔ان جنگوں نے ہندوستان کی قسمت کا بھی فیصلہ کیا۔پورنیہ کے مضافات کا ایک شہر خواص پور ٹانڈا جو مالدہ سے دکھن پچھم جانب واقع تھا،ایک لمبے عرصے تک یعنی کرارانیوں سے مرشد قلی خاں کے ابتدائی عہد تک بنگال کا صدر مقام رہا۔مرشد قلی خاں (1704-1725ء) نے یہاں سے اپنا دارالحکومت مخصوص آباد منتقل کر لیا اور اس کا نام اپنے نام پر مرشد آباد رکھا۔یوسف خورشیدی کے مطابق خواص پور ٹانڈہ اب موجود نہیں ہے کیونکہ اسے 1826ء میں کوسی میں آئے ایک طوفانی اور تباہ کن سیلاب نے اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔

لیکن اس خطے کو فوجداروں کے عہد حکومت میں بڑی خوشحالی ملی جو بنگال کے صوبہ داروں کے ماتحت تو ہوا کرتے تھے، لیکن دلی کی مرکزی سرکار سے بھی ان کا براہ راست تعلق ہوتا تھا۔پورنیہ میں بحیثیت فوجدار، استوال خاں کی تقرری سے پہلے ہمارے پاس فوجداروں کی تقرریوں کے متعلق کسی قسم کی جانکاری یا فہرست موجود نہیں ہے۔اومالے نے پورنیہ گزیٹیئر میں استوال خاں سے محمد علی خاں تک 17 فوجداروں کی فہرست دی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان فوجداروں کی تقرریاں 17 ویں صدی کے نصف آخر یعنی اورنگ زیب (1658-1707) کے عہد حکومت میں ہوئیں۔لیکن یوسف رشیدی کے مطابق 10 ویں صدی ہجری کے آخر میں نواب استوال خاں پورنیہ کا فوجدار تھا۔وہ سرحدی افواج کا سپہ سالار اور مالی صیغہ کا عامل تھا۔اس کے بعد نواب عبداللہ خاں انہیں خطابات اور اختیارات کے ساتھ فوجدار مقرر ہوا۔ ایک ہزار ہجری (1593 عیسوی) میں نواب اسفند یار خاں پورنیہ کا فوجدار مقرر ہوا۔اس طرح یہ تقرریاں عہد اکبری (1556-1605ء) میں ہوئیں۔اسفند یار خاں جہانگیر کے عہد حکومت (1605-1628ء) تک پورنیہ کا فوجدار تھا۔اسی کی مدد اور حکم سے کھگڑا کے راجا سید جلال نے بھوٹانیوں اور

نیپالیوں کے حملوں سے رعایا کی حفاظت کے لئے جلال گڑھ کا قلعہ تقریباً (1020 ہجری یا 1624 عیسوی) میں بنوایا تھا۔ یوسف رشیدی کے مطابق وہ بارہ سال تک اپنے عہدے پر قائم رہا۔ اس کے بعد بہمن یار خاں فوجدار ہوا جو 1100 ہجری کی ابتداء میں قضا کر گیا۔ لیکن بابو بھوانن سنگھ نے جلال گڑھ کے قلعہ کو جلال الدین خلجی کی یادگار بتایا ہے اور لکھا ہے کہ محمد بن تغلق کی جو فوج چین اور تبت کی مہمات پر بھیجی گئی تھی اس نے کچھ دنوں تک جلال گڑھ کے قلعہ میں رک کر آرام کیا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ اسفند یار خاں نے 24-1623ء میں جہانگیر کے حکم سے مرمت کروائی ہو۔ پورنیہ کے فوجداروں کی مکمل فہرست دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے ان کی تقرریوں کی تاریخی ترتیب میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان فوجداروں میں اسفند یار خاں، سیف خاں، صولت جنگ، شوکت جنگ، حاضر علی خاں، میر قاسم اور محمد علی خاں وغیرہ کافی مشہور فوجدار رہے ہیں۔ سیف خاں اور صولت جنگ ایسے فوجدار ہوئے ہیں جنہوں نے فتوحات اور انتظامی امور کی درستی کے ساتھ فن وثقافت اور علم وادب کی سرپرستی اور ترقی میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

پورنیہ کے فوجداروں میں معین الدین سیف خاں کا عہد حکومت، پہلی بار بہ عہد اورنگ زیب 1705 عیسوی سے غالباً بہ عہد بہادر شاہ اول 1709 عیسوی تک، دوسری بار بہ عہد محمد شاہ 1722-1750 عیسوی تک) فتوحات، اقتصادی اصلاحات، خوشحالی امن و قانون کی بحالی اور ثقافتی سرگرمیوں کیلئے بے حد اہم تسلیم کیا جاتا ہے۔ پورنیہ کی منفرد حیثیت اور جدید تاریخ اسی کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ سیف خاں کابل کے صوبہ دار امیر خاں کا فرزند تھا اور بعض مورخین کے مطابق اس کا پوتا تھا۔ مغل حکمرانوں سے وہ قریبی رشتوں میں بندھا تھا۔ سیف خاں شجاعت ودلیری، تجربہ ودوراندیشی اور رعب ودبدبہ کیلئے شہرت رکھتا تھا۔

شاہجہاں کے لڑکوں کی جانشینی کی جنگ میں وہ اورنگ زیب کا کٹر حامی تھا اور شجاع کے خلاف الہ آباد اور بنگال کے مختلف حصوں میں جس دلیری وشجاعت سے اس نے جنگ کی تھی اس کے دشمن بھی اس کے مداح ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر قیام الدین احمد کی تحقیقات کے مطابق بنگال اور بہار میں اس کی موجودگی 17 ویں صدی کے آخری دہائی ہی سے تھی۔

پورنیہ کا خطہ اس زمانے میں نیپالیوں ، چکواروں اور بیر نگر کے راجا درجن سنگھ کی شورشوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ان باغیوں کی سرکوبی کیلئے بنگال کے صوبہ دار مرشد قلی خاں (1704-25) کی گذارش پر اورنگزیب نے سیف خاں کو پورنیہ کا فوجدار بنا کر بھیجا اور اسے دھرمپور اور گوندوانہ کی جاگیریں عطا کیں۔ لیکن ان کے اخراجات کیلئے ان علاقوں کی آمدنی کم پڑتی تھی چنانچہ اس نے اورنگزیب سے اس کی شکایت کی۔ ریاض السلاطین کے مطابق اورنگزیب نے مرشد قلی خاں کو لکھا کہ ''میں نے تمہیں شیر کو پنجرے میں بند کر کے دیا ہے اگر اسے پوری خوراک نہ دوگے تو وہ تمہیں نقصان پہونچائے گا''۔ بادشاہ کی تنبیہ پر مرشد قلی خاں نے تمام بقایہ جات معاف کر کے اسے اس خطے کا مختار کل بنا دیا۔[15] سیف خاں نے اپنے اختیارات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کر بیر نگر کے راجا کو شکست دے کر قدیم کوسی کے مغربی کنارے تک پورنیہ میں شامل کر لیا۔ باغیوں کو سزائیں دیں اور نیپالیوں کو پہاڑ تک کھدیڑ دیا۔ اس نے جنگلوں کو صاف کرایا اور اس علاقے کو آباد کرنے کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا اس سلسلے میں کتیاری گاؤں یا موجودہ کٹیہار جنکشن سے ، جس کا نام اس نے سیف گنج رکھا تا جوگبنی (جنگ بندی) تک کے علاقے کو آباد کیا، زرعی اصلاحات کو اس نے ترجیح دی اور زراعت کی زبردست سرپرستی کی ۔ یہاں کی آمدنی جو پہلے دس گیارہ لاکھ تھی، سیر المتاخرین کے مطابق اٹھارہ لاکھ تک پہونچ گئی اور عوام امن و چین اور سکھ شانتی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ سیف خان نے کوسی کے مغربی کنارے تک فتح حاصل کر یہاں کے انتظامی امور کو چست و درست کیا۔ یہاں اس نے فصلی کلینڈر اور کوسی کے مشرقی علاقے میں بنگلہ کلینڈر نافذ کیا جو آج تک جاری ہے[16]۔ سیف خان کی یادگاروں میں پورنیہ سیٹی میں اس کی تعمیر کردہ ایک چھوٹی سی خوبصورت مسجد اب تک موجود ہے۔ اسی میں اس کا مقبرہ بھی ہے۔ جس کا کتبہ پروفیسر سید حسن عسکری کے مشورے سے بہار آرکائیوز میں جمع ہے۔ کچھ دنوں تک ویران رہنے کے بعد اب وہاں پنج گانہ اور جمعہ کی نمازیں پابندی سے ادا کی جاتی ہیں۔ سیف گنج یا موجودہ کٹیہار کو بھی اسی نے بسایا تھا۔ سیف خاں نے ادب و ثقافت کی بھی سرپرستی کی۔ اس کے عہد میں ایک مقامی صوفی شاعر شیخ کفایت اللہ نے ملک محمد جائسی کی طرز پر ایک پریم کتھا ودیادھر کی تخلیق بنگلہ 1136 مطابق 1729ء میں کیتھی رسم الخط اور مقامی کلاہیا زبان میں کی۔ اس پریم

کتھا میں اس عہد کے پورنیہ کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کی نہایت خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ بہار کی لسانی ترقی کی تاریخ میں بھی ودیادھر کی بڑی اہمیت ہے۔ پریم کتھا کی صنف میں بہار میں یہ اکلوتی تخلیق ہے۔

اس پریم کتھا میں آئے دن کے مسائل اور ان کا حل، امراض اور ان کے علاج، علم نجوم اور جنسیات اور سلوک کی تعلیم غرضکہ سب کچھ ہے۔ ایک آدمی پیدائش سے موت تک جن حالات کا سامنا کرتا ہے ان کا تذکرہ اس میں اصل کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے موجود ہے مگر کہیں یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ قاری کہانی سے الگ کچھ پڑھ رہا ہے۔ ودیادھر شعر و شاعری کا ایک عمدہ شاہکار ہے۔ یہ پریم کتھا کیتھی رسم الخط کے ساتھ ساتھ بنگلہ رسم الخط میں بھی لکھی گئی تھی اس پریم کتھا کا بنگلہ شاعروں بالخصوص رویندر ناتھ ٹیگور پر کافی اثر ہے۔ انیسویں صدی کی کیتھی رسم الخط میں تحریر کردہ ایک مخطوطے کا نسخہ ''ایوب پبلک لائبریری حیدر نگر، پورنیہ میں موجود ہے۔

ودیادھر کے کچھ اشعار پیش ہیں:

شاعر کا گاؤں اور ولدیت:

پورنیہ سے پورب نیر ایک گاؤں - پرگنہ حویلی دَمکاناؤں
دَمکا شیخ محمد ٹھاؤں - تاکر سُوت کفایت ناؤں

تاریخ تصنیف اور تاریخ پیدائش:

برکھ پچیس جب آئی - تادناویدھی کچھ کیہنوں پائی
1136 جب آئی - تاہی دنا کتھا من لائی

شاعر کے پیر و مرشد:

محمد اعظم پیر ہمارا — پستک پڑھا جا سنسارا
تاسو نرگن سرگن پایا — پنتھ ودھاتا بہت بتایا
ناظر پور پچھم سے آئے — تاسو پر سادر شیہ ویدھی پائے

شاعری کے محرک:

نواب سیف خان کے ٹھاؤں — شیخ محمد سمّیع ناؤں
گن او گیان کہا نہیں جائی — پنڈت بڑا بھاری ہو بھائی

کہا شیخ، سنو پریتم مورا　　بات ایک کہی ہم تورا
ودیا بہت پڑھا من جانی　　کتھا کہو جو رہے نسانی

عصری تاریخ:

جمبو دویپ بڑ دیپ بکھانا　　محمد شاہ دلی سلطانا
پچھم دلی و پورب بنگالہ　　دیوان شجاع خاں بنگالہ
تیہی کے نیر پنڈ وادیشو　　قطب نور تہاں کرے نریشو
تا کر اتر پچھم کونا　　بسے پورنیہ شہر سلونا
سو پورنیہ کا بہت بڑائی　　سستا اَنّ سب دیوس بیکائی
سوری او کلوار پتریا　　تینوں گنگا پار اتریا

نواب سیف خاں کی بڑائی میں کا کہوں اپار
اَمل بڑا بھوجک ما، کھیلے سدا شکار
عدل نیائے کہا نہیں جائی، شاہ سکندر دوسرا آئی
دان دیا کر اونچا بھئی۔ بھوکا نگر رہے نہیں کوئی
تیہی میں جو کوئی پاپی آوے　　تا کے حاکم گدھا چڑھاوے

کتاب کا موضوع:

کتھا سورس ودیا سنگ آوا　　ہیچھا سپورن سبھی کہاوا
مورکھ سنے گیان گتی پاوے　　پنڈت کے پنڈتائی بڑھاوے
مسلمان مسئلہ کے بوجھے　　ہندو کے مارگ ویدھی سوجھے
ورِدھ سنے چت گیان بڑھاوے　　ترون کے سکھ کام جگاوے

کہانی کے مرکزی کردار و مقام:

چندر بھان راجا کرَ ناؤں، ودیا دھر برنار
گیت سنا گائن مکھ، پوتھی کیا وچار
کچنا پور، کنورَ کرَ ٹھاؤں۔ کنیا راجیہ اودے گری ناؤں

سہاگ رات میں ودیا دھر کے جذبات:

سیج سنوری، دھانی جھورے　　بہت ہوا من شنکا
ترونا سوامی، ہم ابلہ　　تھر تھر کانپے انگہ

کچھ مُلسے، کچھ ڈرے من ماہی　　پُروکھ ہیو ہم جانے ناہی
جب سو کنتھ آلنگن مانگے　　کاہم کَرَب بہت ڈرلاگے

تصوف کا رنگ:

تھوڑا تھوڑا سیکھو گیانا　　بہت کرو مت بھیتر گیانا
اَلاہول متی ہو ہو من ماہی　　ای خالہ، ماما کا گھر ناہی

مقامی رنگ:

بارہ ماس بارہ پھل کھائی　　کچھو روگ سونر نہیں آئی
کارتک ماس کانجی کرو بھوجن　　اگہن ماس چوڑا دودھ
پوس پوشٹئی، ماگھ مورائی　　پھاگن ماس ادگور کھائی
چیت ہے نیم، بیساکھے بیلا　　سگرو جیٹھ پنتا بھات ٹھیلا
اساڑھ ماس کریلا کھائی　　ساون ماس ناری سنگ جائی
بھادوں کھائی، رائی ہو بیرا　　آسین ماس بالم کھیرا

سندری پوکھر:

چلت چلت راجا تاہاں　　سندری نام سرو ور جہاں
سندری پوکھر سندر رانی　　نرمل جل جس گنگا پانی

عورتوں کی قسمیں:

پورکھ ترنگا جو کہلاوے　　سنگھنی سنگ مہا سکھ پاوے
چترنی ناری بہت چتورائی　　روپ سروپ کہا نہیں جائی

پند و نصیحت:

جھگڑا دن کرے جو کوئی　　الپ دوس میں دولت جائی
دتون کرو ہو تو کچھ کھاہو　　اپنی پاچھے دونوں ہاتھ دھواہو
کرے پیشاب کھولی کے سیسا　　لچھمی ناہی دیہی جگ دیشا(17)

نواب سیف خاں کے بعد پورنیہ کے مشہور ترین فوجداروں میں نواب سعید احمد خاں صولت جنگ (1751-56ء) کا شمار ہوتا ہے۔ وہ بنگال کے صوبیدار نواب علی وردی خاں (1740-56ء) کا بھتیجا اور داماد تھا۔ اس نے بھی نظم و نسق میں بہتری لانے کے ساتھ ساتھ

علم و ثقافت کی بھی بڑی سرپرستی کی۔ اس کا دربار مدبرین، علما، فضلا، شعرا اور صلحاء سے بھرا رہتا تھا۔ جن میں ملا غلام یحییٰ بہاری، مفتی ضیاء اللہ، میر توحید، مولوی لعل محمد، شیخ ہدایت اللہ، سید عبدالہادی، نقی علی خاں، امیر علی یار خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ مشہور مورخ سید غلام حسین طبا طبائی سات سالوں تک اس کے دربار سے وابستہ رہا۔ وہ سری پور اور کشن گنج پرگنوں کا زمیندار اور ولی عہد شوکت جنگ کا اتالیق تھا۔ غلام حسین نے سیر المتاخرین کی تالیف یہیں شروع کی تھی جو 1782ء میں مکمل ہوئی۔ یہ کتاب اٹھارہویں صدی ہندوستان کی مستند اور اہم ترین تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔

1756ء میں صولت جنگ کے انتقال کے بعد شوکت جنگ فوجدار ہوا۔ اپنے نانا علی وردی خاں کے انتقال کے بعد وہ بنگال کی صوبیداری پر اپنے استحقاق اور پورنیہ کی فوجداری سے ہٹائے جانے پر اپنے خالہ زاد بھائی سراج الدولہ سے الجھ پڑا۔ یہ جنگ بلدیہ باڑی کے نام سے مشہور ہے۔ جس میں سراج الدولہ کو فتح ہوئی اور شوکت جنگ مارا گیا۔

اس کے بعد موہن لعل حاضر علی خاں اور خادم حسین خاں بھی کچھ دنوں تک فوجدار رہے۔ میر جعفر کے عہد صوبیداری میں میر قاسم بھی 1760ء میں فوجدار ہوا بعد میں وہ انگریزوں کی مدد سے بنگال کا صوبیدار بن گیا۔ جلد ہی انگریزوں کی بیجا مداخلت اور استحصال سے تنگ آکر مرشد آباد سے دارالحکومت مونگیر منتقل کر لیا اور بکسر کی لڑائی (1764ء) میں اپنے ہمنواؤں مغل بادشاہ شاہ عالم اور اودھ کے نواب شجاع الدولہ کے ساتھ شکست کھا گیا۔ پورنیہ کا آخری فوجدار آغا محمد علی خاں تھا جس نے 1770ء میں پورنیہ کی حکومت انگریزوں کے سپرد کر دیا۔(18)

بقول پروفیسر رامیشور پرساد 14 روری 1770ء میں پورنیہ پر برطانوی تسلط قائم ہونے کے ساتھ ایک انگریز افسر، مسٹر جارج گستاؤس ڈوکریل (George Gustaus Ducarrel) نے وہاں کے سپروائزر کا عہد سنبھالا۔ بعد میں اسے ترقی دے کر کلکٹر بنا دیا گیا۔

انگریزی حکومت کے قیام کے فوراً بعد اس خطے کو ایک بھیانک قحط کا سامنا کرنا پڑا، جس میں تقریباً ایک تہائی آبادی، بعض مورخوں کے مطابق آدھی آبادی، لقمہ اجل بن گئی۔ کچھ ہی دنوں

کے بعد رہی سہی کسر ہیضہ اور چیچک کی وبائی امراض نے پوری کر دی۔ عوام کو سنبھلنے میں کئی سال لگ گئے۔ انگریزی دور حکومت میں عوام بالخصوص کاشتکاروں کا بہت استحصال ہوا۔

صولت جنگ کی موت کے بعد اگلے چودہ پندرہ سالوں تک پورنیہ سیاسی سازشوں اور خانہ جنگیوں کا مرکز بنا رہا۔ بلاسی کی لڑائی (1757ء) کے نتیجے میں بنگال پر انگریزوں کی سیاسی برتری اور بکسر کی لڑائی (1764ء) کے بعد شمالی ہند کے بڑے حصے پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام نے پورنیہ پر بڑا اثر ڈالا۔ لارڈ کارنوالس (1786-93ء) کی مالگذاری اصلاحات جو استمراری بندوبست کے نام سے مشہور ہے۔ بنگال کے ساتھ ہی پورنیہ میں بھی نافذ کر دیا گیا۔ اس کی رو سے مالگذاری وصول کرنے والے بیچولیوں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ جو زمیندار، تعلقہ دار، پتنی دار، ملک دار، جوت دار، قامت دار اور کلیتی دار وغیرہ کے ناموں سے جانے گئے۔ انگریزوں نے اپنا حصہ دس فیصد مستقل طور پر متعین کر کے انہیں زمین کا مالک بنا دیا۔ اس طرح کسانوں سے اسکی زمین چھین کر ان بچولیوں کے حوالے کر دی گئیں۔ ان بیچولیوں کے دباؤ میں کسان دن رات کھیتوں پر محنت کر کے پیداوار بڑھانے پر مجبور کر دیئے گئے۔ لیکن اس کا پھل انہیں نہیں، زمینداروں کو ملتا تھا۔ اس نئے طبقے کے 95 فیصد سے بھی زیادہ افراد اپنے انگریز آقاؤں کو خوش کرنے، آمدنی اور رُعب و دبدبہ بڑھانے کیلئے کسانوں مزدوروں اور عوام کا طرح طرح سے استحصال کرتے اور ان پر ظلم و ستم ڈھاتے تھے۔

مالگذاری اصول کرنے والے عملے، تحصیل دار، نائب تحصیل دار، سری مان پٹواری، مقدم وغیرہ کے ناموں سے جانے جاتے تھے۔ گاؤں کے بڑی اکائیوں کے سربراہ قریہ دار، مرر اور منڈل کہلاتے تھے۔

اومالے کے مطابق پورنیہ میں استمراری بندوبست کے سمجھوتے ابتدا میں 38 مالکان جائیداد کے ساتھ کئے گئے جو 36 اسٹیٹ کے مالک تھے اور جن کی مالگذاری ساڑھے بارہ لاکھ روپئے سالانہ مقرر کی گئی تھی۔ ان میں صرف حویلی، سرجاپور اور دھرم پور پرگنوں سے تقریباً 6 لاکھ 81 ہزار 796 روپیوں کی وصولی ہوتی تھی۔

1888عیسوی میں ایسے اسٹیٹس کی تعداد 1670 تک پہنچ گئی تھی۔ جب کہ 20ویں صدی میں اس میں مزید اضافے ہوئے۔(19)ان زمینداروں میں بڑی بڑی جائیدادوں کے مالک مندرجہ ذیل تھے۔

(1) رانی اندراوتی، دختر راجامادھو سنگھ، دربھنگہ، موضع موہنی واقع تھانہ قصبہ کی رہنے والی تھی لیکن مقامی ذرائع اسے رانی گنج کے قریب پسراہا کی رہنے والی بتاتے ہیں۔اس کی جائیداد حویلی ،سلطانپور، سری پور، فتح پور، سنگھیا، کٹیہار، کماری پور، کراری اور ناتھپور پرگنوں پر مشتمل تھی، جس کا رقبہ دوہزار مربع میل تھا۔آخرالذکر بعد میں بھاگلپور منتقل کردیا گیا۔

(2) راجا مدھو سنگھ، دربھنگہ کی زمینداری پرگنہ دھرم پور میں تھی جس کا رقبہ ایک ہزار مربع میل تھا۔

(3) سید فخرالدین حسین خاں، نوابان کھگڑہ کے مورث اعلیٰ کی زمینداری پرگنہ سرجاپور میں تھی جس کا رقبہ 729 مربع میل تھا۔

(4) سید بقاءاللہ بدور کا زمیندار تھا جس کا رقبہ 284 مربع میل تھا۔

(5) شیوناتھ اور گوری ناتھ پرگنہ تاج پور کے مشترک زمیندار تھے۔ جس کا رقبہ 197 مربع میل تھا۔

(6) بابو دلار سنگھ، جس کا شمار پورنیہ کے بڑے زمینداروں میں تھا، تیراکھرداکا زمیندار تھا۔ جس کا رقبہ 75 مربع میل تھا۔

رانی اندراوتی اور فخرالدین حسین خاں کی جائیدادیں زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکیں۔ رانی اندراوتی نے 1850ء میں مرشدآباد کے بابو پرتاپ سنگھ کے ہاتھوں حویلی اور سلطانپور پرگنوں کی پوری جائیداد اور سری پور، کٹیہار، فتح پور، سنگھیا اور کماری پور پرگنوں کی 3 چوتھائی جائیداد فروخت کردی جبکہ بقیہ پرگنے پورنیہ کے ایک انگریزی مسٹر پالر نے اور پرگنہ کریری، بنیلی راج کے راجا لیلا نند سنگھ نے خرید لی۔ بابو پرتاپ سنگھ نے بھی 1859ء میں سلطانپور اور حویلی پرگنے بالترتیب ایک معزز انگریز مسٹر اے۔جے۔فوربیس اور حویلی پرگنہ پورنیہ کے ایک مشہور مہاجن نیک چھید لعل چودھری کے بیٹے بابو دھرم لعل کو بیچ دی جسے اس نے اپنی بیوی مسمات بھگوان بتی

چودھرائن پورنیہ کے نام سے خرید کی۔ چودھرائن اور اس کے بیٹے بابو پرتھی چندر لعل چودھری نے اس جائیداد میں بہت اضافہ کیا اور راجا کا خطاب حاصل کیا۔

راجا پی سی لعل بڑے ذی علم، صاحب ذوق اور آخری دور کے پورنیہ کے سب سے زیادہ دولت مند زمیندار تھے۔ بزرگوں اور صوفی سنتوں سے اسے بڑی عقیدت تھی۔ بدھو بتہ نامی ایک مجذوب کی وہ بڑی عزت کرتے تھے جو ہمیشہ انہیں، رے پرتھیا، کہہ کر پکارتے تھے۔ مجذوب موصوف کاٹھکانہ موضع دَمکا میں شیخ کفایت اللہ کا مزار تھا۔ راجا پی سی لعل چمنی بازار میں واقع شیخ مصطفی جمال الحق کے مزار پر بھی حاضری دیا کرتے اور قیمتی نذرانے پیش کیا کرتے۔ وہاں کی کچھ عمارتیں بھی ان کی یادگار ہیں۔ علم وثقافت کی سرپرستی میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ ان کی لائبریری متعدد زبانوں اور فنون کی کتابوں سے بھری تھی۔ وہ خود بھی کئی زبانوں کے جانکار تھے۔ اردو ،فارسی اور انگریزی سے خاصہ شغف تھا۔ اردو شاعری بھی کرتے تھے اور حضرت شوق نیموی کے شاگرد تھے جو مولانا ابوالکلام آزاد کے بھی استاد تھے۔(20) تذکرہ ہندو شعرا میں ان کا تذکرہ ملتا ہے۔ تخلص صبا ہے۔ ڈاکٹر عنصری بدر نے بھی اپنی کتاب میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ راجا پی سی لعل کی یادگاروں میں پرتھی چند ہائی اسکول پورنیہ سیٹی، چتروانی سنیما بھٹا بازار اور پورنیہ جنکشن سے پورب گلاب باغ مارکیٹ ہیں۔ یہ سنسان سی جگہ آزادی سے کچھ پہلے ایک مارکیٹ کے طور پر شروع کی گئی تھی جہاں کچھ مارواڑیوں نے کپڑے، کرانہ، جوٹ اور غلے کی تجارت شروع کی تھی۔ پھر دسمبر میں میلہ لگنا شروع ہوا اور اب یہ شمالی ہندوستان کی غلہ، جوٹ، کرانہ اور تمام ضروریات زندگی کے سامانوں کی مشہور تجارتی مرکز ہے۔

دوسری اہم جائیدا، بنیلی اور سری نگر اسٹیٹس کے مالک بابو دلدار سنگھ کی تھی جو متذکرہ چھٹے اسٹیٹ کا مالک اور زمیندار تھا۔ اس کے دو لڑکے بیدیانند سنگھ اور رودرانند سنگھ تھے جو بالترتیب بنیلی اور سری نگر شاخوں کے مورث اعلیٰ تھے۔ ان دونوں کی جائیدادیں پورنیہ کے علاوہ بھاگلپور، مونگیر، مالدہ اور سنتھال پرگنہ میں بھی واقع تھیں لیکن انکے رہائشی مکانات اور محلات بنیلی، سری نگر، چمپا نگر، رام نگر اور گڑھ بنیلی میں واقع ہیں۔ بنیلی اسٹیٹ کی جائیداد کا انتظام و انصرام راجا لیلا نند اور رانی سیتا بتی کے فرزندوں کلا نند سنگھ اور کرتیا نند سنگھ کے ہاتھوں ایک لمبے

عرصے تک رہی جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ پورنیہ۔اے شکار لینڈ کے وہ مصنف تھے۔ لیلا نند سنگھ کے صاحبزادے پدمانند سنگھ اردو، فارسی، بنگلہ اور انگریزی کے زبانوں کے اچھے جانکار تھے اور اردو میں شاعری کرتے تھے اور تخلص افسر تھا جیسا کہ ڈاکٹر عنصری بدر نے تذکرہ شعرائے پورنیہ میں لکھا ہے۔(21)

راجا کلا نند سنگھ راج بنیلی کو چھوڑ کر فاربس گنج روڈ پر واقع موضع گھوڑ دوڑ میں بس گئے اور اس کا نام گڑھ بنیلی رکھا۔ وہاں اس نے ایک عالیشان ڈیوڑھی، راج محل، شکار گاہ اور مندر تعمیر کرائی اور اسے ایک اہم تجارتی اور ثقافتی مرکز بنانے کی کوشش کی۔ ایک ہائی اسکول اور بازار کی بھی بنیاد رکھی گئی۔ 30-35 سال پہلے تک وہاں درگا پوجا کے موقع پر ایک میلہ لگتا تھا جہاں دور دراز علاقوں کے دوکاندار، ضروریات زندگی سے متعلق مختلف قسم کے سامانوں کی دکانیں مہینہ بھر کیلئے لگاتے تھے۔ یہاں جھولا، سرکس، سنیما نوٹنکی، موج و مستی اور تفریحات کے متعدد ذرائع مہیا کئے جاتے تھے۔ عالمی شہرت یافتہ کہانی نویسی پھنیشور ناتھ رینو کی کہانی،،مارا گیا گلفام،، کی بنیاد پر ایک فلم،، تیسری قسم،، کے نام سے بنائی گئی جس کی زیادہ تر شوٹنگ اسی میلے مین ہوئی تھی۔ راج کپور اور وحیدہ رحمان اس فلم کے اداکار تھے۔ اس فلم میں پورنیہ کی تہذیب و ثقافت، بول چال اور سادہ زندگی کی بہترین عکاسی ہے۔ سری نگر ہائی اسکول اور ٹی این جے کالج بھاگلپور کے قیام میں بھی بنیلی راج نے فیاضی سے حصہ لیا تھا۔

کھگڑہ اسٹیٹ کے بانی ایک ایرانی سردار سید خاں دستور ہمایوں اور شیر شاہ کے درمیان ہوئی جنگوں میں ہمایوں کا حلیف اور مددگار تھا۔ 1556ء میں اپنی واپسی کے بعد ہمایوں نے اسے سرکار تاجپور میں واقع پرگنہ سرجاپور کی زمینداری اور قانون گوئی کے عہدے سے سرفراز کیا۔ زمینداری ملنے کے بعد نیپالیوں اور بھوٹانیوں سے آئے دن ان کی چھڑپیں ہوتی رہتی تھی۔

خوش قسمتی سے اسی زمانے میں، ترمذ سے موسوی سادات کا ایک فرد سید رائے خاں نے اپنے خاندان کے ساتھ یہاں آکر بود و باش اختیار کی۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد سید رائے خاں نے دشمنوں کے مقابلے میں سید خاں دستور کی زبردست مدد کی اور نیپالی اور بھوٹانی حملہ آوروں کو مار بھگایا۔ سید خاں کو اولاد نرینہ نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی تھی جس کی شادی اس نے سید رائے خان

سے بخوشی کر دی۔ چنانچہ دستور کی موت کے بعد سید رائے ہی اس کا جانشیں قرار پایااور اسی کے خاندان میں زمینداری بھی چلی گئی۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں نے اپنے اپنے عہدوں میں اس کی تجدید و توثیق کی۔ فوجداروں کے عہد میں بھی وہ متحرک اور فعال رہے۔ انہیں راجا، نواب اور خان بہادر کے خطابات سے نوازا گیا۔ جلال گڑھ کے قلعے کے ذمہ دار اور نگراں بھی وہی بنائے گئے۔ منتخب السیر کے مطابق راجا جلال نے اس کی تعمیر کرائی تھی جو صحیح نہیں ہے۔ مالگذاری کے قضئے کو لے کر سیف خاں اور صولت جنگ سے راجا کے اخلاف راجا جلیل کے ساتھ شدید اختلافات رونما ہوئے۔ آخر الذکر کے عہد میں اسے قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں اور بحالت قید جلال گڑھ کے قلعے ہی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اومالے کے مطابق آپسی اختلافات کے سبب یہ خاندان دو حصوں، کھگڑہ شاخ اور کشن گنج شاخ میں منقسم ہو گیا۔ نواب کھگڑہ کے وارثوں میں نواب سید عطا حسین، نواب سید معین الدین مرزا اور نواب سید زین الدین حسین مرزا نے بڑی شہرت حاصل کی۔ عطا حسین نے پورنیہ کے انگریز کلکٹر مسٹر ویکس کی مدد اور اس علاقے کے ایک بزرگ حضرت کمل شاہ کی ایماء اور دعاؤں سے 1883ء میں کھگڑہ میں ایک میلہ لگوایا۔ اس میلے کا شمار ہندوستان کے مشہور میلوں میں ہوتا تھا۔ دہلی پنجاب سے لے کر بنگال، بھوٹان اور نیپال کے دکاندار اور خریدار لاکھوں کی تعداد میں یہاں جمع ہوتے تھے۔ یہ میلہ مویشیوں کی خرید و فروخت کیلئے مشہور رہا ہے۔ زرعی پیداوار اور مویشیوں کی نمائش اور ان پر انعامات اور اختتام پر آتش بازی یہاں کی خصوصیات تھیں۔ اومالے نے لکھا ہے: کھگڑہ کی شہرت ایک عظیم الشان میلے کے باعث ہے۔ اس کا انتظام کھگڑہ اسٹیٹ کے ماتحت ہے۔ 50 ہزار سے ایک لاکھ تک کا مجمع ہوتا ہے۔ (22) ہاتھی گھوڑے، ٹٹو، بھیڑ، بکری، اونٹ اور مویشیوں کی خرید و فروخت بھاری تعداد میں ہوتی ہے۔ میلے کے دوران یہاں ایک مشاعرے کا بھی انعقاد ہوتا تھا جس میں مقامی اور بیرونی شعراء بڑی تعداد میں حصہ لیتے تھے۔ کھگڑہ کے نوابوں نے تعمیرات کی طرف بھی توجہ دی۔ کھگڑہ میں کئی عالیشان مساجد، امام باڑے، درگاہ قدم رسول، عصا شریف، مدرسے اور رہائشی محل موجود ہیں۔ پرانے کھگڑا میں پرانی ڈیوڑھی اور محلوں کے باقیات ہیں۔ نوابان کھگڑا کے دربار سے متعدد علماء اور شعراء بھی وابستہ رہے ہیں جو درس و تدریس کے علاوہ

تصنیف وتالیف میں بھی مصروف رہا کرتے تھے۔ علماء میں حافظِ حدیث مولانا قادر بخش سہسرامی کی شخصیت بہت ممتاز تھی۔ منشی فدا علی او حکیم رکن الدین دانا، سہسرامی بھی اس دربار سے وابستہ تھے۔

نوابان کھگڑہ نے مختلف کھیل کود کی بھی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی۔ غلام حسین مرزا فٹ بال کے انٹر نیشنل پلیئر تھے۔ اس نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی تھی اور وہاں ہاکی کے کھیل کو رواج دیا تھا۔ وہ کلکتہ اورینٹل اسپورٹنگ کے بانیوں میں تھے اور محمڈن اسپورٹنگ کے ایک لمبے عرصے تک صدر رہے۔ وہ پولو اور شکار کے بھی بڑے شوقین تھے وہ علی گڑھ میں سر راس مسعود اور ڈاکٹر سید محمود کے ہم سبق تھے۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کیلئے بہار سے ان کا انتخاب ہوا تھا لیکن ان کے انکار پر سر سلطان بھیجے گئے۔ 1935ء میں ان کے انتقال کے بعد سید زین الدین حسین مرزا نواب ہوئے انہیں بھی مختلف کھیلوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ 1937ء میں بہار اسمبلی کے ممبر ہوئے اور 1945ء میں کشن گنج میونسپلٹی کے ممبر نامزد ہوئے۔ ان کی شادی جنرل اسکندر مرزا کی بھانجی سے ہوئی تھی جو پاکستان کے صدر ہوئے۔ پورنیہ کلکٹریٹ کے سامنے جو توپ نصب ہے وہ 1890ء کی بنی نواب عطا حسین کی ملکیت تھی جسے نواب زین الدین مرزا نے بطور تحفہ پورنیہ کے کلکٹر مسٹر پی۔ پی نیر کو دی تھی۔ نوابان کھگڑہ کے متعلق منشی فدا علی کی کتاب منتخب السیر (فارسی) اور قادر بخش سہسرامی کی کرسی نامہ راجگانِ کھگڑہ میں کچھ تفصیلات ملتی ہیں۔

کشن گنج شاخ کے سید اکبر حسین لا ولد فوت ہوئے اس کی بیوی نے اپنی کل جائیداد اپنے بھائی پورنیہ کے سید حسن رضا کو لکھ دی جن کے لڑکے سید محمد رضا اور سید احمد رضا ہوئے اور پوتے سید اصغر رضا بہادر اور سید دلاور رضا تھے۔ ان کے محلات کشن گنج میں اب تک دلاور پیلس کے نام سے موجود ہیں لیکن جائیدادیں فروخت ہو گئیں۔ ان جائیدادوں کے خریداروں میں پورنیہ کے مہاجن ڈی۔ سی۔ لعل اور پی۔ سی لعل اور پٹنہ کے نواب لطف علی خاں کے نام قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر جسٹس سید سرور علی مرحوم کے اسلاف میں تھے۔

1770ء میں پورنیہ کے فوجداروں کی حکومت ختم ہو گئی اور مسٹر ڈوکریل کی تقرری کے ساتھ ہی، جو آگے چل کر ضلع کلکٹر کہلایا۔ پورنیہ میں برطانوی حکومت کا قیام عمل میں آگیا۔ اس

عہد کی ثقافتی سر گرمیوں میں سب سے اہم 1852ءمیں پورنیہ ضلع اسکول کا قیام ہے۔ جو بہار کا قدیم ترین اسکول ہے اور اس کی ابتدا پورنیہ ہوسٹیل کیمپس میں ہوئی۔ اس کے بعد مدرسہ اساقتِ رحمت محمدیہ کا قیام ہے، جسے محمدیہ اسٹیٹ کے زمیندار شیخ امیر بخش ولد شیخ رحمت اللہ نے 27 محرم 1310 ہجری 1888-89ء میں قائم کیا یہ مدرسہ پچھلے سو سال سے بھی زیادہ مدت سے تعلیم و تعلّم میں مصروف ہے۔ شیخ امیر بخش نے اپنے وقف نامہ نمبر 215ء جو 65 صفحات پر مشتمل ہے۔ مدرسے کے قیام کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیتے ہوئے اعلیٰ تعلیم کا نظم کیا اور 40 طلبہ کے مفت بعام و قیام کیلئے موضع لکھنا اور دو گھریا میں 50 ایکڑ سے بھی زیادہ زمین وقف کی اور درس و تدریس کیلئے کئی کمروں پر مشتمل ایک پختہ عمارت بھی۔ یہ مدرسہ اب تک موجود ہے لیکن اب یہاں صرف چند ابتدائی درجوں کے بچوں کا ہی انتظام ہے جبکہ آزادی سے قبل اس ادارے نے تعلیم کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس مدرسے سے تعلیم حاصل کرنے والوں میں اس علاقے کی متعدد اہم شخصیتیں ہیں جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں شہرت حاصل کی۔ اس سلسلے میں خاص طور سے سیاستدانوں میں محمد طاہر، محمد طیب، حبیب الرحمن، حسیب الرحمن اور محمد تسلیم الدین، علماء، روحانی پیشواؤں اور سماجی کارکنوں میں، مولانا محمد ابراہیم (ہاٹ گاچھی)، مولانا عابد حسین (کٹیہار)، حافظ قطب الدین (ایچالو) الحاج حیدر علی رحمانی (حیدر نگر) مولانا منور حسین اور مولانا محمد امام الدین (کشن گنج)، حافظ محمد اسحاق (گیرکی) منشی محمد سلطان (لکھنا) مولانا عبدالرزاق (پرسرائی) اور مولانا محمد ادریس (لوکانی) کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ (23)

کٹیہار میں مدرسہ دارالعلوم لطیفی اور بحرالعلوم، پورنیہ کالج پورنیہ، ڈی ایس کالج کٹیہار، مدرسہ انجمن اسلامیہ کشن گنج، انسان اسکول کشن گنج، مدرسہ تنظیمہ بارا عیدگاہ، مدرسہ محمودیہ بشنپور، ودیا ساگر اسکول کاجھا، اُرسلاین اسکول پورنیہ، ملیہ کانوینٹ اور ملیہ اسکول پورنیہ، آزاد اکیڈمی ارریہ، کٹیہار میڈیکل کالج، ماتا گجری میڈیکل کالج، اے ایم یو کیمپس کشن گنج، بہار کے متحرک اور فعال وزیر اعلیٰ جناب نتیش کمار کی ذاتی کوششوں سے کرشی مہاودیالیہ پورنیہ سٹی اور پورنیہ یونیورسٹی قائم کی گئی ہیں۔

انگریزی کتاب ''پورنیہ-اے شکار لینڈ'' جس کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے پورنیہ کو دنیا کی مشہور شکار گاہوں میں دکھلانے کی کوشش کی ہے۔ راج بنیلی اب ایک اُجاڑ گاؤں ہے۔ راج پریوار کے لوگ چمپا نگر، شری نگر، گڑھ بنیلی، پورنیہ، بھاگلپور اور پٹنہ میں بس گئے ہیں لیکن قصبہ بلوک کے شمال-مغربی حصے میں واقع راج بنیلی کبھی سنسکرت علوم اور متھلا ثقافت کا ایک اہم مرکز تھا۔(24)

بیسویں صدی میں بھی زندگی کے مختلف شعبوں میں بعض ایسی شخصیات پیدا ہوئیں جن میں سے بعض نے قومی اور بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ پاکستان کے صدر اسکندر مرزا کی پرورش کھگڑہ اسٹیٹ میں ہوئی۔ بنگلہ دیش جنگ آزادی کے رہنما شیخ مجیب الرحمان نے اپنی ابتدائی تعلیم پورنیہ ضلع اسکول میں حاصل کی۔ شری لکشمی نرائن سدھانشو اور شری رام نرائن منڈل لمبے عرصے تک بہار اسمبلی کے اسپیکر رہے۔ اول الذکر ہندی ساہتیہ کے ایک بڑے مصنف اور ناقد بھی تھے۔ شری بھولا پاسبان شاستری کا شمار بہار کے نیک نام وزرائے اعلیٰ میں ہوتا ہے۔ مولوی محمد طاہر جو علی گڑھ یونیورسٹی کے گریجویٹ اور لاء گریجویٹ تھے۔ وہ اس علاقے کے اولین تعلیم یافتہ لوگوں میں تھے۔ میونسپل الیکشن میں راجہ پی۔ سی۔ لعل کو شکست دے کر اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا اور ایک لمبے عرصے تک بہار اسمبلی اور پارلیامنٹ کے رکن رہے اور عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انہوں نے آفتاب کے نام سے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا۔ بیگنا اسٹیٹ کے مولوی محمد احسن سینٹرل اسمبلی کے رکن تھے۔ شری فنی گوپال سین، شری کمل دیو نارائن سنہا، جناب حسیب الرحمن، محمد حسین آزاد، رفیق عالم، حاجی ضیاء الرحمن، جمیل الرحمن، تسلیم الدین، معید الرحمن، عظیم الدین، معیز الدین منشی، محمد سلیمان، محمد یاسین، ابو ظفر، ڈاکٹر جاوید آزاد، مادھوری سنگھ، بیولا دوجا، اجیت سرکار، سید معین الدین، مولانا اسرار الحق وغیرہ قابل ذکر سیاسی رہنماؤں میں رہے ہیں۔

کھیل کود بالخصوص فٹ بال میں متعدد لوگوں نے امتیاز حاصل کیا۔ جس میں عبدالصمد اور عبدالطیف بین الاقوامی شہرت کے مالک فٹ بالر ہوئے۔ صمد، اونچی کود، لمبی کود، کرکٹ، ہاکی، ٹینس ہی نہیں اسپورٹ کے سبھی شعبوں میں ماہر کھلاڑی تھے۔ وہ پورنیہ ضلع اسکول کے طالب علم

تھے۔ ہندوستان بھر میں جادو جگانے کے بعد وہ جاوا، سماترا، انڈونیشیا، آسٹریلیا اور انگلینڈ کا دورہ کیا اور اپنی زندگی میں وہ افسانوی حیثیت کے مالک ہو گئے تھے۔

مشہور اداکارہ اور دیوداس کی ہیروئن سچترا سین کی پیدائش اور پرورش پورنیہ میں ہوئی 1977 میں وہ پورنیہ پارلیامانی حلقے سے کانگریس کی امیدوار تھیں۔ فارسی، اردو، ہندی، بنگلہ اور میتھلی زبانوں کے متعدد ادباء اور شعراء قومی سطح پر جانے گئے۔ پھنیشور ناتھ رینو کا شمار ہندی کے بین الاقوامی سطح کے کہانی نویسوں میں ہوتا ہے۔

صنعت اور روزگار کے میدان میں سہارا شری سبرتو رائے ارریہ کے باشندہ ہیں۔ جس نے بڑی کم مدت میں سہارا انڈیا پریوار کو ایک عظیم پریوار میں بدل دیا۔ کارپوریٹ کی دنیا میں اس نے جو انقلاب برپا کیا وہ اپنے آپ میں بے مثال ہے۔ موجودہ دور میں دس لاکھ لوگ اس ادارے سے وابستہ ہیں۔ اور 45 لاکھ لوگ اس کے منصوبوں سے وابستہ ہیں۔

پورنیہ کا علاقہ غیر صحت مند ماحول کے لئے مشہور رہا ہے۔ کنویں یا نل سے پانی نکالنے کے بعد اس کا رنگ بدل جاتا ہے۔ جو عام طور سے صحت کے لئے مضر ہے۔ ایک کہاوت ہے؛،، نہ زہر کھاؤ نہ مہرہ کھاؤ- مرنا ہے تو پورنیہ جاؤ۔

پورنیہ کا علاقہ زراعت پر منحصر ہے یہاں تقریباً سبھی فصلوں کی کاشت ہوتی ہے۔ جن میں خاص طور سے دھان ، جوٹ ،گیہوں ، جو، مکئی، مٹر، مروا، مکھانا، کرتھی، مسور، چنا، ارہر، مونگ، کھساری ،سرسوں ،توری، تیسی ، گنا ،کدو، کدیما، بیگن، کریلا، بھنڈی، پرول، جھنگلی، سیم، ٹماٹر، گوبھی، بندھا، نینوا، آلو، پیاز، شکر قند، ہلدی، ادرک، مولی، کھیرا، مرچ، گاجر، دھنیا، امرا مختلف قسم کے ساگ جیسے پٹوا، لافا، پالک، لال ساگ ،ہرا ساگ، میتھی، بیتھوا، چرامر، کھساری، توری وغیرہ۔ پھلوں میں مختلف قسم کے قلمی آم جیسے مالدہ، بامبے اور بیجو آم کی سیکڑوں قسمیں، کیلا، امرود، بیر، لیچی، انناس، کٹھل، بلسر، شریفا، اتا، مشری قند، سپاٹو، پنیلا، جامن، گلر، شہتوت، خربوزہ، تربوز، پپیتا، قدم، کاغذی لیمو، چکوترہ لیمو، ترکن، مہوا، فالسہ وغیرہ ہیں۔

اس علاقے میں صنعت کی بھی ترقی ہوئی۔ یہاں برتنوں پر بیدری کا کام بین الاقوامی شہرت رکھتا ہے۔ بیل گاڑی کا پہیہ، کمبل، چٹائی، سوتی کپڑے، لکڑی اور لوہے کے مختلف پیداوار،

مونی بیتوا، سوپ چنگیری، ٹوکری کٹھہ، لڑا، ڈوئی، ٹاپی پیڑا، ٹھنکا، گانجہ، مونڈھا وغیرہ کچھ دنوں سے اس علاقے میں پیٹرول پائے جانے کے امکانات ظاہر کئے جارہے ہیں۔

پورنیہ کے لوگ کھانے پینے کے بڑے شوقین ہیں۔ سبزی، گوشت اور مچھلی عام طور سے یہاں پچیسوں قسم کی مچھلیاں پائی اور پالی جاتی ہیں۔ معاشرہ اور ادب کے متعلق کہنے کو بہت کچھ ہے لیکن اس مقالے کو یہیں پر ختم کیا جاتا ہے۔

مآخذ اور حوالے:

(1)(الف) ایس ایس اومالے، بنگال ڈسٹرکٹ گزیٹیئر پورنیہ، کلکتہ، 1911ء، (اسکے بعد اومالے لکھا جائیگا) صفحہ 1-2 اور 42-45

(ب) یوسف رشیدی، احسن التواریخ (تاریخ پورنیہ) مجگواں پورنیہ، 1336 ہجری، (اس کے بعد یوسف رشیدی) صفحہ 11-12

(2) نامور آرکیالوجسٹ ڈاکٹر وجے کمار چودھری، موجودہ ڈائریکٹر وراثت حکومت بہار، پٹنہ،

(3) فرانسس بوکانن-این اکاؤنٹ آف دی ڈسٹرکٹ آف پورنیہ 1809-10ء (اس کے بعد بکانن) صفحہ 1-2، اومالے صفحہ 1

(4) غلام حسین سلیم، ریاض السلاطین، کلکتہ 1910ء، (اس کے بعد ریاض السلاطین) صفحہ 36-38

(5) بابو بھوانن سنگھ، پورنیہ ایتو بریتو، یہ بنگلہ کتاب کوشش کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکی لیکن اس کے حوالے یوسف رشیدی اور اکمل یزدانی نے دیا ہے۔

) یوسف رشیدی) صفحہ 102، اکمل یزدانی (مدیر ہفتہ وار انسان، کشن گنج، پورنیہ نمبر 1955 (اس کے بعد پورنیہ نمبر) صفحہ 11-12

(6) اومالے، صفحہ-1 پورنیہ نمبر، صفحہ 11 اور 88

(7) سیکھئے مہابھارت کا ویراٹ پرو اور کرتیانند ویوگی، پورنیہ کی تاریخی اہمیت، پرواز اصلاحی، دیار پورنیہ میں چند ماہ مطبوعہ پورنیہ نمبر میں صفحہ 21 اور صفحہ 66

(8) یوسف رشیدی صفحہ 43-47

(9) تھامس واٹر، آن یووان چوانگ ٹریلوس ان انڈیا 629-644، جلد اول دوم، منشی رام منوہر لعل نئی دہلی 1944 جلد دوم صفحات 185-186

(10) بھوانن سنگھ، یوسف رشیدی صفحہ 43-47

(11)محمد قاسم،ہندوشاہ تاریخ فرشتہ جلد2(اردو)صفحہ 842، قاضی سجاد حسین(مرتب)دیوان حافظ، نئی دہلی-1976ء صفحہ 172

(12)تاراچنداے شورٹ ہسٹری آف انڈین پیوپلز، میکیلن،ٹورنٹو،1953صفحات144-145

(13)ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، دی انڈین مسلمانس، خوش روز پبلیکیشن ،ڈھاکہ 1999ء صفحہ 136-137، شیخ محمد اکرام،آب کوثر،لاہور1940ء صفحہ 51

(14)قیام الدین احمد، کورپس آف عربک اینڈ پرشین انسکرپشنز، کے۔پی۔جیسوال انسٹی ٹیوٹ پٹنہ ،1973، انسکرپشن نمبر51مورخہ 943ہجری

(15)غلام حسین طباطبائی، سیر المتاخرین جلد اول کلکتہ 1789، صفحہ 357جلد دوم صفحات78-73،84-74،47-48،

ریاض السلاطین، صفحات36-38(فارسی)صفحات42-48اور84-88

محمد انوار الحق تبسم، سیف خاں انیر اے فوجدار آف پورنیہ۔

دیکھئے پروسیڈنگز والیوم انڈین ہسٹری کانگریس56 سیشن کلکتہ صفحات240-242

(16)وہی اور سید حسن عسکری اور قیام الدین احمد کمپری منسیو آف بہار جلد دوم، حصہ دوم صفحات580-588

(17)ودیادھر، مخطوطہ ایوب پبلک لائبریری، حیدر نگر-بالسر صفحہ،19،21،22،29،40-3،4،9،17،

(18)اومالے، صفحہ 49

(19)وہی صفحہ148-165

(20)عنصری بدر، اردو شاعری کا ارتقاء قدیم پورنیہ میں، دہلی2013صفحات41-42

(21)وہی صفحات42-43

(22)اومالے صفحات193-94

(23)محمد انوار الحق تبسم،پورنیہ --اتیہاس اور سنسکرتی کے کچھ پہلو ،مطبوعہ بہار اتیہاس پریشد، مظفر پور، پروسیڈنگس والیوم

(24)وہی

***

ڈاکٹر الفیہ نوری

مگہی زبان کی تاریخ اور اس کا ارتقا

مگہی زبان اور اس کے ادب پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلے اس کے علاقے سے واقف ہونا ضروری ہے۔ عہدِ قدیم کی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ قدیم مگدھ کا علاقہ کافی پھیلا ہوا تھا۔ شمال میں گنگا، جنوب میں وِندھیہ کی پہاڑیاں، پورب میں 'مدگا گیری (موجودہ مونگیر) اور مغرب میں چرنادری (جدید چُنار) تک یہ پھیلا ہوا تھا۔ کرم ناشا اور چُنار کے بیچ کا علاقہ عام طور پر کاشی کے ساتھ جُڑا ہوا مانا جاتا ہے۔ ویدک ادب کے مطابق اس عہدِ قدیم میں بہار میں تین صوبے تھے۔ گنگا کے جنوب اور مغرب میں 'مگدھوں' کی حکومت تھی، مشرق میں 'انگوں' کی اور شمال میں 'وِیدیہوں' کا۔ 'ویدیہوں' کی حکومت کی سرحد 'سدانیرا' (گنڈکی) جو اِس کو 'کوشلوں' سے الگ کرتی تھی۔ ان تینوں صوبوں کا ذکر رِگ وید میں ان ناموں سے نہیں ملتا ہے۔ رگ وید میں 'کی کٹ' (कीकट) کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے پر پتا چلتا ہے کہ برہمن یا آریہ لوگوں کے مطابق یہ لوگ ناستِک (مُلحد) تھے۔ بعد میں اسی قوم کو بُدھ مذہب سے جوڑ کر ماہرین نے دیکھا۔ ''وایو پُران'' میں گیا اور راج گیر کے تذکرے کے ساتھ ساتھ کیکٹ کا پھر ذکر آتا ہے جس سے ماہرینِ زبان اور تاریخ نے یہ تسلیم کرلیا ہے کہ کیکٹ ہی مگدھ کا قدیم نام ہے۔

مگدھ کی قدامت کے سلسلے سے چند مسائل تاریخ میں قائم ہیں۔ رِگ وید کے تیسرے اشٹک (अष्टक) میں کیکٹ کے راجا پرم گند کا تذکرہ ہوتا ہے (۱) لیکن 'ماگدھ لیٹریچر' کے مصنف ہر پرساد شاستری (۲) اپنی گفتگو میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ پرم گند مگدھ کا بنیاد گزار تھا۔ ان کی منطق یہ ہے کہ اتھروید کے پانچویں کانڈ میں مگدھ وہ علاقہ ہے جہاں ''شیت''؟ (शीत) ملیریا کے وبائی آثار موجود تھے۔ یہاں مگدھ کے تذکرے میں جمع کا صیغہ ملتا ہے جس سے علاقہ کے بجائے آبادی اور قوم کا پتا چلتا ہے۔ یہاں یہ بھی ظاہر ہوتا کہ یہ انار یہ اور ویدک آریوں سے موافق رشتہ نہیں رکھتے تھے (۳) یجُر وید میں یہ تذکرہ موجود ہے 'अतिक्रष्टाय मागधम' جس سے یہ بات اور بھی

واضح ہوجاتی ہے کہ ماگدھ یعنی مگدھ کے باشندہ آریوں سے مختلف تھے۔ پنڈت شکل نارائن شرما(۴) کے مطابق جنوبی بہار کے آدی واسی باشندہ ویدک مذہب میں یقین نہیں رکھتے تھے اور ملحد تھے۔ شاید اسی لیے ان کے نام رکھنے میں بھی آریوں کی نفرت ظاہر ہوتی ہے۔ کیوں کہ کیکٹ کے لفظی معنی ہیں: کچھ نہ کرنے والا۔ ڈاکٹر دیوسہاے شری دیو(۵) نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ کھیتی سے دوری اختیار کرنے والی قوم تھی لیکن سُود پر دوسروں کو پیسے دیتی تھی۔ دیش میں امیروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ 'مگ' کا لفظی معنی سود ہے اور اسی سے اس کا لینے والا مگدھ بنا۔ اسی کے ساتھ نفرت آمیز لفظ کیکٹ کا استعمال ختم ہوگیا۔

محققین نے 'پتن جلی' ('مہابھاشیہ' کے نام ور مصنف) اور والمیکی کے نتائج کا جائزہ لیتے ہوئے یہ قیاس کیا ہے کہ 'وراتیہ' (व्रात्य) کا تعلق جنوبی بہار سے ثابت ہوتا ہے۔ والمیکی رامائن کے اشاروں سے مندرجہ ذیل تین نتائج ظاہر ہوتے ہیں:

(i) सारंगारणय کو سارن (موجودہ چھپرا، سیوان گوپال گنج) تصوّر کیا جاسکتا ہے۔

(ii) 'आरण्य' سے موجودہ آرا کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔

(iii) آج کی سون ندی عہدِ قدیم کی ماگدھی یا سُما گدھی ہوسکتی ہے۔ والمیکی رامائن میں کہا گیا ہے:

(6) सुमागधी नदी पुण्या मगधन विश्रुता ययौ। पच्चनां शैलमुख्याना महये मालेव शोभते।।

اس سے یہ بھی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ سون ندی پہلے پٹنہ کے پورب راج گرہ (راج گیر) کی پانچ پہاڑیوں کی بیچ سے بہتی تھی۔ بعد میں یہ مغرب تک پہنچ چکی تھی اور آج یہ مزید مغرب تک بڑھ کے آرا شہر کے قریب پہنچ گئی۔

ان مباحث سے یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ مگدھوں کے 'جَن' کے نام پر ہی جگہ کا نام مگدھ ہوا۔ 'ماگدھ' لفظ کے معنیٰ ہوئے: مگدھ کے رہنے والے۔ یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ ماگدھ حقیقتاً مگدھ 'جَن' کے رہنے والے ہی ہوں گے۔ مورخین کا خیال ہے کہ ویدک تہذیب وراتیہ (व्रात्य) تہذیب کا میل جول پہلی بار مگدھ میں ہی ہوا۔ راج رشیوں کی روایت بھی مگدھ سے ہی شروع ہوئی جس میں وشومتر (विश्वमित्रा) کی اہمیت واضح ہے۔ ماہرین کا یہ بھی خیال ہے کہ ویدک آریوں سے بغاوت کرکے جو ہنرمند اور باصلاحیت افراد بھاگے، وہ وراتیہ تمدّن کی بنیاد ڈالنے والے یا اس ثقافت

کا قائد بن کر دونوں تہذیبوں کے اختلافات کو رفتہ رفتہ کم کرتے ہوئے اتّحاد کی صورت پیدا کر کے مگدھ کی شکل میں خطۂ ارض یا قوم کے بہ طور اپنا وجود قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

مگدھ میں آریوں کی آمد اور زبان کے ارتقا کی ابتدائی کڑی

مورّخین کا یہ ماننا ہے کہ آریوں کے ہندستان آنے سے پہلے پوربی ہندستان میں مختلف قبائلی برادریوں کا وجود تھا۔ آریہ مغرب سے ہندستان میں داخل ہوئے اور پورب کی طرف بڑھتے ہوئے مختلف قبائلوں سے ان کے تعلّقات استوار ہوئے۔ آریوں کے بیچ بھی برادرانہ طور پر اختلافات کی بنیادیں تھیں جنھیں 'جَن' سے تعبیر کرتے تھے۔ انھی سے 'جن پد' کی اصطلاح پیدا ہوئی لیکن 'جن پد' میں ایک سے زائد 'جن' کے آثار ملتے ہیں۔ مورّخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ مغرب کے مقابلے آریوں کی مختلف برادریاں مشرق میں زیادہ آباد ہوئیں۔ آریوں کے جن یا قبائل میں 'مانو' اور 'ایل' ('येल') نسل کی مرکزی اہمیت بتائی جاتی ہے۔ انھی کی نسلیں شمالی ہندستان میں پھیل گئیں اور حکومت کرنے لگیں۔ 'ایل' نسل کے ایک راجا تیتک شو (तितिक्षु) نے بہار کے خطّے میں پہلی حکومت قائم کی۔

پُرانوں کے مطابق گنگا کے کنارے 'کانیہ کُبج' (काण्यकुब्ज) نام کا ایک صوبہ تھا۔ وہیں کے راجا جہنو (जेहनु) کی شادی مان دھاتا (मानधता) کی لڑکی سے ہوئی۔ جہنو کی چھٹی نسل میں راجا کُش (कुश) ہوا۔ اس کا چھوٹا لڑکا امورت ریس تھا جس کا بیٹا نام ور راجا گے ('गय') ہوا جس نے اپنے نام پر گیا شہر بسایا۔ مورخین کا اندازہ ہے کہ مگدھ میں آریوں کی یہ پہلی حکومت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ گھنے جنگلوں کی بہتات کی وجہ سے آریوں سے ہار کر جو قبائل غیر آریہ جنگل میں پناہ لیتے تھے، وہ موقع پاتے ہی آریوں کی حکومت کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب رہے۔ جے۔ این۔ سماڈار (۷) نے لکھا ہے کہ مگدھ میں برہمنوں کی اشراف زبان کے بجائے کوئی دوسری بولی کا غالباً استعمال ہوتا تھا جسے پراکرت کی کوئی شکل مانی جا سکتی ہے۔

والمیکی 'رامائن' کے ۳۲ ویں باب میں مگدھ کا تذکرہ ملتا ہے۔ وشومتر نے رام اور لکشمن کے ساتھ متھلا کا سفر کرتے ہوئے سون ندی کے کنارے قیام کیا تھا۔ اس ندی کے کنارے بسے ایک خوبصورت شہر کو دیکھ کر رام نے پوچھا: 'یہ کون دیش ہے جو انسانوں اور کھیتی سے آباد اور جنگلوں سے بھرا ہوا ہے؟' وشومتر نے بتایا کہ برہمہ پُتر (ब्रह्मापुत्रा) کُش کے دوسرے بیٹے امورت ریس کی اولاد 'گے' نے اس شہر کو بسایا۔

بمبسار (बिम्बिसार) اور مہاتما بدھ سے بالعموم تاریخی عہد کے ہندستان کا آغاز مانا جاتا ہے۔ مگدھ میں مستحکم حکومت کی بنیاد بمبسار کے عہد میں ہی ہوتا ہے۔ یہ بودھ کے ہم عصر تھے اور بودھ مذہب کی توسیع واشاعت میں انھوں نے اپنی پوری طاقت لگائی۔ مگدھ کی مرکزیت کا ایک بنیادی سبب بودھ مذہب کا فروغ بھی مانا جاتا ہے۔ جین مذہب کے ارتقا میں اس خطّے کا بہت اہم رول ہے۔ برہمن مذہب کے کرم کانڈ اور دکھاوے پر بودھ اور جین مذاہب کے افراد نے جس طرح سخت حملے کیے، اُس سے مگدھ کے عوام کی ایسی ذہنی نشو ونما ہوئی جس نے آنے والے عہد میں اس قوم کی ترقی کے راستے ہموار کیے۔ اس بات کا سب سے اہم ثبوت یہی ہے کہ موریہ (मौर्य) عہد تک پہنچتے پہنچتے مگدھ ہندستان کی مرکزی قوت کے طور پر اعزاز حاصل کر چکا تھا۔ اشوک کے عہد میں یہ ریاست امنِ عالم کا علمبردار بن جاتی ہے۔ چوتھی صدی عیسویں میں سمُدر گپت (समुद्रगुप्त) نے پھر سے اس ریاست کو زوال سے ترقی کی طرف پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔ اگلے عہد میں فاہیان (چینی سیّاح) کی موجودگی اور نالندہ یونیورسٹی کی مرکزیت سے بھی مگدھ ریاست کی اہمیت اور زبان یا مختلف علوم کے درس وتدریس یا عملی ذخائر کا پتا چلتا ہے۔ عہدِ سلطنت (دلّی) میں ہی مگدھ کی حکومت کا زوال آخری طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔

مگدھ ریاست یوں بھی آریوں سے دور کا رشتہ رکھنے کی وجہ سے خاص شناخت رکھتی ہے۔ پھر بودھ مذہب کے پھیلاؤ نے مگدھ میں پراکرتوں کا ایسا فروغ قائم کیا جس سے ماگدھی اور دوسری موجودہ بہاری بولیوں کے امکانات یہاں روشن ہوئے۔ اس لیے جدید ہند آریائی زبان کے خانے میں موجود مگہی زبان کے عہدِ جدید میں ترقی کو سمجھنے سے پہلے یہ لازم تھا کہ ہندستان کے عہدِ قدیم کی اس ریاست کے قیام اور وہاں زبانوں کے فروغ کے مدارج پر غور وفکر کر لیا جائے۔ آئندہ سطور میں جدید ہند آریائی زبان مگہی کے فروغ وارتقا کی بابت اظہارِ خیال کیا جائے گا۔

ہند آریائی کا ارتقا اور مگہی

ہند آریائی کے ارتقا کے عمومی اصول، سنسکرت —— پراکرت —— اپ بھرنش، کے مرحلے میں ہی مگہی زبان کی شناخت کی جا سکتی ہے۔ ہند یوروپی خاندانِ السنہ کے ہند ایرانی نسل کی ہندستانی زبانوں میں مگہی، میتھیلی اور بھوجپوری کے ساتھ مشرقی ہندی اور بنگلہ آج بھی موجود ہے۔ گریرسن کی درجہ بندی کے مطابق: بیرونی، وسطی اور داخلی زبانوں میں بالخصوص پورب کی زبانوں میں بہاری

بولیوں کے تحت مگہی، میتھیلی اور بھوجپوری زبانیں موجود ہیں۔ مگہی کا مطالعہ اسی دائرۂ کار میں زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

عہدِ قدیم میں جو سرمایۂ ادب محفوظ رہ سکا، ان کے مطالعے کے دوران قدیم مگہی کے آثار مندرجہ ذیل طور پر پہچانے جا سکتے ہیں:

(i) وید، براہمن گرنتھ اور قدیم سنسکرت کتب میں ایسے الفاظ مختصر تعداد میں موجود ہیں جنھیں صوتیات کے اعتبار سے 'پراچیہ' کے حلقے میں مانا جا سکتا ہے: بہ طورِ مثال 'ریگ وید' کے دسویں منڈل میں 'ر' کی مختلف آوازوں کی جگہ 'ل' کا استعمال دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہ 'ل' پراچیہ، زبانوں کی خاص پہچان ہے۔

(ii) مشرقی علاقے میں پائے جانے والے قدیم تحریری آثار۔ مثال کے طور پر اشوک کے کتبے اور دوسرے نشانات جو برہمنی رسمِ خط میں محفوظ ہوئے اور اس کے لاٹ پر کندہ ہیں۔

(iii) 'پالی تری پٹک' (पालित्रिपिटक) میں موجود ماگدھی کے مختلف الفاظ، اصطلاحات اور صوتی صیغے۔

(iv) پہلی صدی عیسوی کے بودھ ناٹکوں میں قدیم اردھ ماگدھی اور ماگدھی کے نمونے موجود ہیں۔

(v) سنسکرت ناٹکوں میں موجود ماگدھی اور پراکرت کے الفاظ، اصطلاحات اور اقتباسات۔ 'شاکاری' اور 'چانڈالی' کی مثالیں بالخصوص مِرچ کٹکم اور ابھی گیان شاکُنتلم اس سلسلے سے اہمیت کے حامل ہیں۔

(vi) پانچویں صدی عیسوی کے وروچی (वरूचि) سے ۱۷ ویں صدی عیسوی کے مارکنڈے تک پراکرت کے ماہرین اور قواعد نویسوں کے کتب و رسائل میں مشرقی بولیوں بالخصوص ماگدھی سے پیدا شدہ بولیوں کے آثار موجود ہیں۔

(अपप) مقامات، افراد اور چیزوں کے قدیم نام جو ابتدائی کتب اور مخطوطات میں موجود ہیں۔ ان میں بھی مگہی کے آثار موجود ہیں۔

ماگدھی پراکرت

حالاں کہ رِگ وید کے عہد میں ہی پورب کی زبانوں کے آثار ملنے لگتے ہیں اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رِگ وید کی تخلیق اور تالیف میں زمانے کا بہت فرق رہا ہے۔اسی وجہ سے سنسکرت کے ماہرین بھی اس بات کے قائل ہیں کہ مختلف رچاوں میں زبان بدلتی گئی ہے۔خاص طور سے دسویں منڈل کی زبان لسانی اعتبار سے مکمل طور پر بدلی ہوئی اور عہدِ جدید کی نمایندہ معلوم ہوتی ہے۔میک ڈونلڈ نے سنسکرت ادب کی تاریخ لکھتے ہوئے جو لسانی نتائج اخذ کیے ہیں،ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ماگدھی کی شکل بھی سامنے آرہی تھی (۸)۔ سُنیتی کمار چٹرجی نے بھی قواعد اور لسانی ارتقا کے مختلف اجزا کو سامنے رکھتے ہوئے رِگ وید میں قدیم ماگدھی کی ابتدائی شکلیں ظاہر کی ہیں۔(۹)

چھٹی صدی قبل مسیح میں پانِنی نے اپنے وقت کے اشراف کی زبان کو مثالی زبان تسلیم کر کے قواعد کی اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف ''اشٹ ادھیائی'' پیش کی۔اسے ہی بعد میں سنسکرت قرار دیا گیا۔لیکن اس کے نتیجے میں زبان کا بہتا دریا اچانک رُک گیا۔ ویدک زبان سے علاحدہ بولیوں کو اس نے ''چھاندس'' (छाँदस) نام سے پکارا۔عام لوگوں کے روزانہ کے کام کاج کی زبان پراکرت عام رفتار میں پھیلتی رہی جس کے اثرات بودھ اور جین مذاہب کے پھیلنے سے مزید مرتب ہوئے۔

پانچ سو سال قبل مسیح کے بعد مشرقی (پراچیہ) زبانوں کے فروغ کا سلسلہ سامنے آتا ہے۔ مہاتما بودھ کی تعلیمات کے ابتدائی آثار میں غیر آریائی عناصر بڑھتے چلے گئے اور دیکھتے دیکھتے پالی کا ارتقا شروع ہو گیا۔پالی کے ماہرین نے ماگدھی کے ابتدائی ترقی یافتہ روپ کے طور پر اس زبان کو قبول کیا ہے۔سنسکرت کے عالموں نے بھی مشرقی خطّے کی پراکرتوں یعنی پالی کو ابتدائی عہد میں زیادہ ترقی یافتہ بتایا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ لسانی گروہ کے طور پر پراکرت ہی بنیادی نام ہے اور لسانی ارتقا کے صرف دو مراحل اس دوران پہچانے جا سکتے ہیں۔

عہدِ وسطیٰ میں آریائی زبانوں کے ارتقا کی گفتگو میں ماہرینِ لسانیات جین پراکرت اور ادبی پراکرت کی شناخت کے مرحلے میں پانچ شکلوں کی وضاحت کرتے ہیں۔شورسینی (शौरसेनी) ماگدھی، مہاراشٹری، اردھ ماگدھی اور پشاچی۔ان میں بہار کی زبانوں سے واقفیت کے لیے ماگدھی اور اردھ ماگدھی پراکرتوں کا مطالعہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔حالاں کہ مگہی زبان کی گفتگو میں بہت حد تک اردھ ماگدھی کے آثار پر تفصیلی بحث کی ضرورت کم پڑتی ہے۔

ماگدھی پراکرت کی اہمیت اس اعتبار سے سب سے زیادہ ہے کیوں کہ زبان کے طور پر ترقی

کی صورت سب سے زیادہ اسی حلقے میں سامنے آئی۔ قدیم مگدھ جن پد کی یہ زبان ہے۔ اس زبان کے ابتدائی استعمال کرنے والے لوگوں کو ڈاکٹر ہارن لے اور گریرسن نے بیرونی آریہ کے نام سے مشہور کیا۔ مگدھ اِن آریوں کا مرکز تھا۔ مہاتما بودھ کی سیاحت کا علاقہ کاشی، کوشل، ویدیہہ (विदेह) اور مگدھ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس پورے حلقے میں ماگدھی ہی بول چال کی زبان تھی۔ ماہرین کا قیاس ہے کہ مہاتما بدھ نے اپنے خطابات حقیقتاً ماگدھی میں ہی دیے ہوں گے اور بعد میں پالی تراجم میں انھیں محفوظ کیے گئے ہوں گے۔ مہاتما بدھ کی وفات کے بعد اُن کے اقوال کی تحریر اور تسوید کا کام کیا گیا۔ یہ سچّائی ہے کہ اس علاقے میں بعد میں پالی فروغ پا رہی تھی۔

اودے نارائن تیواری، سُنیتی کمار چٹرجی اور راہل سانکرتیائن نے اس موضوع کے سلسلے سے نہایت کارآمد گفتگو کی ہے، جس کے مطابق پالی، پراچیہ سے زیادہ مدھیہ دیش کی بنیادی زبان کے طور پر مستحکم تھی اور قرائن یہ ثابت کرتے ہیں کہ 'ش' کے بدلے دندانی 'س' کی آوازوں کا پالی میں استعمال اور 'ل' کی جگہ پہ 'ر' کا موجود ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ قدامت ماگدھی کے ساتھ ہے اور پالی کہیں نہ کہیں شورسینی حلقے میں پہنچتی ہے جس کا ارتقا بعد میں ہوا۔

قبل مسیح چوتھی صدی عیسوی میں ہی ماگدھی کا علاقہ سریوندی سے کوشی اور کرم ناشاندی سے کلنگ تک تھا (۱۰)۔ بودھ اور جین مذہب کے فروغ نے ماگدھی کو مستند اور معیاری زبان کے ساتھ ساتھ رائج الوقت مذہبی زبان کے بہ طور استحکام عطا کیا۔ اسی کا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ اشوک کی راج بھاشا بننے کا شرف ماگدھی کو ہی حاصل ہوا۔ ماگدھی کے قدیم نمونے تو اڑیسہ، بہار اور اتر پردیش کے اشوک لاٹ میں اب بھی محفوظ ہیں۔ اشوک کے دیگر کتبے بھی ملک کے مختلف علاقوں میں موجود ہیں لیکن ان کتبوں کی زبان کے بارے میں ماہرین کا تجزیہ ہے کہ اشوک کی زبان لازمی طور پر ماگدھی ہی ہوگی۔ وہ مگدھ میں پیدا ہوا اور اسی خطّے میں اُس نے حکومت کے اِنصرام کا آغاز کیا۔ بے شک اس کی مادری زبان ماگدھی تھی لیکن بودھ مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اس نے اپنی زبان کے مقابلے میں دوسری علاقائی زبانوں کی اہمیت کو بنیاد کا پتھر مانا تھا۔ اسی لیے اشوک کے کتبوں کی زبان میں حیرت انگریز طور پر بڑے پیمانے پر لسانی اختلافات ملتے ہیں۔

عہدِ اپ بھرنش میں ماگدھی

پراکرتوں کے مطالعے کے دوران اشوک کے کتبوں کے علاوہ رام گڑھ اور بودھ گیا کے آثار

میں ماگدھی کے نمونے دستیاب ہیں۔ دوسری سے چھٹی صدی عیسوی کے دوران ادبی پراکرتوں کے فروغ سے ایک نئی لسانی سرگرمی سامنے آتی ہے۔ بعض محققین چھ سو عیسوی کے بعد اپ بھرنش کا عہد تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ ادبی نمونوں کی فراوانی، علاقائی سطح پر الگ الگ زبانوں، بولیوں یا ذیلی بولیوں کے وجود کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ اپ بھرنش کے دستیاب نمونوں کے بارے میں ڈاکٹر اودے نرائن تیواری نے لکھا ہے:

> ''اپ بھرنش کا جو ادب ملتا ہے، اس میں لسانی اعتبار سے امتیازات یا اختلافات بہت کم ہیں۔ یہ مکمل سرمایۂ ادب ایک ہی لسانی تشکیل سے تعلق رکھتا ہے۔''(۱۱)

اس کے باوجود بعض ماہرینِ لسانیات نے اپ بھرنش کے تین علاقائی درجے متعیّن کیے ہیں ___ جنوبی، مغربی اور مشرقی (۱۲)۔ مشرقی اپ بھرنش اصل میں ماگدھی پراکرت سے ہی نکلی ہے۔ 'سرہ' (सिरह) اور 'کنہہ' کے دوہا کوش کی بنیاد پر ماہرین لسانیات نے ماگدھی کے لسانی امتیازات ان پہلوؤں سے واضح کیے ہیں جن سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سنسکرت سے ماگدھی اپ بھرنش کا رشتہ زبان کے طور پر بہت دور جا نکلتا ہے۔ چند امتیازات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

(i) سنسکرت کی مخلوط آوازوں کو غالباً سہل کرنے کے لیے بعض تبدیلیاں مشرقی اپ بھرنش میں دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً:

(الف) 'क्ष' کی آواز 'क्ख' میں بدل گئی۔ یعنی 'अक्षर' سے 'अक्खर' ہو گیا جو مغربی ہندی میں 'आखर' تک پہنچ گیا۔

(ب) 'त्व' کی آواز 'त्त' میں تبدیل ہو گئی۔ یعنی 'तत्त्व' سے 'तत्त' بنا۔

(ج) 'द्व' کی آواز سہل ہو کر दू / दु میں تبدیل ہوا۔ یعنی 'द्वार' بدل کر 'दुआर' بن گیا۔

(ii) سنسکرت آواز 'श' مشرقی اپ بھرنش میں بھی قائم رہا۔

(iii) جنسیت کے تعلق سے بالعموم کوئی بیداری نہیں ملتی۔ سنسکرت کا नपुंसक लिंग (Neutral Gender) ختم ہو گیا۔ تانیث کے صیغے بھی بہت کم استعمال میں آتے تھے۔ تذکیر کی کثرت ایک نئے لسانی طور کا پتا دیتی ہے۔

(iv) قدیم سنسکرت کے سابقے اور لاحقے کا استعمال تقریباً ختم ہو گیا اور نئے

سابقے اور لاحقے وضع کیے گئے جن کا بھرپور استعمال دکھائی دیتا ہے۔

(v) تتسم 'तत्सम' الفاظ کے مقابلے تدبھو 'तद्भव' کی طرف مشرقی اپ بھرنش کا جھکاو ایک مخصوص لسانیاتی نقطۂ نظر کا اشاریہ ہے۔ اسی سے پراکرت کے عمومی رجحان سے مشرقی اپ بھرنش (ماگدھی) کی لسانی مراجعت سمجھ میں آتی ہے۔ یہی اپ بھرنش جدید مگہی کی ماں کہی جاسکتی ہے۔

ہندآریائی کا عہدِ جدید اور مگہی

ہندآریائی زبانوں کے عہدِ جدید کو علاقائی بولیوں کے زبردست فروغ کا زمانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ سنیتی کمار چٹرجی کا خیال ہے کہ علاقائی زبانیں اپ بھرنش کے راستے سے بڑھتی ہوئی پراکرت میں ہی تبدیل ہوکر جدید ہندستانی زبانیں بن گئیں۔'' (۱۴) اپ بھرنشوں سے نکلنے والی زبانوں کا ایک عمومی خاکہ مندرجہ ذیل طریقے سے تیار کیا جاسکتا ہے:

(i) شورسینی اپ بھرنش —— برج بھاشا، کھڑی بولی

(ii) اردھ ماگدھی اپ بھرنش —— مشرقی ہندی کی بولیاں

(iii) مہاراشٹری اپ بھرنش —— مراٹھی

(iv) براچڈ اپ بھرنش —— سندھی

(v) ماگدھی اپ بھرنش —— مگہی، میتھیلی، بھوجپوری، بنگلہ، آسامی اور اُڑیا۔

۱۳ویں اور ۱۴ویں صدی تک اپ بھرنش میں تصنیف وتالیف کا کام ہوتا رہا۔ اس کے متوازی علاقائی بولیوں کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ دونوں کے رشتوں کی وضاحت اس بات سے ثابت ہوتی ہے کہ اکثر وبیش تر علاقائی بولیاں اپنے ابتدائی مرحلے میں اپ بھرنشوں سے گہرے طور پر متاثر رہی ہیں جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ علاقائی زبانوں کے فروغ کے مرحلے میں اب بھرنشوں نے موثر کارنامہ انجام دیا۔

بارھویں صدی عیسوی کے بعد کے عہد کے لسانی منظرنامے پر عمومی طور سے غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سنسکرت میں تصنیف وتالیف کا کام بھی سُست رفتاری کے ساتھ ہی سہی لیکن جاری ہے۔ ہندستان میں عہدِ سلطنت کا دور دورہ ابھی ہونے والا ہے۔ ہندستان چھوٹے چھوٹے راجاؤں میں منقسم تھا اور الگ الگ خطّوں میں علاقائی زبانوں کے بڑھنے کے واضح آثار بھی سمجھ میں

آ رہے تھے۔ سنسکرت اور اس کے بعد پراکرتوں کے زوال کا ایک سبب مرکزی طور پر ہندستان میں بڑی حکومتوں کا نہیں ہونا بھی مانا جا سکتا ہے۔ پال راجاؤں کے عہد تک مشرقی ہندستان میں مذہب اور تعلیم کے حوالے سے جو پشت پناہی تاریخ میں مندرج ہے، وہ بھی وکرم شلا اور نالندہ یونیورسٹیوں کے زوال کے بعد ۱۳ویں صدی کے بعد قصۂ پارینہ بن جاتا ہے۔ ان اداروں میں حالاں کہ اپ بھرنشوں یا دیگر علاقائی بولیوں کے لیے کوئی موافق ماحول موجود نہیں تھا لیکن لسانی ارتقا کے فطری اصولوں کے مطابق یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مذہبی تعلیم اور اشراف کی ذہن سازی کے لیے اگر پراکراتوں کا استعمال ہو رہا تھا تو عوامی سطح پر لازماً علاقائی بولیوں کے لیے گنجائشیں پیدا ہوئی ہوں گی۔ مسلم حکومتوں کے قیام نے یہ ماحول ازخود پیدا کر دیا کہ زبانوں کے بارے میں ایک لچیلا رویہ اپنایا جائے۔ مسلمان حکمراں عربی، فارسی اور ترکی کے ساتھ ساتھ علاقائی بولیوں کی طرف بھی حکومت کے کام کاج کے لیے لازماً بڑھے ہوں گے۔ یہیں سے ہندستانی سماج میں کثیر لسانی ماحول کی ابتدا ہوتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر اس ملک میں نہ صرف یہ کہ چھوٹی چھوٹی زبانوں کا رُکا ہوا ارتقائی سلسلہ تیز ہو جاتا ہے بلکہ یہ بھی سچائی ظاہر ہوتی ہے کہ قدیم زبانوں کے بارے میں بھی کوئی منافرت کا جذبہ نہیں ابھرتا ہے۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ۱۲ویں صدی عیسوی کے بعد سنسکرت اور پراکرت میں تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ یکسر تمام ہو جاتا۔

مگہی زبان کے آثار کی تلاش میں ابتدائی عہد میں کئی طرح کی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ یہ عام رواج ہے کہ عوامی زبان کی تحریر کے طور پر حفاظت شاید و باید ہی ہوتی ہے۔ مگہی کے ساتھ یہ بھی دشواری رہی کہ وہ جس خطّے کی جدید زبان یا عوامی زبان بنی، وہاں مذہب اور حکومت کے طفیل پراکرت دستاویزات اور آثار کو سب سے زیادہ محفوظ رکھا گیا۔ اس لیے ہند آریائی کے عہدِ جدید میں مگہی زبان کے آثار مقصود بالذّات صورت میں دستیاب نہیں اور ادبی روپ تو بالکل معدوم ہے لیکن دوسرے آثار میں شامل لسانی اجزا کی مدد سے اس عہد کی زبان کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

سدھ ادب میں مگہی کے آثار

آٹھویں صدی عیسوی سے ۱۲ویں صدی عیسوی کے دوران مشرقی حلقے میں جو لسانی آثار محفوظ ہوئے، انھیں ماہرین نے سدھ ادب کے طور پر پہچانا۔ عام طور سے اس سلسلے سے تین ادبی نمونوں کو زیر بحث رکھا جاتا ہے: (i) دوہا کوش (ii) چریہ گیت (iii) داکارنو

ان مجموعوں کے سلسلے سے لسانی ماہرین کے درمیان شدید اختلافات ہیں اور اِن اختلافات کی وجہیں بھی مختلف ہیں۔ ہر پرشاد شاستری جنھوں نے اس ادبی ذخیرے کے سلسلے سے ابتدائی کام کیے ہیں؛ وہ ان ذخائر میں بنگلہ کے ابتدائی آثار قبول کرتے ہیں (۱۵)۔ سنیتی کمار چٹرجی بھی بنگلہ کے حمایتی نہیں (۱۶)۔ آسامی زبان کے ماہر پروفیسر بروا (۱۷) (बरुआ) نے اور بنی کانت کاٹی (۱۸) نے سدھ ادب کو ابتدائی آسامی زبان سے ہم رشتہ قرار دیا ہے۔ پرہ راج (۱۹) اور پریہ رنجن سین (۲۰) کے مطابق اس سرمایۂ ادب میں اُڑیا کے نشانات موجود ہیں۔ ڈاکٹر جے کانت مشر نے (۲۱) اپنی تحقیق میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس سرمایۂ ادب کا تعلق میتھیلی سے ہے۔

اس تحقیقی خلفشار میں ایک عام آدمی کے لیے کوئی نتیجہ اخذ کرنا آسان نہیں لیکن اس تحقیقی مواد پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اس زبان کو مگہی کے آثار میں شامل کرنا تحقیقی نقطۂ نظر سے زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب اس سلسلے سے قابلِ توجہ ہیں، ملاحظہ ہوں:

(i) قدیم ماگدھی مگدھ جن پد کی زبان تھی اور یہ تقریباً تمام شمالی ہند میں پھیلی ہوئی تھی۔ سدھوں میں قدیم آدی سدھ سرہپاد کا تعلق نالندہ سے تھا جس کا علاقہ مگدھ جن پد میں ہی تسلیم شدہ ہے۔ ان کی زبان قدیم مگہی رہی ہوگی۔ راہل سانکرتیاین نے اسی وجہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ دوسرے سدھوں نے بھی اسی مگہی زبان کو شاعری کے لیے استعمال کیا ہوگا۔ (۲۲)

(ii) ۸۴ر سدھوں کی بود و باش کہاں کی تھی، اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ان میں سے بیش تر کا تعلق مگدھ علاقے سے تھا۔ جن کا رشتہ کسی دوسرے علاقے سے تھا، ان میں سے بھی اکثر مگدھ، نالندہ اور وکرم شلا میں ہی قیام پذیر تھے۔ اسی وجہ سے اکثر سدھوں کی زبان کو قدیم مگہی کے سرمایۂ ادب سے متعلق تسلیم کیا جاتا ہے۔

(iii) 'ورن رتناکر' جسے بالعموم میتھیلی ادب کا ابتدائی نمونہ مانا جاتا ہے، اس میں سدھوں کے بارے میں خلوص اور شرح کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ سدھوں کا تعلق مگدھ سے تھا اور میتھیلی زبان کے ادیب ان سے خود کو قریب محسوس کرتے تھے۔

(iv) 'دوہا کوش' جسے عام طور پر اپ بھرنش کی مثال کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے، اس کے لسانی تجربات قدیم مگہی سے اس قدر مماثلت رکھتے ہیں کہ زبانوں کے ارتقائی سفر میں انھیں اَن دیکھا نہیں کیا جا سکتا ہے۔

(v) سدّھوں کی زبان اور مگہی کے درمیان قواعد کے اعتبار سے جو ہم رشتگی ہے، اس کی تفصیل ماہرین نے اپنے جائزوں میں پیش کی ہے۔ چند الفاظ سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے' مثالیں ملاحظہ ہو: (۲۳)

(الف) भइला (सरह : चयपिद)

(ب) बुज्झफीले (सरह : चर्यापाद)

(ج) लागेलि (शबरपा : चर्यापद)

(د) देखिल (कण्हपा : चर्यापद)

اس تجزیے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنا نہیں چاہتے کہ سدھوں کی زبان پر دوسری زبانوں کے اثرات نہیں ہیں۔ قدیم بنگلہ، قدیم اُڑیا، قدیم آسامی، قدیم میتھیلی اور قدیم بھوجپوری کے اثرات سے سدھوں کا ادب خالی نہیں ہے۔ یہی نہیں، ہندی اور اردو زبانوں کے آغاز کے مباحث میں سدّھوں کے ادب کا جائزہ لازمی ہے۔ ان تمام زبانوں کے ارتقا کی کڑیاں جوڑتے ہوئے اس سرمایۂ ادب کی اہمیت اساسی ہے لیکن یہ سچائی ہے کہ قدیم مگہی کی شناخت اس سرمائیہ ادب پر سب سے گہری ہے۔ حالاں کہ عہدِ جدید میں داخل ہوتے ہوئے مگہی نے سدھوں کے سرمائے سے لسانی طور پر انحراف کیا اور جدید زبان کے طور پر فروغ کے مرحلے میں قدامت کے نہ جانے کتنے لباس تبدیل کیے لیکن اتنا یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ جدید مگہی زبان جن بنیادوں پر قائم ہے، ان کا سلسلۂ نسب ۸ ویں سے ۱۲ ویں صدی عیسوی تک سدھوں کے سرمایۂ ادب سے واضح طور پر متعلق ہے۔

قدیم مگہی کی لسانی خصوصیات

۱۔ عام طور سے جدید ہند آریائی کا یہ طور ہے کہ اسم کو آزادانہ طور پر قائم رکھتے ہیں لیکن اپ بھرنش کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اسماء کی مقصود بالذّات حیثیت معدوم ہو جاتی تھی اور اسم میں ہی اضافہ یا تخفیف کر کے بعض لسانی مشتقات قائم کر لیے جاتے تھے۔ زبان کی ترقی کے بعد، خاص طور سے قواعد کے فروغ سے یہ چلن بڑھا کہ اسماء کو آزادانہ حیثیت حاصل ہوئی۔ مگہی میں آج بھی عوامی سطح

پر اسماء کی انفرادی حیثیت سے انحراف کیا جاتا ہے:

(i) रामु अपने धरे हई।

(ii) राजा के बेटी 'राजे' धर

۲۔ ضمائر :مگہی میں عہدِ قدیم سے جو ضمیریں مستعمل ہیں، ان میں خاص طور سے مندرجہ ذیل اہم ہیں:

(i)	ہم	(ii)	توں	(iii)	اپنے		
(iv)	اِسی	(v)	اُو	(vi)	جے		
(vii)	جسے	(viii)	کئی	(ix)	کون		
(x)	کا	(xi)	کچھ				

۳۔ زمانۂ حال کے صیغے اس طرح سے مستعمل ہیں:

(i) وہ ہے (اردو۔ ہندی) —— اُو ہَے (مگہی)

(ii) میں ہوں (اردو۔ ہندی) —— ہم ہی (مگہی)

(iii) تم راج کرو تو ہم کو خوشی ہوگی (اردو۔ ہندی)
تو راج کرے تو ہمرا بڑی کھوسی ہوے (مگہی)

۴۔ افعال کے استعمال میں ایک انضمامی صورت کا پتا چلتا ہے۔ یہ عام طور سے بہار کی اکثر وبیش تر بولیوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ مگہی کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

(i) استے —— رہتے ہوئے

(ii) آئل —— آیا

(iii) کرہو —— کرو

(iv) کہب —— کہوں گا

(v) گیل —— گیا

(vi) چڑھل —— چڑھا

(vii) دیکھہو —— دیکھو

قدیم مگہی کا سرمایۂ الفاظ

قدیم مگہی کے سرمایۂ الفاظ کے مطالعے کے دوران یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اپ بھرنش سے ارتقا کے مرحلے میں مگہی نے اپنے لیے جو سرمایۂ الفاظ وضع کیا اس میں سنسکرت روایتوں سے الگ اطوار صاف صاف نظر آتے ہیں۔ بے شک اس کا آغاز مذہبی ضرورتوں اور ایک معنیٰ میں مذہبی منافرت سے ہوا ہوگا۔ جین مُنیوں نے خاص طور سے اس سلسلے سے پیش قدمی کی ہوگی کیوں کہ اپ بھرنش میں تتسم الفاظ کی عدم موجودگی کا، یہ واضح جواب ہے۔ یہ بھی قابلِ ذکر بات ہے کہ اپ بھرنش میں عوامی زبان اور ضرورتوں پر زور تھا۔ اس لیے سنسکرت کے مقابلے میں تدبھو کے اثرات زیادہ قائم ہوئے۔ اسی لیے مگہی کے سرمایۂ الفاظ پر گفتگو کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشیں ہونی چاہیے کہ دیہی اور غیر اشراف طبقے میں جس اپ بھرنش کا فروغ ہوا تھا، اسی سے تمام علاقائی بولیاں ترقی پانے میں کامیاب ہوئیں۔ اس سلسلے سے ہیم چند کی بنیادی کتاب ''پراکرت قواعد'' کے صفحات اس بات کے گواہ ہیں کہ مگہی کس طرح اپنے الفاظ پراکرت سے ردّوبدل کرتے ہوئے نئے راستوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ذیل میں اس سلسلے کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

پراکرت	مگہی	ہندی اردو
अन्त्राडी	अँतड़ी	अँतड़ी
कुम्पल	कोंपल	कोंपल
खोडि	खोंट	खाट (दोष)
ठाउ	ठाँव	ठाँव
दुवार	दुआरि	दुआर (द्वार)
पाओ	पाँव	पाँव
पिआस	पिआस	यास (पिपासा)(۲۴)

ہیم چند کی ''دیسی نام مالا'' میں بھی ایسے بہت سارے الفاظ ہیں جو ذرا سی تبدیلی سے مگہی اور پھر اردو ہندی میں مستعمل ہوئے ہیں۔ ایک مختصر فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔(۲۵)

پراکرت	مگہی	ہندی اردو
उफसत्थो	उसट्ठ	उफसठ

ओसरिआ	ओसारा	ओसारा (अलिन्द)
झंखो	झँखना	झखना
झंटी	झोंटा	झोटा
झलुसिअँ	झुलसना	लुसना (दग्धम्)
दोरो	डोरो	डोरा (दोरकम्)

سدھ ادب سے متعلق مختلف کتابوں میں اب بھرنش کی ایسی مثالیں موجود ہیں جنھیں ہم مگہی اور پھر موجودہ اردو ہندی سے جوڑ سکتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں (۲۶):

اپ بھرنش	مگہی	ہندی اردو معنیٰ
आलमाल	आलमाल	धन
उजोली	अंजोर	प्रकाश
कहेमि	कहि हम	मै कहता हूँ
कहेमि	केयारी	छोटा खेत
कोइल	कोइल	कोयल
खाण्टि	खाटी	अच्छी
गमारि	गमार	गँवार
जीवमि	जीवी	जीता हूँ
तुम्ह	तूँ	तुम
थोरय	थोर	थोड़ा
दुब्बरि	दुब्बेर	दुबला
पिबई	पियइ	पीता है

جدید مگہی کے آغاز کا پس منظر

یہ بات مکمّل طور پر طے شدہ نہیں کہ جدید مگہی کس عہد میں اپنی موجودہ شکل میں پہلی بار سامنے آئی۔ عہدِ وسطیٰ کی آریائی زبانوں کی تاریخ کے مطالعے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ ۷ویں صدی کے وسط تک ماگدھی کی ذیلی زبانیں الگ الگ نہیں ہوئی تھیں۔ چینی سیّاح، ہیون سانگ ساتویں

صدی کے نصف اوّل میں ہندستان آیا تھا۔ اس کا مشاہدہ ہے کہ اس عہد میں بہار، بنگال اور مغربی آسام میں ایک ہی زبان بولی جاتی تھی (۲۷)۔ ماگدھی کے جدید عہد کی زبانوں کے ماہرین نے لسانی سرمایے کے تجزیے کے بعد جو نتائج اخذ کیے ہیں، اس کے مطابق مشرقی ماگدھی، اپ بھرنش کے مختلف روپ ـــــ مگہی، میتھیلی، بھوجپوری، بنگلہ، اُڑیا اور آسامی وغیرہ نے آٹھویں سے گیارہویں صدی عیسوی کے درمیان اپنی انفرادی شناخت مکمّل کر لی ہوگی۔ اس دور میں مختلف آریائی زبانوں میں تعمیر و تشکیل کی رفتار بہت تیز تھی۔ نئی زبانیں اپنی شکل لے رہی تھیں جس کی وجہ سے مختلف زبانوں میں لسانی امتیازات بھی پیدا ہو رہے تھے۔ آٹھویں سے گیارہویں صدی کے درمیان مشرقی زبانوں کے ارتقا کی سمت و رفتار کا تعیّن کرتے ہوئے ڈاکٹر سمپتی آریانی نے اپنے دل چسپ مشاہدات ان لفظوں میں پیش کیے ہیں:

> ''आधुनिक भारतीय आर्यभषाएँ आरम्भिक स्थिति में थीं। इन भाषाओं की परस्पर भिन्नताएँ लक्षित हो रही थीं। भाषाओं की व्यक्तिगत विशेषताएँ निर्मित हो रही थीं, पर अभी इन विशेषताओं की पूर्ण स्थापना नहीं हो पाई थी। यह ऐसा काल था, जब आधुनिक भारतीय भाषाएँ पीछे मुड़कर मध्यकालीन भारतीय आर्यभाषा की ओर सहारा और सम्मति के लिए देख लिया करती थीं।'' (۲۸)

پورب کے خطّے میں بارہویں صدی سے ہی اپ بھرنش بالخصوص ماگدھی اپ بھرنش کے نئے روپ سامنے آنے لگتے ہیں۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ مشرق میں لسانی ارتقا کا یہ عمل ہندستان کے مغربی حصّے سے تیز تر ہوا جس کے نتائج کے طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ تیرھویں صدی عیسوی میں پراچیہ حلقے کی ماگدھی سے نکلی ہوئی کئی زبانوں کا آزادانہ وجود ثابت ہو جاتا ہے۔ چودھویں صدی کے آغاز میں گجراتی، مراٹھی، بنگلہ، آسامی، اُڑیا، میتھیلی وغیرہ زبانوں میں امتیازی طور پر ادب کا فروغ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ پورب کی زبانوں پر غور کریں تو چودھویں صدی میں میتھیلی ادب کے جن دو نمونوں کو اہمیت کے ساتھ تذکرے میں رکھا جاتا ہے، اُن میں اہم ہیں:

(i) ورن رتناکر (جیوتی ریشور ٹھاکر کی کتاب جو چودھویں صدی عیسوی کے نصف اوّل

میں لکھی گئی)

(ii) کیرتی لتا (چودھویں صدی کے اختتام اور پندرھویں صدی کے نصف اوّل کو ودیاپتی کا زمانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کتاب کو متھیلی کے علاوہ 'اوہٹ' زبان کا بھی نمونہ مانا جاتا ہے)۔

اسے سوئے اتفاق کہنا چاہیے کہ جس عہد میں ماگدھی اوراپ بھرنش سے تشکیل شدہ زبانوں میں ادب کے نمونے حاصل ہورہے تھے، اس عہد میں مگہی کے پاس ادب کا کوئی ٹھوس روپ دکھائی نہیں دیتا۔ چودھویں صدی عیسوی کے بعد اگر ریاستِ مگدھ کے احوال پر نظر رکھیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مگدھ کے لیے وہ زمانہ بے حد انتشار کا تھا۔ قدیم عہد کی مہتم بالشان روایات کے باوجود چودھویں صدی کے بعد مگدھ کا اقتدار داخلی اور بیرونی اسباب سے بالکل بکھراو کے عالم میں تھا۔مگدھ کے علاقے سے بڑی تعداد میں اہلِ علم جسم وجان اور تعلیمی آثار کی حفاظت میں نیپال کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔ اپنے ساتھ وہ جن مخطوطات کو لے جاسکتے تھے، وہ لے تو گئے ہوں گے لیکن وقت کے سفاک ہاتھوں سے ان کی حفاظت آسان نہیں تھی۔اسی وجہ سے مگہی زبان کے آثار ادب کے روپ میں چودھویں صدی کے آس پاس کے بعد سے دکھائی نہیں دیتے۔آثار کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہرگز یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ مگہی زبان میں اس عہد میں ادب کا فروغ نہیں ہوا ہوگا۔ ہمارا ماننا ہے کہ لازمی طور پر خطّۂ مشرق میں جو دوسری زبانیں پیدا ہورہی تھیں، اُن کے ادبی سرمایے کے متوازی مگہی میں بھی ادبی آثار پیدا ہوئے ہوں گے لیکن تاریخ کے دفینوں میں وہ کہاں سما گئے، اب اس کی تلاش ناممکن ہے۔

جدید مگہی کا فروغ

عہد جدید میں مگہی زبان کے علاقے کی شمالی سرحد گنگا ندی کے اُس حصّے تک پہنچتی ہے جس کے مقابل 'ترہت' یعنی ویشالی اور اس کے بعد مظفر پور، سیتامڑھی اور دربھنگا آباد ہیں۔اس حلقے میں بجیّکا، میتھیلی اور بھوجپوری زبانیں بولی جاتی ہیں۔مگہی کے علاقے کے مغرب میں قدیم شاہ آباد اور پلامو میں بھوجپوری بولی جاتی ہے۔شمال مشرقی سرحد پر مونگیر، بھاگلپور اور سنتھال پرگنہ آباد ہیں جہاں انگیکا کا رواج ہے۔جنوب مشرقی حصّے میں قدیم مان بھوم اور مشرقی سنگھ بھوم ہیں جہاں قبائلی زبانوں کے ساتھ بنگلہ کے اثرات ہیں۔مگہی کے جنوب میں موجودہ جھارکھنڈ کی زبان سدانی خاص طور سے اہم ہے۔ان سرحدوں سے گھرے ہوئے علاقے میں مگہی زبان بولی جاتی ہے جسے آدرش مگہی کہا جاتا

ہے۔

۱۹۰۱ء کی مردُم شماری کے مطابق جارج گریرسن نے مگہی بولنے والوں کی کُل تعداد پینسٹھ لاکھ بتائی تھی۔اس کی تفصیل انھوں نے اس طرح پیش کی تھی:

(۱) مگہی علاقے میں مگہی بولنے والے	62,39,967
(۲) غیر مگہی علاقے میں مگہی بولنے والے	2,31,485
(۳) آسام کے نشیبی علاقے کے مگہی بولنے والے	33,365
	65,04,817

۱۹۵۱ء کی مردُم شماری میں ایک اندازے کے مطابق ۹۸ رلاکھ کے قریب مگہی بولنے والوں کی تعداد ہوگئی جس کی بنیاد پر تقریباً ۲۳ رفی صدی بہار کی آبادی کو مگہی بولنے والا تسلیم کیا گیا ہے(۲۹)۔اس تعداد میں بلاشبہ آس پاس کی زبانوں کے اثرات موجود ہوں گے۔ یہ تناسب کم وبیش آج کے اعتبار سے بھی درست ہونا چاہیے۔

مگہی زبان کے عہد حاضر کے مختلف اطوار کے بارے میں ڈاکٹر سمپتی اریانی نے جناب کرشن دیو پرشاد جو مگہی زبان کے ماہر تھے،اُن کی اطلاع کی بنیاد پر پانچ اقسام کی مگہی بولیوں کی تفصیل پیش کی ہے جو مندرجہ ذیل ہے:(۳۰)

(i) آدرش مگہی: یہ گیا ضلع میں بولی جاتی ہے۔

(ii) شدھ مگہی: یہ راج گیر سے لے کر بہار شریف کے اتر چار کوس بینا اسٹیشن تک اور پٹنہ ضلع کے بعض حصّوں میں بولی جاتی ہے۔

(iii) ٹھلا مگہی: مکامہ، بڑھیا، باڑھ، لکھی سرائے کا شمالی حصّہ، گدھور اور پورب میں فتوحہ تک بولی جاتی ہے۔

(iv) سون ٹٹیا مگہی (सोन टटिया): سون ندی کے کنارے کنارے پٹنہ اور قدیم گیا ضلعوں میں بولی جاتی ہے۔

(v) جنگلی مگہی: راج گیر، گیا اور چھوٹا ناگ پور کے جنگلوں میں بولی جاتی ہے۔

اس تفصیل سے وہ کہاوت بھی پایۂ ثبوت تک پہنچ جاتی ہے جس میں یہ مانا جاتا ہے کہ 'تین کوس پر پانی بدلے سات کوس پر بانی'۔مگہی زبان کے بھی الگ الگ روپ اصل میں زبان کے اس

فطری ارتقا کی تفصیل بتاتے ہیں جس سے عوام کے درمیان زبان ذریعۂ اظہار اور ترسیل کا ذریعہ بنتی ہے۔اسی لیے گاؤں گاؤں اور ایک ضلع سے دوسرے ضلع تک پہنچتے ہوئے زبان اپنی شکل بدل چکی ہوتی ہے۔ان تبدیلیوں میں خاص طور پر، تلفظ، سرمایۂ الفاظ اور قواعد کا اختصاص بنیادی ہے۔علاقائی اعتبار سے زبان کے امتیازات واضح ہونے میں جو خاص بات نظر آتی ہے، مگہی کے حوالے سے ڈاکٹر اریانی نے قدیم پٹنہ ضلع کی دیہی اور شہری زبان کے امتیازات پر بحث کرتے ہوئے نہایت کارآمد نتائج اخذ کیے ہیں۔تفصیل ملاحظہ ہو:

> ''पटना जिले के देहातों और पटना नगर की भाषा में ही स्पष्ट भेद दीख पड़ता है। पटना नगर के आसपास की आदर्श मगही में उत्तर पश्चिम प्रान्तों के मुहावरों का मिश्रण है। मुगलकालीन नवाबों और पश्चिम के निवासी खत्रियों और अग्रवालों के पटना में बस जाने के कारण यहाँ की मगही इनकी भाषा से प्रभावित हो गई है। एक ओर उसपर शुद्ध उर्दू–भाषा (और) मुसलमानों का प्रभाव दीखता है, दूसरी ओर पश्चिम के निवासियों की खड़ी बोली का। इसके विपरीत पटना जिले के ग्रामीण की मगही इन बाह्य प्रभावों से बची है। गया जिले की मगही की शुद्धता बहुत अधिक सुरक्षित है।'' (۳۱)

ماہرین نے مگہی زبان کی بنیادی شکل کے لیے گیا ضلع کو جو مرکزیت بخشی، اس کا بنیادی سبب عام طور پر ذیل میں ظاہر کیا جا سکتا ہے:

(i) قدیم گیا ضلع پر بیرونی اثرات کم سے کم پڑے۔

(ii) ہندو اور بودھ مذاہب کے ثقافتی مرکز کی حیثیت سے گیا کی پہچان رہی ہے۔عہدِ جدید میں تبدیلیوں کے باوجود مذہبی اور ثقافتی حیثیت قائم رہی جس کی وجہ سے عوامی اور لسانی روایات کم وبیش محفوظ رہ سکیں۔

(iii) قدیم گیا ضلع کا حلقہ مگہی بولنے والے خطّے کے مرکز میں واقع ہے۔

گذشتہ سطور میں اس موضوع سے گفتگو کی جا چکی ہے کہ مگہی، بھوجپوری یا میتھیلی زبانیں

سب کی سب ماگدھی پراکرت اور ماگدھی اپ بھرنش سے برآمد ہوئی ہیں۔ اس اعتبار سے لسانی اشتراک کا بھی کوئی نہ کوئی ماحول ضرور رہا ہوگا۔ گریرسن نے ان زبانوں کو ''بہاری بولیوں'' کے طور پر پہچانا ہے۔ زبان اور قواعد کے واقعتاً متعدد روپ ہوں گے جن کی بنیاد پر ان زبانوں میں اشتراک یا امتیاز کی صورت قائم ہوئی ہوگی۔ اسی لیے ماہرین لسانیات ان زبانوں کے لین دین، اشتراک، امتیاز اور اختلافات کو بار بار موضوعِ بحث بناتے رہے ہیں۔ حالاں کہ گریرسن کے اس فارمولے کا اور بہاری بولیوں کی یکجائی کے تصوّر کو مختلف ماہرین نے غیر علمی اور نا قابلِ قبول تسلیم کیا ہے۔ ان کے نتائج اس طرح سامنے آتے ہیں:

(i) بہار کی تین بولیوں ۔مگہی، میتھیلی اور بھوجپوری کی لسانی خصوصیات اور رنگارنگی کو نظر میں رکھتے ہوئے کسی ایک خانے میں انھیں سمجھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

(ii) بعض ماہرینِ لسانیات نے عجلت پسندی یا لسانی عصبیت کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مگہی کا آزادانہ وجود نہیں ہے بلکہ یہ میتھیلی کی ذیلی زبان ہے۔

(iii) میتھیلی، مگہی اور بھوجپوری کے درمیان لسانی اعتبار سے شدید امتیازات بھی ہیں۔ ایسی صورت میں ان کی بعض خصوصیات کے اشتراک کی وجہ سے انھیں بہاری بولیاں سمجھنا اور ایک ہی زبان ماننا مناسب نہیں بلکہ ان کے آزادانہ وجود پر غور کرنا زیادہ مناسب ہے۔ ٹھیک اسی طرح کے مسائل اردو اور ہندی کے ارتقائی مراحل میں سامنے آئے۔ کھڑی بولی کی بنیاد مانتے ہوئے یہ بات تو حقیقی ہے کہ دونوں زبانوں کا منبع ایک ہے لیکن تاریخی ارتقا کے سفر میں ان کے بیچ واضح طور پر تبدیلیوں کا ایک مسلسل سلسلہ ہم آہنگ ہوتا چلا گیا جس سے زبانوں کا آزادانہ وجود قائم ہوا۔ آج اردو اور ہندی کو الگ الگ جدید ہند آریائی زبانوں کے طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح مگہی، بھوجپوری اور میتھیلی زبانوں کو آزادانہ طور پر سمجھنا لازم ہے۔

مگہی زبان میں شعر و ادب کا سرمایہ (عہدِ جدید میں)

گذشتہ سطور میں اس موضوع پر گفتگو کی جا چکی ہے کہ مگہی زبان کی قدامت اور لسانی اعتبار

سے امتیازات کے باوجود کیوں عہدِ وسطیٰ میں مگہی زبان کے ادبی آثار دستیاب نہیں ہوتے۔ ہندی اور اردو کے فروغ نے بھی ان بولیوں کو پہچان کے مسائل سے دوچار کیا۔ بھوجپوری اور مگہی اس اعتبار سے بہت متاثر ہوئیں کیوں کہ ان کے ابتدائی ادب کو اکثر وبیش تر ہندی یا کبھی کبھی اردو کے خانے میں رکھ کر زیادہ سے زیادہ انھیں عوامی بول چال کی زبان قرار دیا گیا لیکن سچائی یہ ہے کہ مگہی اور بھوجپوری دونوں عوامی یا لوک بھاشا کے طور پر اس عبوری دور میں اپنی زندگی بچانے میں کامیاب ہوئیں۔ ان زبانوں کے حاصل شدہ ادبی سرمایے کے ابتدائی دور کی پہچان کرتے ہوئے ناچار لوک گیت اور لوک ادب کے سرمائے کو موضوعِ گفتگو بنانا ہوتا ہے۔

مگہی زبان کے لوک ادب کی اہمیت کے خاص اسباب تہذیبی اور لسانی دونوں ہیں۔ مگدھ کے وسیع وعریض علاقے کی زندگی کی رنگارنگ اور جانی انجانی تصویروں کی وجہ سے یہاں کے لوک ادب کی اہمیت گوں ناگوں ہے۔ خاص طور سے ان میں لوک گیت، لوک گاتھا، لوک کتھا اور دورِ متاخرین کے تحریری ادب کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی عہد یا لوک روایت میں بالعموم زبانی مواد سامنے ہوتا ہے۔ آخری زمانے میں تحریر کے مواقع ہاتھ آتے ہیں۔

مگہی لوک گیت

مگہی لوک گیت کے انتخابات تیار کرنے والے مختلف زبانوں کے ماہرین رہے ہیں۔ ہندستان میں ایسے تحریری ادب کو محفوظ کرنے کے لیے انگریزوں نے پہل کی تھی۔ مگہی ہی نہیں، دوسری علاقائی زبانوں کے لوک گیتوں کو مختلف انگریز محققین نے جمع کیا۔ خاص طور سے ۱۸۸۴ء میں جارج گریرسن نے "Some Bihari Folk Songs" کے عنوان سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ کے رسالے میں جو مضمون لکھا، اس کے ساتھ بھوجپوری اور مگہی کے لوک گیت شامل تھے جن کا انگریزی ترجمہ بھی اس مضمون کے ساتھ موجود تھا (۳۲)۔ گریرسن نے آگے بھی اسی طرح معدوم چیزوں کو عوامی حافظے سے نکال کر تحریر اور ترجمے کی شکل میں پیش کیا۔ ہوج فریز، جون بیمس، اے جی شیریف اور ڈبلو جی آرچر وغیرہ نے مشرق کے لوک گیتوں کے انتخابات تیار کیے جن سے انھیں پائیداری ملی۔

ہندستانی افراد نے بھی لوک گیتوں کے انتخاب کے سلسلے سے خاص توجہ کی۔ رام نریش ترپاٹھی، دیویندر ستیارتھی، کرشن دیو اپادھیاے، درگا شنکر پرساد سنگھ، رام اقبال سنگھ راکیش وغیرہ نے لوک گیتوں کے انتخابات تیار کرنے میں نہایت کارآمد کام انجام دیے ہیں۔ بہار راشٹر بھاشا پریشد،

پٹنہ نے ڈاکٹر وشوا ناتھ پرساد کا ترتیب دادہ مجموعہ 'مگہی سنسکار گیت' شایع کیا جس میں ایک سو گیتوں کو شامل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سمپتی اریانی نے ''مگہی لوک ساہتیہ'' میں کچھ گیت جمع کیے ہیں۔ اس تحریری مواد کی بنیاد پر مگہی کے لوک گیتوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

مگہی کے لوک گیتوں کے سرمایے پر توجہ دینے سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان میں مندرجہ ذیل اقسام کے مواد موجود ہیں:

(i) سنسکار گیت —— سوہر، منڈن، جنیو، شادی وغیرہ

(ii) کریا گیت —— جنسار، روپنی وغیرہ۔

(iii) رِتو گیت —— ہولی، چیتی وغیرہ۔

(iv) دیو گیت —— دیوی دیوتاؤں سے متعلق، گرام دیوتا سے متعلق۔

(v) بال گیت —— لوری، کھیل گیت، چک چندا وغیرہ۔

(vi) متفرقات —— جھومر، برہا، گودنا، الچاری، نرگُن وغیرہ۔

ان لوک گیتوں سے سماج کی تہذیبی روایت، آپسی تعلقات، قصہ گوئی کی صفات کے ساتھ ساتھ تہذیب و تمدن اور مذہبی صورتِ حال کا واضح طور پر پتا چلتا ہے۔ ان کے مطالعے سے بڑے پیمانے پر تہذیبی اقدار اور رسوم و رواج، گاؤں اور گھر کی زندگی اور ان سب پر بھائی چارے کا اضافہ ایسے امور ہیں جن سے مگہی کے لوک گیتوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ایک اور خاص بات یہ دیکھنے کو ملتی ہے کہ ان گیتوں میں طنز و ظرافت کی چاشنی بہ درجۂ اتم موجود ہے جن سے سماج کے حسِ مزاح کا پتا چلتا ہے۔ دو متفرق مثالیں ملاحظہ ہوں:

सासू लुटवलन रूपइया, ननदी ढेउआ देलन हे।

गोतिनी लुटवलन गउआ, गोतिआ धर सोहर हें।

सासु जे उठलन गावत, ननदी बजावइत हे।

गोतिनी जे उठलन विसमाथल, गोतिया धर सोहर हे। (۳۳)

ए राजा मिलिए जुलिए त बन्हलड मोटरिया।

खोलइत बोरिया काहे अगसर हे ।। (۳۴)

مگہی لوک گاتھا

انگریزی میں Popular Song اور Ballad کے نام سے اسے موسوم کیا جاتا ہے۔ قدیم لوک گاتھائیں ہر زبان میں شاعری کے نمونوں میں ہی محفوظ ہیں۔لوک گیتوں سے انھیں اس اعتبار سے الگ کرتے ہیں کیوں کہ قصّہ گوئی کی طویل روایتوں سے ان کا تعلق ہے۔ ہندستان کی سنسکرت کی مذہبی کتابیں بالخصوص وید، برہمن گرنتھ، پُران، اُپنشد، مہابھارت اور راماین وغیرہ اسی سلسلے کی تحریریں ہیں۔لوک گاتھاؤں میں بنیادی اہمیت زبانی روایت کی تھی لیکن رفتہ رفتہ تحریری مواد بھی جمع ہونے لگا۔

مگہی لوک گاتھاؤں کی درجہ بندی کرتے ہوئے ماہرین نے (i) آلہا (ii) لورکائن (iii) کنوروجئے (iv) چھتری گھوگھلیا (v) ریسما (vi) شوبھ نایک (vii) سارنگا سلابرج (vii) راجادھولن (ix) سنی بہولہ (x) سورٹھی (xi) راجا بھرتھری (xii) راجا گوپی چند (xiii) نیٹوادیال سنگھ وغیرہ سلسلۂ خیال کی پہچان کی ہے۔ان لوک گاتھاؤں میں مگہی علاقے کی تہذیب اور ثقافت کی نیرنگی اور وسیع المشربی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ان قصوّں میں مگہی زبان اور علاقے کے دوسرے خطّوں سے تعلق کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

مگہی لوک کتھا

لوک کتھائیں انھی علاقوں میں بڑی تعداد میں دیکھنے کو ملتی ہیں جن علاقوں میں قدیم تہذیب وتمدن کے آثار پائے جاتے ہیں اور جہاں مذہبی تہذیب اور تاریخی اعتبار سے تعلیم اور تدریس کے کچھ بنیادی کام دکھائی دیتے ہیں۔لوک کتھائیں اصل میں عوامی تخیلی زور اور جودت طبع کا مظہر ثابت ہوئی ہیں۔ان میں بے پایاں عوامی تجربات اور ذہانتوں کا وجود دیکھنے کو ملتا ہے۔قوتِ تخیل کے ساتھ ساتھ یہاں عوامی سطح پر غم اور خوشی یا رسومیات کی جھلکیاں بڑے پیانے پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔کبھی کبھی ان لایعنی قصوں میں بادشاہ یا نظام وقت پر زبردست غم وغصّے کا اظہار بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔غور کریں تو قصّہ گوئی کی نہایت ٹھوس روایت مگہی کی ان لوک کتھاؤں میں موجود ہے۔ان میں سے کچھ شعری نمونے مثال کے طور پر حاضر ہیں(۳۵) :

बढ़ई बढ़ई खूँटा चीर, खूँटा में दाल हे।

का खाउफँ का पीउफँ, का परदेस जाउफँ ?

राजा–राजा बढ़ई डाँट, बढ़ई न खूटाँ चीरे,

खूँटा में दाल हे, का खाउफँ, का पीउफ

का ले परदेस जाउफँ।

یہ تمام لوک کتھائیں عوامی افادہ کے لیے لکھی گئیں اور انھیں پڑھنے والے اس استفادے کے نقطۂ نظر ہی سے مطالعہ کرتے ہیں۔

مگہی تحریری مواد

مگہی زبان کے ماہرین نے عوامی بول چال میں موجود مگہی کے محاورات اور ضرب الامثال کی بڑی ٹھوس فہرست سازی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ان میں بہار کی دوسری علاقائی زبانوں میں — مشترک طور پر شامل محاورات وضرب الامثال بھی ہیں۔ اس کے باوجود الفاظ اور طریقۂ استعمال کے نقطۂ نظر سے مگہی کی اپنی صفات واضح ہو جاتی ہیں۔

جدید تر زبان کے طور پر مگہی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں بڑی تعداد میں شاعر اور نثر نگار دکھائی دیتے ہیں۔ کرشن دیو پرشاد، رماشنکر شاستری، رام پرشاد، پون کمار، رام سنگھاسن ودیا بھارتھی، شری کانت شاستری، گوردکھ پرشاد سودے، جگدیش نارائن چوبے، رام نریش پاٹھک اور متھرا پرشاد نوین جیسے شاعر اور نثر نگاروں نے جدید زبان کے طور پر مگہی کو معیار و مرتبہ عطا کرنے میں کامیابی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ ऋग्वेद, खण्ड–1, पृ0 510, सं0 श्रीरामशर्मा आचार्य

۲۔ Magadhan Literature : Hara Prasad Shastri, Colcutta, 1923

۳۔ जयन्तीवेद, खण्ड–1, पृ0 224, सं0 श्रीराम आचार्य

۴۔ जयन्ती–स्मारक ग्रंथ : बिहार राष्ट्रभाषा परिषद, पटना, 'वैदिक काल का बिहार', पृ0 47–50

۵۔ डा. सम्पत्ति अर्याणी : मगधी भाषा एवं साहित्य, बिहार राष्ट्रभाषा परिषद्, पटना, प्रथम संकरण, 1976, पृ0 4

۶ـ पूवोक्त, पृ0 – 5

۷ـ J. N. Samaddar : The Glory of Magadh,

۸ـ Mc Donald : History of Sanskrit Literature, 1928, p-24.

۹ـ S. K. Chetterjee : Indo Aryan and Hindi, p-52-53

۱۰ـ पुरातत्त्व निबंधावली : राहुल सांकृत्यायन (मागधी का विकास) पृ0 188

۱۱ـ डा. उदय नारायण तिवारी : हिन्दी भाषा का उद्‌गम और विकास, पृ0 123

۱۲ـ Dr. Yagade : Historical Grammar of Apbharansha, (Introduction), p-95

۱۳ـ डा. सम्पत्ति अर्याणी ऋ पूवेक्त, पृ0–26–27

۱۴ـ S.K. Chatterjee : Ibid, p-105

۱۵ـ 'बैद्धगान और दोहा', हरप्रसाद शास्त्री, बंगीय साहित्य परिषद, कलकत्ता, 1919

۱۶ـ S. K. Chatterjee, Ibid, 105-106

۱۷ـ Barua : Early History of Kamrup, p-318

۱۸ـ Banikanta Kakati : Formation of Assamese Language, p-8-9

۱۹ـ Prahraj : OCP, VI, p-371-381

۲۰ـ Priya Ranjan Sen (B.C.) Law Commemoration, Vol II, p-897 FF.

۲۱ـ Jaykanta Mishra : A History of Maithili Literature, Vol-I

۲۲ـ राहुल सांकृत्यायन : पुरातत्त्व निबंधावली, पृ0 – 137

۲۳ـ सम्पत्ति अर्याणी : पूर्वोक्त, पृ0–30

۲۴ـ हेमचन्द्र : प्राकृत व्याकरणऋ सम्पत्ति अर्याणी : पूर्वोक्त, पृ0 50–51

۲۵ـ अर्याणी : पूर्वोक्त, पृ0 51

۲۶ـ पूर्वोक्त, पृ0 51–53

۲۷ـ Origin and Development of Bengla Language; Introduction

(52), p-91

۲۸ـ अर्याणीः पूर्वोक्त, पृ0 56

۲۹ـ हिन्दी साहित्य का वृहत इतिहास, भाग–16, मगही लोक साहित्य, पृ0 39–81

۳۰ـ अर्याणी : पूर्वोक्त पृ0–83 (पाद्–टिप्पणी)

۳۱ـ पूर्वोक्त –पृ0–84

۳۲ـ JRAS, Calcutta, Vol-16, (1884), p-196

۳۳ـ अर्याणीऋ पृ0 183

۳۴ـ पूर्वोक्त पृ0 181

۳۵ـ पूर्वोक्ति पृ0 392

☆☆☆

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام

تذکرہ 'آبِ حیات' پر پہلی تحریر

'آبِ حیات' محمد حسین آزاد کا ایسا نثری شاہکار ہے جو سوا سو سال گزرنے کے باوجود اپنی اہمیت اور تر و تازگی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ لہٰذا کتاب کا نام 'آبِ حیات' اسم بامسمیٰ کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اکتوبر یا نومبر ۱۸۸۰ء میں عمل میں آ چکی تھی[۱]۔ اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی اس زمانے کے اخبارات میں اس کے حق میں اور مخالفت میں مضامین اور تبصرے لکھے جانے شروع ہو چکے تھے۔ اس حوالے سے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں منشی ذکاء اللہ، سرسید احمد خان اور الطاف حسین حالی کے مضامین اور تبصرے شائع ہوئے۔ منشی ذکاء اللہ کا تبصرہ 'تذکرہ آبِ حیات' کے عنوان سے ۱۸ دسمبر ۱۸۸۰ء میں، سرسید احمد خان کا تبصرہ جنوری ۱۸۸۱ء اور اسی تبصرے کے بعد الطاف حسین حالی کا تبصرہ 'آبِ حیات' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان کے علاوہ ۲۴ مارچ ۱۸۸۱ء کو 'صادق الاخبار' میں ایک خط شائع ہوا جس میں 'آبِ حیات' پر تبصرہ کیا گیا ہے اور آزاد کو اس کتاب میں مومن کا ترجمہ نہ شامل کرنے پر طنز و ملامت کا نشانہ بناتے ہوئے ان پر متعصب شیعہ ہونے کا الزام بھی لگایا ہے[۲]۔ ۲۴ مئی ۱۸۸۱ء کو 'انجمن' اخبار میں 'آبِ حیات' پر ایک سنجیدہ تبصرہ شائع ہوا۔ اسی طرح کے تبصرے اور مضامین اس عہد کے کئی اخبارات میں شائع ہوئے۔[۳]

ذیل کا تبصرہ 'اودھ اخبار' لکھنؤ[۴] کی اشاعت یکم دسمبر ۱۸۸۰ء میں صفحہ نمبر ۳۸۱۴ پر شائع ہوا۔ اس حوالے سے یہ پہلا تبصرہ ہے جو 'آبِ حیات' کی اشاعت کے بعد اس عہد کے معاصر اخبار میں شائع ہوا۔ اگرچہ یہ تعارفی نوعیت کا تبصرہ ہے لیکن اس میں دو تین باتیں اہمیت کی حامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ 'آبِ حیات' کی پہلی اشاعت میں کتاب کا مسودہ کئی کاتبوں سے لکھوایا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کتاب میں کئی خط بن گئے ہیں اور کتابت کی یکسانیت برقرار نہ رہ سکی۔ دوسرا یہ کہ مصنف نے اس مضمون میں مومن کا ترجمہ شامل کتاب نہ کرنے پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ اس سے یہ

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مومن کو نظر انداز کرنا آسان نہ تھا۔ مومن نے اس عہد میں اپنی شناخت قائم کر لی تھی اور ہندوستان کا ایک بڑا ادبی حلقہ مومن کو تحسین کی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔ اسی وجہ سے اس تبصرے کے بعد مختلف اخبارات میں چھپنے والے مضامین میں مومن کو شامل نہ کرنے کے حوالے سے کافی تلخی نظر آتی ہے۔ اس مضمون کی ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ اسے مضامین خاص میں شائع کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ یہ وہ تبصرہ/ مضمون ہے جس کا آزاد کے محققین نے آج تک حوالہ پیش نہیں کیا۔ تبصرے کے آخر میں راقم جویائے کمال تحریر ہے۔ یہ کسی کا نام نہیں لگتا۔ غالباً مصنف نے اپنا نام لکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اپنے نام کی بجائے جویائے کمال (کمال کا متلاشی) لکھنے پر اکتفا کیا۔

تذکرۂ آب حیات

مصنفہ مولوی محمد حسین صاحب آزاد پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور' نیرنگ خیال' کے خیالات ابھی پیش نظر تھے کہ پروفیسر آزاد نے ایک اور تازہ طلسم باندھ کر انجمن آراستہ کی۔ بیچ میں آزاد 'آب حیات' کا پیالہ لیے کھڑا ہے۔ دَور چل رہے ہیں۔ ایک جلسہ برخاست ہوتا ہے۔ دوسرا جمتا ہے۔ شعرائے باکمال اُردو کے اپنے اپنے کمال دکھاتے ہیں اور' آب حیات' کا جام پی کر رخصت ہوتے ہیں۔ مجھے واجب ہے کہ اول اس کتاب کی صورت حال بیان کروں پھر اُس پر اپنی رائے دوں۔

اول۔ ۳۰ صفحہ میں زبان اردو کی تاریخ ہے(۵)۔ اہل وطن اس عنوان کو دیکھ کر حیران ہوں گے کہ زبان اُردو کی تاریخ کیا ہے لیکن عجب لطف پائیں گے۔ جب دیکھیں گے کہ اول ہندوستان کی زبان کیا تھی پھر دیکھیں گے کہ آریا قوم یہاں کیوں کر آئی۔ اس کی زبان کیا تھی۔ فارسی سے اُس کا کیا رشتہ تھا۔ اُس رشتے سے فارسی اور سنسکرت آپس میں بہنیں تھیں۔ اُردو برج بھاشا سے نکلی۔ جب سے فارسی آئی۔ اُس وقت سے اُردو کی تخم ریزی اس میں ہونے لگی۔ مصنف نے جہاں تک ہو سکا عہد بعہد کی عبارتیں یا نظمیں بہم پہنچا کر لکھی ہیں اور عہد بعہد کے تغیر کا حال دکھایا ہے اور رفتہ رفتہ آج کی حالت تک پہنچا دیا ہے۔

پچاس صفحہ میں بیان کیا ہے کہ برج بھاشا پر فارسی، عربی نے آ کر کیا کیا اثر کیے(۶)۔ یہ مضمونِ مفید ہمارے اہل وطن کو علم اللسان کا راستہ بتاتا ہے۔ یہی گفتگو ہے جس میں ہم اور تم باتیں کرتے ہیں۔ اُس میں نکتہ نکتہ جزئیات چُن چُن کر اصول قائم کیے ہیں۔ مثلاً جب ایک قوم دوسری قوم میں مل جائے تو جس طرح وہاں کی زمین اُنھیں رہنے کو جگہ دیتی ہے اُسی طرح زبان اُن کے لفظوں کو جگہ دیتی

ہے۔ بہت سی اشیاء آتی ہیں کہ اپنے نام ساتھ لاتی ہیں۔ بہت سی یہاں کی چیزیں اپنے نام کھو بیٹھتی ہیں اور اُن پر غیر لفظ قابض ہو جاتے ہیں۔ فارسی ،عربی کے ہزاروں لفظ ہزاروں اشتقاق، ہزاروں ترکیبیں، ہزاروں محاورے ہندی میں آ گئے ۔محاوروں کے ترجمے ہو گئے ۔تاریخی اور داستانی اشارے بھی آ گئے۔

بڑی لطافت سے بتایا ہے کہ بھاشا کی اور فارسی کی انشا پردازی میں کیا فرق ہے اور اسی سبب سے اردو کی انشا پردازی بھاشا سے الگ ہو گئی۔ فارسی کی انشا پردازی نے آ کر ہندی کی سادگی کو اپنا رنگ دیا۔ اسی واسطے وہ غیر زبان کے لوگوں کے واسطے مشکل ہو گئی۔ دونوں کے رنگ میں عبارتیں لکھ لکھ کر فرق دکھایا ہے۔ مثلاً صبح کے خیالات، بہار کے خیالات، شام کی حالت، برسات کا سماں، وغیرہ وغیرہ

نظم اردو کی تاریخ ۲۰ صفحہ میں لکھی ہے(۷)۔ بعد اس کے پانچ دَور میں ہر عہد کے نامی شاعروں کی سوانح عمری بہ تفصیل لکھی ہے اور ایسے انداز سے ان کے حال بیان کیے ہیں کہ نہ فقط اُن لوگوں کے حالات بلکہ اُس عہد کی حالت ،لباس، رفتار، گفتار سب آنکھوں کے سامنے آئینہ ہو جاتی ہے۔ ان کی تفصیل ،تصنیفات، ہر شے پر اپنی رائے، ان کے باہمی مناظرے، ردوقدح ،لطائف و ظرائف، عادات واطوار وغیرہ وغیرہ اور فی الحقیقت جو لوگ کہ زبان کے بانی اور اصلاح دینے والے ہوئے۔ اُن کے حال سے اسی طرح ہمیں واقف ہونا چاہیے۔ جب میں اس مجموعہ پر غور کرتا ہوں تو چند باتیں ثابت ہوتی ہیں جو قابل جتانے کے ہیں۔

اول یہ کام برسوں کا نہیں ،عمروں کا ہے بلکہ ایک آدمی کی تو عمر کا بھی کام نہیں۔ بہت سے سِن رسیدہ اور صحبت یافتہ لوگوں کی کمائی اس میں شامل ہوئی ہو گی۔ ایسی باتوں کا بہم پہنچانا اور پریشان دانوں کا سمیٹنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔

دوسرے، مصنف جو اُن لوگوں کے حالات بیان کرتا ہے تو اس ادب سے بیان کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا یہ اُس کے بزرگ ہیں اور کسی کو 'تو' یا 'تھا' نہیں لکھا۔ سب کا صیغہ جمع سے ادب قائم رکھا ہے اگر چہ اُن کی بھلائی برائی کوئی بات چھپائی نہیں مگر ہر بات سے محبت ٹپکتی ہے۔ شیخ ابراہیم ذوقؔ اس کے اُستاد ہیں لیکن اُن کے کلام پر بھی جو لوگوں کے اعتراض ہیں وہ بیان کر دیے ہیں۔ یہ بھی لکھ دیا ہے کہ وہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ استاد شاگرد کے معرکے بھی لکھ دیے ہیں۔ غالب سے اُن کی چشمک تھی مگر اُن کے حال میں بھی حق کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ جس کی ہمیں امید نہ تھی۔ تمام اہلِ دہلی، زبان کے

معاملے میں لکھنؤ کی زبان سے کھٹکتے ہیں۔مصنف نے کئی موقع پر ثبوت دیا ہے کہ لکھنؤ کی زبان دلی کی مناسبت سے آزاد ہے اور حق پوچھو تو یہ بڑی منصفی کا کام ہے۔اس کتاب کو فقط اُنھیں شعرائے شعر کا تذکرہ نہ سمجھنا چاہیے بلکہ اسے ایک ایسی تاریخ کہنا چاہیے جو عالمگیر کے عہد کے بعد کے لوگوں کی اور اُن کے حالات اور عادات واطوار کی تصویر ہے۔میں اپنی طرف سے اور اپنی قوم کی طرف سے مصنف کا شکرگزار ہوں کہ اس تصنیف سے اُس نے ہمارے ملک میں اس نئے انداز کی تذکرہ نویسی کا راستہ کھولا اور ساتھ ہی مبارکباد دیتا ہوں کہ جس طرح ان لوگوں کو اُس نے زندگیِ جاوید بخشی ہے اُسی طرح خود اُسے بھی آب حیات کا جام نصیب ہوا۔

آج تک جو تذکرے ہمارے ملک میں لکھے گئے۔ان سے فقط شعرا کے نام اور اشعار معلوم ہوتے ہیں اور بڑا شاعر ہم اُسی کو سمجھ لیتے ہیں جس کے تعریفی فقروں سے زیادہ کاغذ سیاہ دیکھتے ہیں یا اُس کے بہت سے شعر لکھے نظر آتے ہیں۔پروفیسر آزاد نے دیباچہ میں خوب لکھا ہے کہ میر تقی اور مرزا رفیع اپنے اُن اوصاف وکمالات سے میر اور سودا ہو کر نام پایا جو خصائص کہ تذکرے میں مذکور ہیں، یہ نہ ہوں تو جس کا جو جی چاہے یہی تخلص کر دیکھے۔سودا جنون ہے اور میر گنجفہ کا ایک پتّا۔جب تک اُن کے وہ حالات اور مقالات نہ لکھے جائیں جو اُن کی تعریفوں کی اسناد ہیں تب تک خالی تعریفی فقروں سے کیا حاصل۔لطف عبارت کا قابل دیکھنے کے ہے اُس کے فقرے لوگوں کی زبان پر نقلِ مجلس ہوں گے۔تمام تذکرہ نویسوں کا دستور ہے کہ ہر شاعر کے انتخابی اشعار لکھے ہیں۔اس میں کئی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔اول تو چیدہ چیدہ اشعار کے لکھنے میں تم دیکھو گے کہ بعض شعر نظیر اکبرآبادی کا ایسا نکل آتا ہے کہ میر سے لگّا کھاتا ہے۔ناواقف آدمی جو فقط اُن شعروں کو دیکھ کر رائے لگائے گا، وہ یہی خیال کرے گا کہ یہ شاعر میر کا ہم پلّہ ہوگا۔دوسرے بعضے شاعر مضمون یاب ہوتے ہیں، بعض معرفت پسند، بعض معاملہ بند ہوتے ہیں، بعض حالیہ کہنے والے اور وغیرہ وغیرہ مگر اپنے اپنے انداز میں ہر شخص کمال رکھتا ہے اور انتخاب کرنے والوں کی طبیعتیں مختلف ہیں چونکہ ابھی کوئی شیوہ خاص مطبوع طبع جس میں کہ شاعر مذکور کے اشعار اچھے نہیں نکلتے اس لیے یہ اپنے رنگ کے شعر اس کے دیوان میں ڈھونڈتے ہیں اور جب نہیں پاتے یا کم پاتے ہیں تو جو ہاتھ آتے ہیں وہی لکھ دیتے ہیں۔ایسا بھی دیکھا ہے کہ کسی شاعر کی غزل بھر میں ایک دو شعر کسی کے ۵، ۷ کسی کے، ساری غزل مرصع ہوتی ہے۔بہرحال یہ رائے مصنف کی خالی فائدے سے نہیں کہ اُس نے ہر شاعر کی ۷، ۸ غزلیں تمام وکمال لکھ دی ہیں[۸]۔اس میں

جو جس کا حال ہوگا صاف کھُل جائے گا۔اس کتاب کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے ۴،۵ ٹکڑے کر کے مختلف کاتبوں سے لکھوایا ہے۔غالباً یہی مطلب ہوگا کہ جلد چھپ کر پھیل جائے۔ اس جلدی میں کئی خط ہو گئے مگر اُس کی خوبی میں کچھ فرق نہیں آیا۔تعجب ہے کہ مومن خان صاحب کا حال نہیں لکھا جو کہ شعرائے مندرجہ سے کسی طرح درجے میں کم نہیں۔یہ بھی بات جتانے کے قابل ہے کہ ۵۲۰ صفحہ سے شاید زیادہ ضخامت ہے(۹)۔اور وزن میں ۳ پاؤ سے کچھ کم۔باوجود اس کے قیمت ایک روپیہ۔یہ مجبوری ہے کہ محصول ڈاک ۳ آنے ہوگا۔

راقم جویائے کمال۔ص ۳۸۱۴

حواشی وتعلیقات

۱۔ 'آبِ حیات' کے سالِ اشاعت میں اختلاف رہا ہے۔اس حوالے سے دو آراء موجود ہیں۔پہلی رائے کے مطابق 'آبِ حیات' ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی اور دوسری رائے کے مطابق 'آبِ حیات' ۱۸۸۰ء میں۔آغا محمد باقر، ڈاکٹر محمد صادق اور مظفر حنفی کا تعلق اول الذکر رائے سے ہے۔(دیکھیے: (i) Muhammad Husain Azad:His life and works by Muhammad Sadiq,West Pakistan publishing Co,LTD.lahore 1965 page No 47 (ii) محمد حسین آزاد احوال و آثار، ڈاکٹر محمد صادق، مجلس ترقیِ ادب لاہور، نومبر ۱۹۷۶ء ص ۸۴، (iii) محمد حسین آزاد: مظفر حنفی، آج، کراچی، ۲۰۰۲ء ص ۵۰ (iv) محمد حسین آزاد، آغا محمد باقر مشمولہ محمد حسین آزاد اور خانوادۂ آزاد، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائیٹی، لاہور، ۲۰۱۰ء ص ۹۵) جب کہ اسماعیل پانی پتی، ڈاکٹر اسلم فرخی اور آغا سلمان باقر کی رائے ہے کہ 'آبِ حیات' کی اشاعت ۱۸۸۰ء میں ہو چکی تھی۔(دیکھیے: (i) آبِ حیات اور مولانا حالی، اسماعیل پانی پتی، مشمولہ محمد حسین آزاد مرتبہ اکرام چغتائی، نشریات لاہور، ۲۰۱۱ء ص ۴۹ (ii) محمد حسین آزاد، حیات شخصیت، فن، آغا سلمان باقر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۱ء ص ۸۹) ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے محمد حسین آزاد۔حیات اور تصانیف میں 'آبِ حیات' کی اشاعتِ اول کے سرِ ورق کی عبارت پیش کی ہے جس میں تحریر ہے ''لاہور، وکٹوریہ پریس میں باہتمام سید رجب علی شاہ عفی عنہ ۱۸۸۰ء تعداد جلد ۱۰۵۰ قیمت فی جلد ایک (عہ) روپیہ محصول ڈاک ۳ آنے بار اول'' اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی۔اپنے مؤقف کی تائید میں انھوں نے حافظ محمود شیرانی صاحب کا یہ بیان پیش

کیا ہے جس میں انھوں نے تحریر کیا ہے کہ ''یہ جلیل القدر تصنیف ۱۸۸۰ء کے آخری مہینوں میں اشاعت پائی ہے'' حافظ محمود شیرانی صاحب نے پنڈت دھرم نرائن میر منشی اجنٹی مالوا کا ایک خط مورخہ ۲۱ فروری ۱۸۸۱ء پیش کیا ہے۔ جس میں پنڈت جی نے آزاد سے کتاب کا تقاضا کیا ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کا بیان ہے کہ شیرانی صاحب کے مذکورہ خیال کی تصدیق حالی کے محررہ ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء کو آزاد کے نام لکھا تھا۔ اپنے خط میں حالی نے 'آبِ حیات' کی چھپائی شروع ہونے پر مسرت کا اظہار کیا ہے اور ریویو لکھنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔ (محمد حسین آزاد حیات اور تصانیف، ڈاکٹر اسلم فرخی، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۵ء جلد دوم ص ۶) منشی ذکاءاللہ دہلوی، مذکورہ بالا تبصروں اور 'تذکرۂ آب حیات' مطبوعہ اودھ اخبار، لکھنؤ یکم دسمبر ۱۸۸۰ء کے بعد 'آبِ حیات' کی اشاعت کے حوالے سے تمام اختلافات ختم ہو جاتے ہیں اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۱۸۸۰ء میں اور اکتوبر یا نومبر کے مہینے میں شائع ہو چکی تھی۔

۲۔ دیکھیے: محمد حسین آزاد: احوال و آثار، ڈاکٹر محمد صادق، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، نومبر ۱۹۷۶ء ص ۸۴

۳۔ 'صادق الاخبار' میں 'آبِ حیات' میں مومن کا ترجمہ نہ شامل کرنے پر آزاد کو متعصب شیعہ ہونے کا الزام لگایا۔ اس مضمون کا ایک اقتباس دیکھیے: ''ایک ایسے جواہر زواہر کو خزف ریزہ جان کر پھینک دیا اور اپنی کتاب 'آبِ حیات' میں جو ان کے خیال میں ہوگی، دیگر شعرائے قدیم کے ساتھ نہ لکھا۔ حضرت آپ افسردہ خاطر نہ ہوں۔ اجتماعِ ضدین کہیں بھی ہو سکتا ہے؟۔۔۔ مومن تو نام پایا اور مذہب سنی کہ اصحاب ثلثہ کرام کی تعریف و توصیف میں قصائد بھی لکھے اور وہ ایسے دل سے لکھے کہ مقبول بھی ہوئے۔ مولوی آزاد کو کیا پڑی تھی کہ وہ ایسے جنتی مومن کا حالِ زندگی لکھ کر اس کو زمرۂ استادان میں شمار کر کر آپ بھی اسی کے پیرو ہوتے اور اپنی برادری میں خارج کیے جاتے اور اہلِ تشیع کی نظروں میں سبک بنتے۔ پس آپ صبر کریں اور تعصب کی شان کو بغور تکتے رہیں۔ فرمائیے تو سہی جن شعرا کا ذکر 'آبِ حیات' میں ہے، ان میں سے کسی نے ایک رباعی بھی اصحابِ ثلاثۂ کبار کی شان میں کہی ہے؟ گو ان میں سے اکثر اہل سنت ہیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ مومن مرحوم کو عشقِ مذہب تسنن اس امر کا مقتضی نہ ہوا کہ وہ اس غیر کتاب میں داخل ہوتا۔'' تفصیل کے لیے دیکھیے: محمد حسین آزاد: احوال و آثار، ڈاکٹر محمد صادق، مجلس ترقیِ ادب، لاہور، ۱۹۷۶ء ص ۸۸

۴۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جن اخبارات نے شہرت حاصل کی، ان میں سرِ فہرست نام 'اودھ اخبار' کا ہے۔ اس

کے مالک منشی نول کشور تھے۔ ۱۸۵۷ء کی خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد حالات بہتر ہونا شروع ہوئے تو منشی نول کشور لکھنؤ آ گئے۔ لکھنؤ آنے سے قبل وہ چار سال تک کوہِ نور پریس لاہور میں کام کرتے رہے۔ لکھنؤ آنے کے بعد انھوں نے مقامی حکام سے مل کر کوٹھی غالب جنگ میں مطبع نول کشور کے نام سے ایک پریس قائم کیا اور محلّہ حضرت گنج سے جنوری ۱۸۵۹ء کو 'اودھ اخبار' کے نام سے ہفتہ وار اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار چودہ سال تک ہفتہ وار نکلتا رہا۔ پھر ہفتہ میں دو بار، پھر تین بار اور ۱۸۷۶ء سے ہر دوسرے روز شائع ہونے لگا۔ ۱۸۷۷ء میں یہ اخبار روزانہ ہو گیا۔ پہلے پہل یہ اخبار چار صفحات پر مشتمل تھا پھر چھ اور اس کے بعد سولہ اور اڑتالیس صفحات تک چھپتا رہا۔ شروع میں بعض بعض مضامین دیوناگری میں بھی شائع ہوتے تھے اور کچھ عرصہ یہ اخبار مصور بھی رہا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس اخبار نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ ملک بھر میں سچی، صحیح اور تازہ خبریں دینے کے لیے 'اودھ اخبار' مشہور ہو گیا۔ اس کے نامہ نگار تمام صوبوں اور ریاستوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ مشہور تھا کہ ہندوستان کی مختلف راجدھانیوں میں یا تو حکومت کے نمائندے رہتے ہیں یا منشی نول کشور کے۔ طباعت کا سرکاری کام تقریباً سارا مطبع نول کشور کے سپرد ہو گیا۔ محکمہ تعلیم کے لیے نصاب کی کتابیں بھی یہاں چھپنے لگیں اور چند ہی دنوں میں یہ ملک کا سب سے بڑا پریس بن گیا۔

ابتدا میں 'اودھ اخبار' کی کوئی پالیسی نہیں تھی۔ یہ ان خبروں کا مجموعہ ہوتا تھا جو انگریزی اخباروں کے تاروں اور نوٹوں سے ترجمہ کر کے چھاپی جاتی تھیں۔ بعد میں اس نے اپنی پالیسی بنائی۔ جس کا مقصد اردو ادب کی خدمت کرنا، تباہ کن اور ضرر رساں رسم و رواج سے قوم کو بچانا، اصلاحی ادبی جماعتوں اور تعلیمی اداروں کی تشہیر کرنا اس کا شعار تھا۔ اس اخبار میں عصری حالات اور خبروں کے علاوہ جغرافیائی، علمی اور ادبی مضامین بھی چھپتے تھے۔ اردو اور فارسی کی کتابوں، اخباروں اور رسالوں پر بے لاگ تبصرے بھی شائع کیے جاتے تھے۔ مشہور شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ غالبؔ اور غالبؔ کے معاصرین اور متاخرین شعرا و ادبا کا کلام، حالات، وفات کی تاریخیں، مضامین، قطعات تاریخ اور دیگر اخباروں سے حاصل شدہ مضامین اور اطلاعات کو اس اخبار کی زینت بنایا جاتا تھا۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کا بیان ہے کہ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۶۵ء تک اخباروں میں تفتہ اور غالب کا وہ کلام بھی درج ہے جو اور کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔

(i) تفصیل کے لیے دیکھیے: اردو کے اخبار نویس، امداد صابری،، صابر اکیڈمی، دہلی، ۱۹۷۳ء ص

ص۳۳۱۔۲۷۴، ۳۷۸(ii) غالب اور تفتہ کے حوالے سے اودھ اخبار میں شامل خبروں سے متعلق مضامین کے لیے دیکھیے: (i) مرزا غالب اور اودھ اخبار (ii) مرزا تفتہ اور اودھ اخبار، مشمولہ تحقیقی نوادر، ڈاکٹر اکبری حیدری کاشمیری، اردو پبلشرز، لکھنؤ، ستمبر ۱۹۷۴ء ص ۳۹۰۔۳۶۰)

۵۔ زبانِ اردو کی تاریخ کا بیان صفحہ نمبر سات سے شروع ہوا اور صفحہ نمبر انتیس پر ختم ہوا۔ اس طرح زبانِ اردو کی تاریخ کا بیان تیئیس صفحات پر مشتمل ہے۔ (دیکھیے: آبِ حیات، محمد حسین آزاد، وکٹوریہ پریس، لاہور، ۱۸۸۰ء)

۶۔ برج بھاشا پر عربی اور فارسی زبان نے کیا کیا اثرات مرتب کیے۔ یہ بیان صفحہ نمبر ۳۰ تا صفحہ نمبر ۷۵ پینتالیس صفحات میں بیان ہوا ہے پچاس صفحات میں نہیں۔

۷۔ نظمِ اردو کی تاریخ کا بیان صفحہ نمبر ۷۶ تا صفحہ نمبر ۹۲ سترہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ (ایضاً)

۸۔ اس بیان میں کلّی صداقت نہیں بلکہ جزوی صداقت ہے۔ کم و بیش غزلیات بھی درج ہوئی ہیں اور انفرادی اشعار بھی۔ (ایضاً)

۹۔ 'آبِ حیات' کے پہلے ایڈیشن کے کل صفحات ۵۰۷ ہیں۔ (ایضاً)

☆☆☆

ڈاکٹر عنایت علی

اقبال کا دورۂ اورنگ آباد

اورنگ آباد پر اقبال کا اور اقبال پر اورنگ آباد کا قرض مدت سے چلا آتا تھا، عنایت علی صاحب نے اس قرض کو ادا کرنے کی بڑی خوبصورت کوشش کی ھے۔ ان کی مرتبہ کتاب میں خود عنایت علی صاحب کے علاوہ اقبالیات اور اقبالیاتِ اورنگ آباد سنہ ۱۹۳٤ تا ۲۰۱۰ء تك اس موضوع پر خود عنایت علی صاحب اور انور معظم صاحب کے علاوہ، اورنگ آباد سے خصوصی دلچسپی رکھنے والے اھل قلم نے جس طرح اس موضوع کا حق ادا کیا ھے، وہ قابل صد آفریں ھے، خصوصی توجہ کے لائق ھے خود مرتب کا مضمون اقبال اور اورنگ آباد۔مضمون کے مطالعہ سے جو کچھ حاصل ھوا، اس میں ھم آپ کو بھی شریك کرنے کا شرف حاصل کر رھے ھیں۔ (ش)

یکم اپریل ۱۹۰۷ء کو مِس بیک جو علی گڑھ کالج کے مشہور پرنسپل مسٹر بیک کی بہن تھی اور لندن میں ہندستانی طلباء کی بہبودی کی نگراں تھیں۔ ان کے گھر اقبال کی ملاقات مِس عطیہ فیضی سے ہوئی جن کی شخصیت اور ذہانت سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ عطیہ بمبئی کے ایک تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاندان کی فرد تھیں۔ وہ ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئیں اور ۱۹۰۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے سرکاری وظیفہ لے کر انگلستان گئی تھیں۔ عطیہ کے خاندان کا تعلق کھمبات (گجرات) سے تھا۔ ان کے والد کا نام حسن علی فیض حیدر تھا۔ استنبول (ترکی) سکونت اختیار کرنے کی وجہ سے وہ حسن علی آفندی کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ خاندان سلیمانی بوہرا فرقے سے تعلق رکھتا ہے۔ حسن علی آفندی کے خاندان کے افراد اپنے نام کے ساتھ فیضی لکھتے ہیں جبکہ ان کے بڑے بھائی طیب علی کے خاندان کے افراد اپنے نام کے ساتھ طیب جی لکھتے ہیں۔ سیاسی جماعت کانگریس کے سابق صدر بدرالدین طیب جی اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے انگلستان کے قیام کے دوران اقبال عطیہ سے برابر ملتے رہے، اپنے ڈاکٹریٹ کا مقالہ انھیں سنایا اور ان سے رائے بھی طلب کی تھی۔ اقبال کی جذباتی زندگی میں عطیہ فیضی ایک اہم حوالہ ہے۔

اقبال جولائی سے اکتوبر ۱۹۰۷ء میں ہائی ڈل برگ (جرمنی) میں رہے۔ مس ایماء ویگناسٹ جرمن زبان کی تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں ان کی اتالیق تھیں۔ وہ بہت مہذب خاتون تھیں۔ اور دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی رہی۔ اقبال کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایماء کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کی یاد اقبال کے ذہن میں ہمیشہ تازہ رہی۔ اقبال تین جولائی ۱۹۰۸ء کو انگلستان سے وطن واپس ہوئے۔ بمبئی سے دہلی ہوتے ہوئے ستائس جولائی ۱۹۰۸ء کی دوپہر کو وہ لاہور پہنچے، جہاں دوست احباب نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا۔

انگلستان سے واپسی کے بعد کا دور اقبال کی زندگی میں بہت صبر آزما رہا۔ ان کی شادی ۱۸۹۳ء میں جب ان کی عمر صرف سولہ سال تھی، ہو چکی تھی۔ یہ شادی ان کے بزرگوں کی مرضی سے ہوئی تھی۔ اقبال کے خسر ڈاکٹر عطا محمد سول سرجن تھے اور ان کا تعلق ایک امیر کشمیری خاندان سے تھا۔ اقبال کی اہلیہ کریم بی صاحبہ شادی کے بعد زیادہ وقت اپنے میکے میں بسر کرتی تھیں اور چند ماہ کے لیے اپنی سسرال آتی تھیں۔ ۱۸۹۸ء تک اقبال دو بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ ۱۹۰۰ء سے لے کر، ۱۹۰۵ء تک جب وہ لاہور میں قیام پذیر تھے کریم بی صاحبہ ان کے ساتھ نہیں رہیں۔ گمان ہے کہ ان ہی ایام میں زوجین میں کشیدگی شروع ہوگئی تھی جس کی وجہ دونوں کے مزاج میں ہم آہنگی کا نہ ہونا تھا۔ انگلستان سے واپسی کے بعد بھی میاں بیوی میں دوری برقرار رہی اور علاحدگی کی نوبت آ گئی۔ اقبال کے لیے یہ دور بڑے اضطراب کا تھا۔ طلاق کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ کریم بی صاحبہ نے طلاق لینے سے انکار کیا اور علاحدہ رہنے کو ترجیح دی۔

ان افسوسناک حالات کا اثر اقبال کے بچوں پر بُری طرح پڑا۔ بڑی لڑکی معراج بیگم (۱۸۹۶-۱۹۱۵ء) صرف انیس برس کی عمر میں انتقال کر گئیں۔ بڑے لڑکے آفتاب اقبال (۱۸۹۸-۱۹۷۹) باوجود اس حقیقت کے کہ وہ اپنے دادا کے بہت لاڈلے تھے۔ اپنے والد سے بدظن رہے۔ ان کے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ ان کے والد محترم نے والدہ کے ساتھ ناانصافی کی تھی۔ یہ غلط فہمی کبھی دور نہ ہو سکی۔ اقبال کی جو ذہنی کیفیت ان دنوں تھی اس کا اندازہ عطیہ کے نام لکھے گئے ان کے خط مورخہ ۹/اپریل ۱۹۰۹ء سے عیاں ہوتی ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ خط ایک نجی نوعیت کا ہے لیکن اقبال جیسا ذہین شخص جس دماغی کشمکش اور کرب سے دوچار تھا یہ خط اسی کیفیت کا آئینہ ہے۔

حیدرآباد جانے کا پروگرام اقبال نے کیوں بنایا اس کی وجہ اقبال نے کبھی نہیں بتائی۔ راقم کا

یہ ماننا ہے کہ ریاست حیدرآباد کے تعلق سے اقبال کو صحیح اندازہ نہیں ہوا تھا، باوجود اس حقیقت کے ریاست وسیع اور ترقی پذیر تھی لیکن وہاں کی گروپ بندیاں ملکی اور غیر ملکی افراد کے درمیان تلخیاں، درباری سازشیں، مسلکوں کا نفاق، طبقاتی تعصب اور روائتی خاندانی برتری، یہ سب ایسی کمزوریاں تھیں جس سے ریاست محفوظ نہیں تھی۔ اس کا احساس اقبال کو وہاں جانے کے بعد ہوا۔

۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت الاسلام کا ایک جلسہ لاہور میں منعقد ہوا تھا جس میں اس وقت ہندستان کی نامور ادبی اور علمی شخصیتیں شریک ہوئی تھیں۔ اقبال ۱۹۰۰ء سے انجمن کے ممبر تھے۔ مذکور بالا جلسے میں اقبال کے علاوہ نواب وقار الملک، حکیم اجمل خاں، مولانا حالی، محسن الملک، مولانا شبلی، عزیز مرزا، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا ظفر علی خان اور سر اکبر حیدری وغیرہ شریک تھے۔ اورنگ آباد (دکن) سے حافظ ساجد علی عباسی (وکیل) جو ایک شاعر بھی تھے اور داغ کے تلامذہ میں تھے اس میں شریک ہوئے تھے۔ اس جلسے میں اقبال نے اپنی نظم ''تصویر درد'' پڑھی تھی۔ اجلاس کے دوسرے دن جب مولانا حالی اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے اپنا کلام نہیں پڑھ سکے تو سر عبدالقادر کی درخواست پر اقبال اسٹیج پر آئے اور اپنی آواز میں مولانا حالی کی نظم ''مادرِ پنجاب انجمن'' حاضرین کو سنائی تھی۔ فقیر سید وحید الدین نے اپنی کتاب ''روزگارِ فقیر'' (جلد دوم سن اشاعت ۱۹۹۲ء) میں جو تصاویر شائع کی ہیں اس میں اس اجتماع کی تصویر معہ اسماء گرامی دی ہیں۔ اس تصویر میں سر اکبر حیدری پہلی صف میں، اقبال تیسری صف میں اور حافظ ساجد علی عباسی فرش پر سر عبدالقادر اور ظفر عمر کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی اپنی کتاب ''زندہ رود'' میں اس تصویر کو شامل کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سن ۱۹۰۴ء میں اقبال اور سر اکبر حیدری ایک دوسرے سے واقف تھے۔

حیدرآباد میں حیدری صاحب نے اقبال کی بہت خاطر تواضع کی اور میزبانی کا حق ادا کیا۔ بیگم حیدری کے اخلاق سے وہ بے حد متاثر ہوئے جس کا اظہار انھوں نے عطیہ کے نام اپنے خط تیس مارچ ۱۹۱۰ء میں کیا۔ حیدری صاحب نے اپنے عملے کے ایک افسر عبدالرزاق راشد کو اقبال کی ضرورتوں کا خیال رکھنے کے لیے مختص کیا تھا۔ حیدری صاحب نے اقبال کی ملاقات اس وقت شہر میں موجود مقتدر شخصیتوں سے کروائی تھی جن میں قابل ذکر استاد سخن جلیل مانک پوری اور ظہیر دہلوی تھے۔ اقبال نے حضرت نظم طباطبائی سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جو اس وقت نظام کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ حیدری صاحب نے انھیں اپنے گھر مدعو کیا اور اقبال سے تعارف کروایا۔ اقبال نے ان سے اپنا کلام

سنانے کی درخواست کی چنانچہ انھوں نے اپنے نعتیہ قصیدے کے کچھ اشعار سنائے۔ بعد میں اقبال نے نظم صاحب کی زمین میں ایک مدحیہ قصیدہ تحریر کیا جو مہاراجہ کشن پرشاد سے منسوب ہے جن سے اقبال کی پہلی بار ملاقات ان کے اس دورے حیدرآباد میں ہوئی تھی۔ اقبال کے اعزاز میں ایک عشائیہ بھی حیدری صاحب نے دیا تھا جس میں شہر کے متعدد شعراء نے شرکت کی تھی۔ حیدرآباد کے قیام کے دوران انہوں نے گولکنڈہ کے قلعے سے نزدیک قطب شاہی بادشاہوں کے مقبروں کی زیارت کی تھی اور ''گورستانِ شاہی'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو رسالہ ''مخزن'' لاہور کے جون ۱۹۱۰ء کے شمارے میں ان کے ایک نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی۔

اقبال جملہ چار دن حیدرآباد میں رہے، اس دوران صرف چند شاعروں اور مہاراجہ کشن پرشاد سے ان کی ملاقات ہوئی۔ فرمارواے ریاست سے وہ نہیں مل سکے۔ جس مقصد کے لیے وہ ایک لمبے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے حیدرآباد آئے تھے لگتا ہے اس تعلق سے کوئی بات نہیں ہوئی یا خود اقبال نے یہاں کے حالات کا بذات خود مشاہدہ کرنے کے بعد اس تعلق سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ انھوں نے حیدرآباد سے اورنگ آباد جانے اور وہاں سے براہ منماڑ لاہور واپسی کا ارادہ کرلیا۔

خرم علی شفیق نے اپنی کتاب ''اقبال تشکیلی دور (۱۹۰۵-۱۹۱۳)'' سن اشاعت ۲۰۰۹ء میں لکھا ہے کہ اقبال نے اپنی بیاض میں جو حیدرآباد کے سفر کے دوران ان کے ساتھ تھی اس کے آخری صفحات پر سفر کی تفصیلات اور گاڑیوں کے اوقات وغیرہ لکھ کر گھنٹوں اور منٹوں کا حساب لگا کر بڑی محنت سے اس اضافی سفر (اورنگ آباد) کی گنجائش نکالی تھی۔ راقم نے اقبال کے تعلق سے لکھی گئی کتابوں سے ان کے بیاضوں کے بارے میں معلومات جمع کیں۔ اقبال کی وفات کے بعد ان کی بیاضیں اور مسودات ''اقبال میوزیم'' جاوید منزل لاہور میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ میوزیم کی فہرست میں ایک بیاض نمبر شمار AIM-1977-219 ہے جسے ان کی پہلی بیاض کہا جاتا ہے۔ اس بیاض میں قیام یورپ کی نظمیں، اور حیدرآباد میں لکھی گئی نظمیں ''صبح'' اور گورستان شاہی'' بھی ہیں۔ یہی بیاض ہے جس میں اورنگ آباد کے تعلق سے سفر کی معلومات ہیں، شفیق صاحب کی عنایت سے مجھے متعلقہ بیاض کے صفحہ نمبر ا کیاون اور باون کے عکس دستیاب ہوئے۔ ان صفحات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اورنگ آباد کے دورے کے لیے اقبال نے کس محنت سے وقت نکالا تھا۔ یہاں لگتا

ہے کہ اقبال کو ایک غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ دولت آباد کو ایک بڑا اسٹیشن سمجھ رہے تھے جہاں اتر کر وہ خلد آباد جا سکیں جبکہ دولت آباد ایک بہت ہی چھوٹا اسٹیشن ہے، وہاں بجز ریلوے اسٹاف کے چند کوارٹر کے، آمدرفت کی کوئی سہولت آج بھی دستیاب نہیں۔ ریلوے کے یہ چھوٹے اسٹیشن ہر بیس یا پچیس کلو میٹر کے فاصلے پر بنائے جاتے ہیں جن کا مقصد ہر دو طرف سے آنے جانے والی ٹرینوں اور مال گاڑیوں کو سائڈنگ مہیا کرنا ہوتا ہے۔ دولت آباد، خلد آباد، ایلورہ اور اجنٹہ کی سیاحت کے لیے سیاحوں کو اورنگ آباد آنا ضروری ہے۔ جہاں سے بہت آسانی کے ساتھ کم وقت میں بذریعے آٹو رکشہ، کار یا بس سے جایا جا سکتا ہے۔ یہ غلط فہمی دور ہونے کے بعد اقبال اورنگ آباد آئے اور یہاں قیام کیا۔ اقبال کے بیاض کے یہ صفحات جو آج تقریباً ایک سو سال پرانے ہیں، [عنایت علی کی] اس کتاب میں صفحہ نمبر (۴۰، ۴۱، ۴۲) پر بطور ریفرنس شامل کیے گئے ہیں۔

اقبال کو اورنگ زیب عالمگیرؒ سے بہت عقیدت تھی جو ہندستان میں مغلیہ حکومت کے چھٹے اور سب سے جلیل القدر بادشاہ تھے۔ جن کے دورِ حکومت میں پورے ہندستان پر مغلیہ سلطنت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ وہ حافظ قرآن تھے اور ٹوپیاں سی کر اپنا ذاتی خرچ پورا کرتے تھے۔ ایسی شخصیت کی نظیر ہندستان کی تاریخ میں نہیں ملتی لیکن یہ ان کی بدقسمتی رہی کہ ان کی وفات کے بعد ہندستان کے چند فرقہ پرست مؤرخوں نے انھیں ایک متعصب حکمراں بتایا، ان پر منادر کو توڑنے کے بے بنیاد الزام لگائے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند کے علاوہ صوبہ دکن اور مرہٹواڑہ کے اکثر برہمن خاندانوں کے پاس آج بھی حضرت عالمگیرؒ کے فارسی زبان میں لکھے ہوئے عطیاتی فرمان محفوظ ہیں۔ جس میں مندروں کی نگہداشت کے لیے انھیں وسیع جاگیریں دی گئی ہیں۔ ان کی حیات کے آخری پندرہ یا بیس برس دکن میں گزرے اورنگ آباد سے متصل خلد آباد کا قصبہ انھیں بے حد پسند تھا اور اپنی حیات میں کی گئی وصیت کے مطابق وہ وہیں دفن ہوئے۔ ان کی قبر نہایت سادہ طریقے سے بنائی گئی ہے۔ اور اس پر کوئی گنبد وغیرہ نہیں ہے۔

خلد آباد سے دو تین کلو میٹر کے فاصلے پر ایلورہ کے غار اور گرنیشور کا مندر ہے جن میں پتھر کی مورتیاں تراشی ہوئی ہیں لیکن اس علاقے میں واقع ایک بھی مورتی کو نقصان پہنچانے کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ہے۔ اسی طرح شہر اورنگ آباد میں ان کے تعمیر کردہ محل قلعہ ارک سے شمال کی جانب چار پانچ کلو میٹر کی دوری پر پہاڑیوں میں غار ہائے اورنگ آباد ہیں جن میں مہاتما بدھ کی تراشیدہ مورتیاں ہیں

جو آج بھی جوں کی توں موجود ہے۔ عہد عالمگیر میں اورنگ آباد میں ایک ہندو سنت نپٹ نرنجن مہاراج تھے جن کی کٹیا اورنگ آباد کے غاروں کے پاس تھی۔ ان دونوں ہستیوں میں تصوف کے مسائل پر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ اورنگ آباد سے تعلق رکھنے والے ہندی زبان کے ایک ادبی پروفیسر تلنگ نے ان پر ریسرچ کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔

اقبال مزارِ عالمگیرؒ پر اظہارِ عقیدت کے لیے جانا چاہتے تھے وہ اس عظیم نیک سیرت شہنشاہ کے بارے میں ایک نظم لکھنا چاہتے تھے جو بقول ان کے ایک انتہائی وجد انگیز اور ولولہ خیز ہوگی۔ حیدر آباد سے منماڑ جانے کا ٹرین کا راستہ اورنگ آباد سے ہی ہے۔ اقبال ۲۳ مارچ ۱۹۱۰ء کو اورنگ آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں اس بات کا خلاصہ ضروری ہے کہ اقبال اکیلے ہی حیدر آباد آئے تھے اور ان کی خانگی نوکر علی بخش ان کے ہمراہ نہیں تھا۔ اقبال کے بڑے بھائی عطا محمد انگریزی فوج کے ملٹری ورکس میں سب اوورسیئر تھے۔ مارچ ۱۹۱۰ء میں وہ دیولالی، چھاؤنی، ضلع ناسک ریاست مہاراشٹر میں ایس۔ ڈی۔ او۔ (ورکس) تھے۔ اور اقبال کے حیدر آباد جانے کی اطلاع ملنے پر وہ ان سے ملنے شاید حیدر آباد گئے تھے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۱۰ء کو وہ اقبال کے ساتھ ہی حیدر آباد سے اورنگ آباد آئے تھے۔ چونکہ سکندر آباد انگریزی فوج کی چھاونی تھی اس لیے راقم کا قیاس ہے کہ وہ فوج ہی کے گیسٹ ہاؤس سکندر آباد میں ٹھہرے ہوں گے کیوں کہ سر اکبر حیدری کے گھر میں اقبال کے قیام کے دوران عطا محمد کا نام سننے میں نہیں آتا۔ (اقبال کی بیاض میں عطا محمد کی دیولالی سے منماڑ آنے کا ایک اندراج ہے۔ ہوسکتا ہے بھائی سے ملنے وہ منماڑ سے حیدر آباد گئے ہوں)۔

اورنگ آباد میں دو دن اقبال کا قیام کہاں تھا؟ کس کے گھر وہ مہمان ہوئے؟ کس نے ان کا انتظام کیا تھا؟ کن افراد سے انھوں نے ملاقات کی؟ اور کون سے مقامات کی انھوں نے زیارت کی؟ اس بارے میں معلومات نہیں ملتی۔ اقبال کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں کسی قسم کی تشہیر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر ان کا دورہ اورنگ آباد بالکلیہ خانگی نوعیت کا تھا۔ اورنگ آباد سے تعلق رکھنے والے ادیب عبدالروف عروج نے ایک کتاب ''اقبال اور بزم اقبال حیدر آباد (دکن)'' کے عنوان سے لکھی ہے جو ستمبر ۱۹۷۸ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں عروج لکھتے ہیں ''۲۳ مارچ کو جب وہ لاہور کے لیے روانہ ہونے لگے تو سر اکبر حیدری نے ایسا انتظام کر دیا کہ وہ ایک دو روز اورنگ آباد میں گزار سکیں اور وہاں سے بمبئی کے راستے لاہور پہنچ جائیں۔ اورنگ آباد میں

میزبانی کے فرائض کس نے انجام دیے اس کی تفصیل ہمارے سامنے نہیں ہے۔اس وقت ضیاء یار جنگ جیسے فارسی کے مشہور شاعر اور بشیر الدین افسر جیسے صاحبِ تحریر بزرگ اورنگ آباد ہی میں موجود تھے۔ قیاس غلط نہیں ہے تو پھر اقبال کی سیر وسیاحت کا انتظام ان ہی بزرگوں میں سے کسی ایک نے کیا ہوگا''۔

عروج صاحب کی اس تحریر کے بارے میں راقم کا یہ کہنا ہے کہ عروج ۱۹۵۱ء کے لگ بھگ اورنگ آباد سے پاکستان جانے کے بعد وہ اپنی حیات میں پھر اورنگ آباد نہیں آئے۔انھوں نے اپنی کتاب حیدر آباد کے ایک جاگیر دار نواب حسن یار جنگ (۱۹۰۳-۱۹۸۵ء) کی ایماء پر لکھی تھی اور کتاب کا بیشتر مواد نواب صاحب کے ذاتی کتب خانے میں دستیاب کتابوں اور ریکارڈ کی بنا پر حاصل کیا تھا۔نواب حسن یار جنگ اقبال الدولہ امیر پائیگاہ سر وقار الامرہ کے پوتے اور سلطان الملک کے بیٹے تھے یہ خاندان پولیس ایکشن کے بعد ۱۹۵۰ء میں پاکستان منتقل ہوگیا تھا نواب صاحب کا سنہ ۱۹۸۵ء میں اور ان کی اہلیہ معین النساء بیگم کا جنوری ۲۰۱۴ء میں بہ مقام کراچی انتقال ہوا۔

نواب صاحب اقبال کے عقیدت مندوں میں سے تھے اور دو بار لاہور اور لندن میں ان سے ملاقات کر چکے تھے۔اقبال کے انتقال کے بعد انھوں نے حیدر آباد میں بزم اقبال قائم کی اور اس کے ذریعے اقبال کے کلام کی نشر واشاعت کا کام انجام دیا تھا۔عروج صاحب نے اپنی کتاب لکھتے وقت اس وقت اورنگ آباد میں حیات بزرگوں سے بھی اس بارے میں کوئی استفسار نہیں کیا تھا اور بہت سرسری انداز میں اقبال کے دورۂ اورنگ آباد کا ذکر کیا ہے۔راقم نے اورنگ آباد کے کلکٹر آفیس میں موجود ریکارڈ کو بھی دیکھا۔اس وقت اورنگ آباد کے کلکٹر مولوی عبدالرشید تھے اور سر اکبر حیدری کا کوئی مراسلہ کلکٹر کے نام آفیس ریکارڈ میں دستیاب نہیں ہے۔حیدری صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک اصول پسند انسان تھے اور وہ کیسے اپنے کسی ماتحت کو اپنے ایک خانگی مہمان کو ٹھہرانے کے لیے ہدایت دیتے۔

مفتی ضیاء یار جنگ (پورا نام سید نور الضیاء نقشبندی) کا تعلق بھی اورنگ آباد سے ہے ان کے جد اعلیٰ مولانا سید شاہ قمر الدین نقشبندی فارسی زبان کے مشہور عالم تھے اور تقریباً ۲۳ کتابوں کے مصنف تھے ان کا مزار بھڑکل گیٹ کے قریب ہے اور وہیں ان کا آبائی مکان تھا۔آپ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد اورنگ آباد، حیدر آباد اور بالا پور میں مقیم ہیں۔ضیاء یار جنگ کی پیدائش حیدر آباد میں ہوئی تھی اور اس خاندان کی وسیع جاگیرات ضلع اورنگ آباد اور جالنہ میں تھی۔ضیاء یار جنگ

عربی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ ان کا غیر مطبوعہ اردو اور فارسی دیوان اورنگ آباد میں وجد میموریل ٹرسٹ اورنگ آباد میں موجود ہے۔ ۱۹۳۵ء میں انھیں فرماں روائے وقت نواب میر عثمان علی خان نظام ہفتم کی جانب سے ضیاء یار جنگ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ وہ سال کا بیشتر حصہ حیدر آباد میں رہتے تھے اور صرف ایک ماہ کے لیے اورنگ آباد آتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں جب اقبال حیدر آباد میں آئے اور جن شخصیتوں سے ملے تھے ان میں ضیاء یار جنگ کا نام نہیں سنائی دیتا۔ اقبال سے ان کی پہلی ملاقات ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد میں ہوئی تھی اس لیے اقبال کے دورے اور اورنگ آباد میں اقبال کے قیام کا انتظام ضیاء یار جنگ صاحب نے کیا تھا صحیح نہیں لگتا۔

راقم کے نانا سید نور المقتدیٰ نقشبندی، مفتی ضیاء یار جنگ کے چھوٹے چچازاد بھائی تھے باوجود اس کے کہ حیدر آباد کے جاگیردار خاندانوں میں جاگیرات کے تعلق سے عدالتی جھگڑے عام تھے۔ نانا صاحب اپنے بڑے تایا زاد بھائی سے ملنے اورنگ آباد یا حیدر آباد ان کے مکان پر اکثر جایا کرتے تھے، انھیں خاندان کے بزرگوں اور خاص طور پر بزرگان دین کے حالات لکھنے کا بہت شوق تھا۔ (تذکرہ خاندانِ نقشبندیہ کے عنوان سے انھوں نے ایک ضخیم تذکرہ تحریر کیا تھا جو ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکا۔ اس کی ایک نقل انھوں نے بالا پور کے اپنے ایک عزیز سید ہادی نقشبندی کو دی تھی۔ ہادی صاحب نے اس ضخیم تذکرے کی بنیاد پر ایک تلخیص ''روح العنایت'' کے نام سے ۱۹۹۶ء میں شائع کی۔ سید نور المقتدی صاحب کا ایک دوسرا تاریخی کارنامہ اورنگ آباد، حیدر آباد، بالا پور اور احمد نگر کے بعض مشہور صوفی خاندانوں کا شجرہ مبارک ہے جو انھوں نے بہت جانفشانی اور تحقیق سے مرتب کر کے ۱۹۳۴ء میں شمسی مشین پریس آگرہ سے بعنوان ''نور العنایت بہ تذکرہ پاک شائع کیا تھا۔ ان کے پاس ایک رجسٹر تھا جس میں خاندان میں پیش آئے اہم واقعات، خاندان میں بچوں کی تاریخ پیدائش، اموات، مہمانوں کی آمد اور بعض اہم واقعات کا تذکرہ لکھا کرتے تھے۔ اس رجسٹر میں ضیاء یار جنگ کے بارے میں کئی اندراجات ہیں لیکن اقبال اورنگ آباد آئے تھے اور ضیاء یار جنگ نے انھیں اپنے پاس ٹھہرایا تھا اس تعلق سے کوئی اندراجات نہیں ملتے۔

بشیر الدین افسر اور آپ کے بڑے بھائی وزیر الدین عاقل کا تعلق بھی اورنگ آباد سے ہے۔ دونوں بھائی شاعر تھے اور استاد داغ کے شاگردوں میں سے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں بشیر الدین افسر کلکٹر آفیس اورنگ آباد میں منشی تھے۔ راقم نے ان دونوں صاحبین کے ورثا سے ان کے گھر اقبال کے قیام

کے تعلق سے دریافت کیا اور انھوں نے بتایا کہ ایسی کوئی بات انھوں نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے نہیں سنی تھی۔

حافظ ساجد علی عباسی (وکیل) جن کی اقبال کے ساتھ ایک تصویر ہے۔ان کے افرادِ خاندان بھی اس بات سے لاعلم ہیں کہ اقبال نے ان کے گھر قیام کیا تھا۔ساجد صاحب کی وسیع ڈیوڑھی ''ساجد منزل'' واقع چیلی پورا اورنگ آباد اس وقت تک تعمیر نہیں ہوئی تھی۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ سلطان صاحبہ سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کا تعلق اورنگ آباد سے ہے۔انھوں نے ۱۹۵۳ء میں اقبال کے تعلق سے ایک کتاب بعنوان ''اقبال سخن'' شائع کی تھی۔وہ برصغیر ہندو پاک کی پہلی خاتون ہیں جنہوں نے اقبال پر کتاب لکھی۔رفیعہ صاحبہ کی کتاب میں اقبال کے سفر اورنگ آباد کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

مشہور شاعرہ اور ناول نگار پروفیسر وحیدہ نسیم صاحبہ کا تعلق بھی اورنگ آباد سے ہے۔وہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان چلی گئیں تھیں۔اورنگ آباد کے تعلق سے انھوں نے دو کتابیں ''شاہانِ دکن'' سن اشاعت ۱۹۸۸ء جس میں اورنگ آباد اور خلد آباد کے بزرگانِ دین کا تذکرہ ہے اور ''اورنگ آباد۔ملک عنبر سے عالمگیر'' تک سن اشاعت ۱۹۹۳ء جس میں اورنگ آباد کی تاریخ ہے لکھی ہے۔ان دونوں کتابوں میں اقبال کی اورنگ آباد آمد کا تذکرہ نہیں ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سنہ ۱۹۱۱ء میں حیدر آباد سے اورنگ آباد آئے اور یہاں مہتمم تعلیمات رہے وہ سن ۱۹۳۸ء تک اورنگ آباد میں قیام پذیر تھے۔اس علاقے میں عصری تعلیم کے فروغ اور اسکولوں کے قیام کے لیے انھوں نے بہت کام کیا۔ جسے اہل اورنگ آباد کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔انھوں نے انجمن ترقی ہند کا دفتر علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل کیا۔انجمن کے سہ ماہی مجلّہ ''اردو'' کا آغاز اورنگ آباد سے کیا۔انٹرمیڈیٹ کالج کا قیام ان ہی کے ہاتھوں ہوا اور وہ اس کے پہلے پرنسپل بنے۔

سنہ ۱۹۲۵ء سے اس کالج کا دو ماہی اردو رسالہ ''نورس'' شائع ہونا شروع ہوا جو ۱۹۴۷ء تک جاری رہا۔حیرت یہ ہے کہ مجلّے اردو یا نورس کے کسی شمارے میں اقبال کے دورۂ اورنگ آباد کے بارے میں کوئی مضمون نہیں چھپا۔نہ مولوی صاحب نے لکھا اور نہ کسی اور سے لکھوایا جب کہ مقامی افراد سے مولوی صاحب کے بہت اچھے تعلقات رہے تھے۔

سنہ ۱۹۱۰ء کا اورنگ آباد ایک چھوٹا سا پس ماندہ شہر تھا۔ شہر میں کسی کے پاس موٹر نہیں تھی۔ امراء اور جاگیرداروں کے پاس خود کے تانگے تھے جن میں گھوڑے استعمال ہوتے تھے۔ شہر میں کسی سرائے یا بڑے مسافر خانہ ہونے کے بارے میں معلومات نہیں ملتی۔ ہاں مسافروں کے قیام کے لیے چوک کے علاقے میں چند کمرے دستیاب ہونے کا ذکر ملتا ہے۔ اسی علاقے میں اور محلّہ جونا بازار اور شاہ گنج میں چند بھٹیار خانے تھے جہاں سے مسافروں کو کھانا ملتا تھا۔ بعض مساجد میں یا بزرگان دین کی خانقاہوں میں حجرے تھے جن میں زائرین یا عام مسافر قیام کرتے تھے۔ اورنگ آباد کا مشہور صوبے داری گیسٹ ہاؤس یا خلد آباد کا گیسٹ ہاؤس اس وقت تک تعمیر نہیں ہوئے تھے۔ اورنگ آباد کا موجودہ ریلوے اسٹیشن ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا۔ ریلوے اسٹیشن سے شہر جانے کے لیے دو سڑکیں تھیں، ایک مشرق کی جانب عثمان پورہ اور پھر شمال کو مڑ کر پٹن گیٹ جاتی تھی۔ دوسری اسٹیشن سے شمال کی جانب بیرون چھاونی (موجودہ بابا پٹرول پمپ) اور پھر بھڑکل گیٹ، جونا بازار ہوتی ہوئی چوک کو جاتی تھی۔ ریلوے اسٹیشن سے چار پانچ کلومیٹر تک آبادی نہیں تھی اب یہ کھلے علاقے گنجان بستیوں اور اونچی عمارتوں سے پُر ہو گئے ہیں۔

اورنگ آباد میں اقبال کا قیام کہاں تھا۔ اس بارے میں راقم نے بہت سے بزرگوں سے دریافت کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ اتفاق سے راقم کو پچھلے دو برسوں میں چند انگریز سول اور فوجی افسروں کے سفرناموں کو پڑھنے کا اتفاق ہوا جو انھوں نے ہندستان کے چند تاریخی مقامات کے بارے میں لکھے تھے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ افسران سول یا فوجی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا کرتے تھے۔ دیسی افسران بعض امراء کی دیوڑھیوں میں یا دفتروں میں خالی کرائے گئے کمروں میں قیام کرتے تھے۔ چنانچہ راقم کا یہ قیاس ہے کہ چونکہ اقبال کے ہمراہ ان کے بڑے بھائی تھے جو برٹش فوج میں انجینئر تھے۔ وہ دونوں فوج کے گیسٹ ہاؤس واقع چھاونی نزد کھام ندی اولڈ برج میں ٹھہرے ہوں گے۔ ریلوے اسٹیشن سے شہر جاتے وقت موجودہ بابا پٹرول پمپ سے مغرب کی جانب ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر یہ گیسٹ ہاؤس ہے۔ اس کے سامنے سے اورنگ آباد سے دولت آباد اور خلد آباد جانے والی سڑک ہے جو اب اسٹیٹ ہائی وے میں تبدیل ہو چکی ہے۔ چھاؤنی میں شہر کا ایک مشہور تانگہ اسٹینڈ بھی تھا اور ایک عرصے تک تانگہ چلانے والے افراد کی اکثریت چھاونی میں رہتی تھی۔

اقبال ۲۴ مارچ ۱۹۱۰ء کی صبح کو اورنگ آباد آئے تھے۔ اسی دن وہ اپنے بھائی کے ہمراہ

تانگے کے ذریعے خلد آباد گئے جو اورنگ آباد سے پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اقبال مزار عالمگیرؒ پر گئے اور وہاں پر فاتحہ پڑھی۔ مزار کے گرد قنات تھی۔ عطا محمد قنات کے اندر نہیں گئے اور کہا کہ میری داڑھی غیر مشروع ہے۔ یہ تفصیل اقبال نے اکبر الہ آبادی کے لکھے گئے اپنے خط مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء میں دی ہے۔

۱۷ دسمبر ۱۹۱۴ء، لاہور

مخدومی! السلام علیکم

کل خط لکھ چکا ہوں۔ مگر آپ کے اس شعر کی داد دینا بھول گیا؛

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں

عقیدے، عقل، عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

سبحان اللہ کس قدر باریک اور گہرا شعر ہے، ہیگل جس کو جرمنی والے افلاطون سے بڑا فلسفی تصور کرتے ہیں، اور تخیل کے اعتبار سے حقیقت میں ہے بھی افلاطون سے بڑا، اس کا تمام فلسفہ اسی اصول پر مبنی ہے۔ آپ نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ میں بند کر دیا، یا یوں کہیے کہ ہیگل کا سمندر اس قطرے کی تفسیر ہے۔ آج مہاراجہ کشن پرشاد کا خط آیا تھا، معلوم ہوا کہ خواجہ نظامی حیدر آباد سے اورنگ آباد چلے گئے خلد آباد کی زیارت مقصود ہوگی؛ میں بھی وہاں گیا تھا اور عالمگیرؒ کے مزار پاک پر حاضر ہوا تھا۔ میرے بڑے بھائی بھی ساتھ تھے۔ کہنے لگے میں قنات کے اندر نہ جاؤں گا (مزار کے گرد قنات تھی) میری ڈاڑھی غیر مشروع ہے۔

والسلام، مخلص محمد اقبال

قیاس ہے کہ اس دن یعنی ۲۴ مارچ کو سہ پہر انھوں نے بی بی کا مقبرہ، جسے اورنگ زیب نے اپنی اہلیہ رابعہ دورانی عرف دلرس بانو بیگم کی یاد میں تعمیر کیا تھا، دیکھا ہوگا یا اورنگ آباد میں حضرت نظام الدین مقبول الٰہی کے مزار جو شاہ گنج کے عقب میں واقع ہے وہاں گئے ہوں گے۔ کیوں کہ یہ بزرگ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی (دہلی) کے سلسلے سے ہیں، اور اقبال حضرت محبوب الٰہی کے بہت عقیدت مند تھے اور جب بھی دہلی جاتے ان کے مزار پر ضرور حاضری دیتے تھے۔ اورنگ آباد میں بعض بزرگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اقبال ان بزرگ کی (= کے) مزار پر آئے تھے لیکن اس کا کوئی دستاویز ثبوت نہیں ہے۔

اقبال ایلورہ کے غار جو خلد آباد سے محض تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے نہیں جا سکے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس وقت غاروں کی مرمت اور صفائی کا کام شروع تھا اور عوام کا داخلہ روک دیا گیا تھا۔ اقبال خلد آباد جاتے وقت راستے میں واقع قلعے دولت آباد بھی نہیں دیکھ سکے۔ اس وقت قلعے میں گولہ بارود رکھا ہوا تھا اور قلعے میں داخلے کے لیے کلکٹر اورنگ آباد کی اجازت ضروری تھی۔ چونکہ یہ قلعہ سڑک سے صاف نظر آتا ہے اس لیے اقبال نے سڑک ہی سے قلعے کو دیکھنے پر اکتفا کیا ہوگا۔ خلد آباد میں اقبال نے اور کون سے بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کی، اس بارے میں کوئی بھی معلومات دستیاب نہیں ہے۔ راقم کا قیاس ہے کہ مزار عالمگیرؒ سے متصل ایک دو بزرگان دین کے مزاروں پر یا حضرت امیر حسن سجزیؒ جو حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے محبوب مرید تھے اور حضرت امیر خسروؒ کے خالہ زاد یا ماموں زاد بھائی تھے، گئے ہوں گے، اقبال دوسرے دن یعنی ۲۵ اپریل کو اورنگ آباد ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے تاکہ منماڑ جانے والی ٹرین میں سوار ہو سکیں جو صبح نو بجے اورنگ آباد آتی تھی۔ مماڑ پہنچ کر وہ رات کی ٹرین سے لاہور کے لیے روانہ ہو گئے اور ۲۹ مارچ کی صبح کو چند گھنٹوں کی تاخیر سے لاہور پہنچ گئے۔

اقبال کے دورۂ حیدر آباد و اورنگ آباد سے پہلے اقبال اور عطیہ کے درمیان ہوئی خط و کتابت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ عطیہ نے انھیں جنجیرہ آنے کو لکھا تھا۔ عطیہ کے نام اقبال کے لکھے خطوط مورخہ ۱۳ جنوری، ۹ اپریل اور ۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء اس کے گواہ ہیں۔ عطیہ کے بہنوئی نواب سدّی احمد خاں نے بھی اقبال کو جنجیرہ آنے کی دعوت دی تھی۔ اقبال نے اپنے خط مورخہ ۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء میں جنجیرہ نہ آنے سے معذرت کر لی تھی۔ اس تعلق سے بہت سے حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ عطیہ کے سرپرست چاہتے تھے کہ اقبال اگر جنجیرہ آتے ہیں تو عطیہ کے ساتھ ان کی شادی کی تجویز رکھیں۔ عطیہ کی عمر اس وقت ستائس برس سے اوپر ہو چکی تھی اور اس عمر پر ہر باپ اپنی لڑکیوں کی جلد از جلد شادی ہو جانے کی خواہش رکھتا ہے۔ اقبال کے جنجیرہ نہ آنے سے عطیہ اقبال سے بہت ناراض ہوئیں جس کا اندازہ اقبال کے خط مورخہ ۳۰ مارچ اور ۷ اپریل ۱۹۱۰ء سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد اقبال اور عطیہ کے تعلقات میں ایک دراڑ آ گئی اور بعد میں انھوں نے ۵ دسمبر ۱۹۱۲ کو مشہور مصور سیموئل رحیمین سے جو نو مسلم تھے شادی کر لی۔ اس شادی کے بعد اقبال اور عطیہ کے درمیان خط و کتابت کے کوئی ثبوت نہیں ملتے۔ سن ۱۹۲۳ء میں اقبال کی ممبئی آمد پر عطیہ اپنے شوہر اور بہن کے ساتھ کراچی چلی گئیں جہاں

کسمپرسی کی حالت میں ۱۴ جنوری ۱۹۶۷ء کو انھوں نے وفات پائی۔ اقبال کے انتقال کے بعد عطیہ اقبال کی یاد منعقدہ جلسوں میں برابر شرکت کرتی رہیں جس میں قابل ذکر ۱۹۴۵ء میں حیدر آباد کی بزم اقبال کا جلسہ، ۱۹۴۶ء میں بمبئی میں منعقدہ یوم اقبال اور ۱۹۵۴ء میں کراچی کا یومِ اقبال شامل ہے۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ عطیہ اور اقبال کے تعلقات جو شروع میں ایک پاکیزہ رفاقت کا روپ لیے ہوئے تھے بعد میں صرف دوستانہ رہے۔ مشہور محقق اور ادیب ڈاکٹر عبدالستار دلوی صاحب نے اپنی کتاب ''اقبال اور بمبئی'' سال اشاعت ۲۰۱۳ء میں لکھا ہے کہ پاکستان کے مشہور ادیب مشفق خواجہ صاحب نے ایک بار عطیہ سے اقبال کے میں ان کے تعلقات سے متعلق پوچھا تھا اور عطیہ نے اس اس جذباتی رشتے کی توثیق کی تھی۔

اقبال کے دورۂ اورنگ آباد کے سلسلے میں معلومات اکھٹا کرنے کے لیے دستیاب کتابوں سے استفادہ حاصل کرتے وقت راقم نے محسوس کیا ہے کہ اقبال کے سوانح نگاروں نے ان کی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ انھیں ''شاعر اسلام'' یا عطیہ کے الفاظ میں ''ولی اللہ'' بنا دیا گیا۔ جبکہ اقبال ایک شاعر، مفکر، دانشور، سب کچھ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک انسان بھی تھے جن کے ماضی میں ازدواجی زندگی کی چند تلخیاں بھی شامل تھیں۔ شاعر اسلام بنا دینے سے برصغیر کی مذہبی شخصیتیں اقبال کو عطیہ جیسی مغربی یافتہ خاتون کے ساتھ دیکھنا برداشت نہیں کر پائیں۔ اقبال کے بارے میں عطیہ کی لکھی ہوئی انگریزی کتاب ''اقبال'' عطیہ کے نام لکھے خطوط، اقبال کی نظم ''وصال'' اور انگلستان میں لکھی گئی ان کی دوسری نظمیں ان سب کا ایک غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال عطیہ سے ذہنی طور پر بہت متاثر تھے۔ جبکہ ڈاکٹر سعید اختر درانی (نوادر اقبال یورپ میں) ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (عروج اقبال) اور ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد (فکر و فن) کی کتابوں میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ اقبال اور عطیہ کا کوئی جوڑ ہی نہیں بنتا۔ خرم علی شفیق اپنی کتاب ''اقبال تشکیلی دور۔ ۱۹۰۵ سے ۱۹۱۳ء میں لکھتے ہیں ''اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ انھوں نے عطیہ کو اپنی شریکِ زندگی بنانے کے بارے میں سوچا ہو''۔ پروفیسر رفیع الدین ہاشمی اپنی کتاب ''علامہ اقبال۔ شخصیت اور فکر و فن'' میں تحریر کرتے ہیں ''اپنی ناکام ازدواجی زندگی کے پیش نظر قیام یورپ کے درمیان اقبال نے کبھی دوسری شادی کے بارے میں سوچا ہوگا۔ شاید ممکن ہے کبھی سوچا ہو''۔

اقبال عطیہ سے شادی کیوں نہیں کر پائے اس کا جواب تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ کونسی

شعوری یالاشعوری الجھنیں تھیں جنھیں اقبال حل نہیں کر پائے۔ اقبال کے لاکھوں چاہنے والوں میں سے مجھ جیسے ایک عام انسان کو یہ نظر آتا ہے کہ اقبال اپنی پہلی شادی کی ناکامی کی وجہ سے ہمیشہ مضطرب رہے اور شاید انھیں یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ کیا عطیہ فیضی جیسی ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والی تعلیم یافتہ خاتون ان کے گھر کے ماحول سے یا اس معاشرے سے جس سے ان کا تعلق تھا ایڈجسٹ ہو پائے گی۔ اسی ذہنی کشمکش میں وہ کوئی قدم نہ اٹھا سکے۔

اقبال کے دورۂ حیدرآباد واورنگ آباد کا ایک موازنہ کیا جائے کہ انھیں ذاتی طور پر اس دورے سے کیا حاصل ہوا تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں اپنے مقاصد میں جو وہ اپنے ذہن میں لے کر آئے تھے ناکامیابی ہوئی۔ وہ حیدرآباد میں حکمراں ریاست سے ملاقات نہیں کر پائے اور ریاست کے پس ماندہ مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی ترقی کے بارے میں کوئی تجویز نہیں دے سکے۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ کے تعلق سے جو ایک بہت اعلیٰ پائے کی نظم لکھنے کا انھوں نے اعلان کیا تھا وہ نہیں لکھ پائے۔ (بعد میں انھوں نے ۲۶ اشعار پر مشتمل ایک نظم فارسی زبان میں لکھی جو ''رموز بے خودی'' میں شامل ہے)۔ سب سے بڑا نقصان ان کے اور عطیہ فیضی کے درمیان دوستی کے تعلقات میں دراڑ پڑ جانا ہے۔ کاش اقبال عطیہ کی خواہش کا احترام کرتے، دو تین دن رخصت کی میعاد میں توسیع کر لیتے اور اورنگ آباد سے بمبئی (جنجیرہ) چلے جاتے۔ لیکن ابن آدم اور بنتِ حوا مشیت ایزدی کے نظام میں پوری طرح بے بس ہیں۔

عطیہ فیضی اور اقبال کے درمیان ہوئی مراسلت سے ایک اندازہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے سلطنتِ آصفیہ سے وابستہ ہو جانے کے خیال کو ناپسند کرتی تھیں۔ راقم کے نزدیک یہ عطیہ فیضی کا اردو ادب اور برصغیر کے مسلمانوں پر احسانِ عظیم ہے کہ انھوں نے اقبال کو اس خیال سے باز رکھا۔ اگر ایسا خیال اقبال کے ذہن کے کسی گوشے میں تھا اور اگر وہ سلطنتِ آصفیہ سے وابستہ ہو جاتے تو ان کی حیثیت درباری شاعروں جیسی ہو جاتی۔ جن کا کام بادشاہِ وقت کی مدح سرائی ہوتا۔ وہ شاعری وجود میں نہیں آتی جو آج براعظم ایشیا کے کروڑوں لوگوں کے دل و دماغ میں اور ان کے ہونٹوں پر زندہ ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ زندہ رہے گی۔

☆☆☆

بیان ملکیت سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل

مطابق فارم نمبر ا، قاعدہ نمبر ۳

ا۔ جرنل کا ٹائٹل	:	خدا بخش لائبریری جرنل
۲۔ وقفہ اشاعت	:	سہ ماہی
۳۔۴۔ پرنٹر و پبلشر کا نام	:	محمد جاوید اشرف
قومیت	:	ہندستانی
پتہ	:	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۵۔ ایڈیٹر کا نام	:	ڈاکٹر شائستہ بیدار
قومیت	:	ہندستانی
پتہ	:	ڈائریکٹر، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ
۶۔ ملکیت	:	خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

میں محمد جاوید اشرف اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر: محمد جاوید اشرف

پروفیسر ریاض الرحمن شروانی

کے

کانفرنس گزٹ (علی گڑھ) کا اشاریہ

۲۰۰۲ء تا ۲۰۱۶ء

(ش)

پڑھنے والوں، ریسرچ کرنے والوں، اپنے مواد کو تلاش کرنے والوں، کے لئے آسانیاں پیدا کرتے چلے جائیں، یہ ہدف سامنے رکھ کے ہم نے ایک ریفرنس سروس شروع کردی ہے۔ وقت کو دوسروں کی نذر کرنے کا صلہ کہاں ملتا ہے، اور ممکن بھی کیسے ہے۔ اصل صلہ تو مالک الملک کے ہاتھوں میں ہے۔ وباللہ التوفیق!

پیش گفتار

کانفرنس گزٹ جو نئی ادارت اور نئی فکر کے ساتھ، (ریاض صاحب کے الفاظ میں فکرِ نو) ۲۰۰۲ء سے از سرِ نو شروع ہوا، اور ۲۰۱۶ء میں علی گڑھ کی Petty Politics کی نذر ہوا، بلکہ ایک معنی میں نذر ہوتے ہوتے بچ گیا، اور اب فکر نو کے نام سے نئے قالب میں نمودار ہو گیا، یہ اس ایک معنی میں مرحوم کانفرنس گزٹ کا اشاریہ ہے، یا یوں کہیے **پروفیسر ریاض الرحمن شروانی کے کانفرنس گزٹ کا اشاریہ**۔ اس پر ہمارا زور (Emphasis) یوں بھی ہے کہ بہت سے لوگ اسے پروفیسر شروانی کی تحریروں کے لئے ہی پڑھتے تھے، بلکہ بے تابی سے ان تحریروں کا انتظار کرتے تھے کہ نیا مہینہ نیا پرچہ لے کے آئے تو دیکھیں کیا سوغات ملتی ہے۔ شکر ہے پچھلے ایک سال سے وہی سوغات **فکر نو** میں ڈھل کے لوگوں کی پیاس بجھاتی رہی ہے۔

کانفرنس گزٹ کے تبصرے **کتابوں کے درمیان** کے نام سے مرتب ہو کے یکجا شائع ہو گئے۔ ان کا ضروری اشاریہ ہم پیش کر چکے۔ ریاض صاحب کے قلم سے رسالے کے اداریئے مرتب ہو کے شذرات ریاض الرحمن شروانی کے نام سے شائع ہو چکے۔ ہم نے خیال کیا کہ ان شذرات میں سے اہم ترین تحریریں موجودہ ترتیب میں بھی شامل کر دیں، سارے اداریے ان کی مستقل بالذات کتاب **شذرات** میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

اس اشاریہ کی ترتیب **موضوع** وار پہلے ہے، پھر **مصنف** وار ہے ایک انڈیکس عنوان وار بھی بنایا تھا، مگر اس کی کوئی خاص افادیت نظر نہیں آئی، کیوں کہ موضوع وار فہرست بنانے میں سب کچھ سمٹ آیا، صرف چند جگہ موضوع کا تقاضا تھا کہ الفاظ آگے پیچھے کر لیے جاتے، وہ بھی ہو گیا تو اب عنوان وار فہرست کی کوئی خاص ضرورت رہی نہیں، **موضوع** کو ہی **عنوان** سمجھ کر موضوع وار کو عنوان وار سمجھا جائے۔

امید ہے ریسرچ اور ریفرینس کے اشاریوں کے سلسلہ میں یہ پیش نظر اشاریہ بھی پسند خاطر ٹھہرے گا۔

ریاض صاحب محترم کے بارے میں چند ضروری باتیں ہم سے سن لیں:

حبیب گنج (بھیکم پور) کے نواب صدر یار جنگ حبیب الرحمن خان شروانی، سابق ریاست حیدرآباد کے ناظم امورِ مذہبی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے بانیوں میں شامل، مولانا ابوالکلام آزاد کے **صدیقِ مکرم**، ان کا علمی اور ادبی ذوق ایک سیڑھی چھلانگ لگا کے صدر یار جنگ کے پوتے، (خان بہادر عبیدالرحمن خاں شروانی کے فرزند) ریاض صاحب کو پہنچا اور پورا پورا پہنچا: کچھ سود کے ساتھ۔

ریاض صاحب نے علی گڑھ، لاہور اور پھر دوبارہ علی گڑھ میں تعلیم کے مرحلے طے کیے، جس کی تفصیل ان کی آٹو بایو گرافی **دھوپ چھاؤں** میں ملے گی۔ ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ کے شعبۂ عربی واسلامیات سے منسلک ہوئے، اچھے استاد اور اچھے اسکالر کی حیثیت سے مقبول رہے، سید حامد صاحب کے آغازِ کار تک علی گڑھ میں رہے پھر کشمیر یونیورسٹی کے عربی اسلامک اسٹڈیز کے بانی چیئرمین اور پروفیسر رہے، اور وہیں سے ریٹائر ہو کر وطن (حبیب منزل، میرس روڈ علی گڑھ) واپس آگئے، آنے کے بعد اصل دلچسپی تو ناظم اعلیٰ کے بطور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی دیکھ ریکھ سے رہی، لیکن ۲۰۰۲ء میں کانفرنس کے آرگن کے طور سے انھوں نے جو کانفرنس گزٹ کی اشاعت شروع کی، اس نے کانفرنس اور اس کے پرچے کو دور دور مشہور کر دیا، خاص کر گزٹ کے اداریوں اور کتابوں پر تبصرے پڑھنے کے لئے لوگ بے بیتابی سے ہر نئے مہینے کا انتظار کرتے تھے۔ کانفرنس گزٹ کا **دورِ ریاض** ۲۰۱۶ء میں ختم ہوا (ایجوکیشنل کانفرنس کی انتظامیہ میں تبدیلی اور ریاض صاحب کی عملاً اس سے علیحدگی کے بعد انہوں نے ۲۰۱۷ء میں **فکرِ نو** کے نام سے اپنا ذاتی رسالہ شروع کیا)، تو ہم نے سوچا کانفرنس گزٹ رسالوں کی دنیا میں اپنی ایک تاریخ بنا گیا ہے اس لئے اس کا ایک اشاریہ بن جانا چاہیے، امید ہے ہماری یہ کوشش پسند کی جائے گی۔

(ش)

1. آفتاب احمد خاں (از اولاد احمد صدیقی) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۳ء
2. اکثریتی فرقہ کے افراد کو اقلیتی فرقے کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا چاہیے (از نسیم احمد، وائس چانسلر) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۳ء
3. آل احمد سرور کی ایک نادر تحریر: حرفے چند، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۶ء
4. آل احمد سرور (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۱ء
5. آل احمد سرور: اپنی جنت پکی کرنا کافی نہیں، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۵ء
6. آل احمد سرور۔ چند بکھری یادیں (از سلیم قدوائی) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۵ء
7. آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال (از امان اللہ خاں شروانی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
8. آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور تعلیم نسواں (از ظفر الاسلام اصلاحی) کانفرنس گزٹ، نومبر، دسمبر، ۲۰۰۷ء
9. آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دینی تعلیم (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۳ء
10. آل علی نقوی، خان صاحب سید: اقتباس خطبۂ صدارت) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۴ء
11. احسن مارہروی (از مرتضی حسین بلگرامی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۵ء
12. اسلام جنوبی ہند کے بین المذاہبی معاشرے کے تناظر میں (از احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۰ء

13. اسلوب احمد انصاری کو مولانا آزاد ایوارڈ) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۵ء
14. اسلوب احمد انصاری کے حضور میں (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۶ء
15. الطاف علی بریلوی (از امان اللہ خاں شروانی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۳ء
16. امجد علی (از سید احتشام ندوی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۷ء
17. امیر عارفی صاحب کا انتقال (۱۳ فروری ۲۰۰۵ء) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۵ء
18. انجم اعظمی۔ ایک چراغ تھا جو بجھ گیا (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اپریل تا جون، ۲۰۰۶ء
19. اولاد احمد صدیقی کا مضمون گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۳ء
20. ایک حکایت (از شاہد قمر قاضی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۵ء
21. ایک مثالی علیگ (از سلیم قدوائی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۶ء
22. ایک نادر دستاویز (از سید مرتضیٰ حسین بلگرامی) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۱ء
23. ایم اے او کالج۔ مرقع کالج پر ایک طائرانہ نظر (از ثاقب صدیقی) کانفرنس گزٹ، اپریل تا جون، ۲۰۰۶ء
24. ایم حبیب خاں (از کبیر احمد جائسی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۰ء
25. بابائے اردو (از مختار الدین احمد) کانفرنس گزٹ، جولائی، اگست ۲۰۰۷ء
26. بابری مسجد رام مندر پر پروفیسر حقی کا کارنامہ (از شائستہ خان) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۱ء
27. باقر مہدی صاحب کا انتقال (۲۴ ستمبر) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء

28. ترانۂ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تاریخی پس منظر (از ہارون قمر علی خاں) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۹ء
29. ترانہ۔ یونیورسٹی ترانے کا عربی ترجمہ (از محمد صلاح الدین عمری) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۲ء
30. تفسیر سرسید میں مفردات القرآن (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۰ء
31. تقی امینی، محمد (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۵ء
32. تن ہمہ داغ داغ شد (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۶ء
33. جائسی نامہ (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۴ء
34. جذبی کی یاد میں (از رفعت سروش) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۵ء
35. جعفر رضا زیدی (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۱۱ء؛ جنوری ۲۰۱۲ء
36. حافظ علی بہادر خاں: میری یادداشت سے، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۰ء
37. حافظ غلام مصطفی (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۸ء
38. حالی، شبلی اور سعدی (از آصف نعیم صدیقی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۵ء
39. حالی کی تعلیمی خدمات (از سید جمیل احمد نقوی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۳ء
40. حالی کی حیات جاوید کا انگریزی ترجمہ (از اصغر عباس) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۷ء
41. حالی کی حیات سعدی (از آصف نعیم صدیقی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۶ء
42. حالی کی نظم اور ترکیب بند مولانا حالی (مرسلہ امان اللہ خاں شروانی) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۲ء
43. حامد انصاری: قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کا سرسید پر منعقد سہ روزہ سمینار کے افتتاحی جلسے سے خطاب، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۶ء
44. حامد انصاری کا میموریل لیکچر میں خصوصی خطبہ، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۶ء

45. حامد علی خاں، میرے محسن عزیز (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۷ء
46. حبیب الرحمن خاں شروانی مقالات شروانی کی توضیحی اشاریے کی روشنی میں (از سید مسعود حسن) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۹ء
47. حبیب صاحب پر۔ پروفیسر محمد حبیب (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۰ء
48. حکیم افہام اللہ (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۴ء
49. حکیم ظل الرحمن، پدم شری سے سرفراز (منقول راشٹریہ سہارا، نئی دہلی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۶ء
50. حکیم عبدالحمید جیسا شخص دس جنموں میں بھی نہیں پیدا ہوتا (از آئی۔ کے۔ گجرال) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۶ء
51. حکیم عبداللطیف فلسفی (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۴ء
52. حکیم محمد طیب (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۴ء
53. حکیم محمد طیب کی یاد میں (از ابوالکلام قاسمی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۳ء
54. خسرو صاحب سابق وائس چانسلر کا انتقال (از۔۔۔) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۳ء
55. خسرو صاحب۔ ایک یادگار واقعہ (از ظفرالاسلام اصلاحی) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۳ء
56. خسرو۔ ایک ذاتی تاثر (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۳ء
57. خلیق احمد نظامی (از احتشام حسین احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۱ء
58. خلیق احمد نظامی، مینارۂ علی گڑھ (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۷ء

59. خواجہ حسن عسکری کی کہانی، کچھ ہماری، کچھ ذاکر علی خاں کی زبانی (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۸ء

60. خورشید احمد فارق (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۴ء

61. خورشید احمد فارق (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۵ء

62. خورشید الاسلام کا انتقال، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۶ء

63. خورشید الاسلام رخصت ہوگئے (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۶ء

64. دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں شبلی صدی بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد (از ظفر الاسلام اصلاحی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۵ء

65. ڈاکٹر رشید جہاں کی زندگی اور کارناموں پر بین الاقوامی سمینار (از سیما صغیر) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۵ء

66. ڈاکٹر عبدالعلیم (از خواجہ محمد شاہد) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۷ء

67. ذاکر حسین خاں صاحب: یادیں، باتیں اور ملاقاتیں (از محمد سالم قدوائی) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۲ء

68. ذاکر حسین خاں: اقتباس خطبۂ صدارت) کانفرنس گزٹ، جنوری، فروری ۲۰۰۴ء

69. ذاکر علی خاں، محمد (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۲ء

70. ذاکر علی گڑھ (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۶ء

71. ذکر یاد ماضی (از مرتضی حسین بلگرامی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۵ء

72. راجہ جے کشن داس بہادر سی۔ایس۔آئی (از سید بدرالدین، متعلم مسلم یونیورسٹی)، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۴ء (غالباً ۱۹۳۹ء کے علی گڑھ میگزین سے منقول)

73. راس مسعود اور اردو ادب (از مولوی نظام الدین حسین نظامی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۴ء

74. راس مسعود: اقتباس خطبۂ صدارت) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۳ء
75. راہی معصوم رضا کے ادب پر مذاکرہ) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۴ء
76. رحم علی الہاشمی کی یادیں (از شائستہ خاں) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۳ء
77. رحمت اللہ خاں شروانی، نواب کی یاد میں (از مسعود انور علوی کاکوروی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۲ء
78. رحمت اللہ خاں شروانی، نواب (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۲ء
79. رحمت اللہ خاں شروانی، نواب (از مسعود الحسن) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۲ء
80. رحمت اللہ خان شروانی، نواب (از سید مرتضی حسین بلگرامی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۲ء
81. رشید احمد صدیقی (از ثاقب صدیقی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۱ء
82. رشید احمد صدیقی (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۰ء
83. رشید احمد صدیقی۔ دو ملاقاتیں (از سلیم قدوائی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۵ء
84. رشید جہاں (از ثاقب صدیقی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۶ء
85. رشید صاحب کا مکتوب بنام قاضی عبدالغفار (از حکیم سید ظل الرحمن) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۴ء
86. رشیدیات (از عبدالغفار شکیل) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۱ء
87. ریاض الرحمن شروانی (مترجم): درد کا رشتہ (از وجیا نرونے، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۱ء
88. ریاض الرحمن شروانی (مترجم): خاموشی کے خلاف، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۶ء
89. ریاض الرحمن شروانی: کم از کم مشترکہ پروگرام، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۴ء

90. ریاض الرحمن شروانی کا: تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام از سر سید احمد خاں پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۵ء

91. ریاض الرحمن شروانی کا: حضرت مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی علمی شخصیت اور فکری بصیرت مرتبہ سید احتشام احمد ندوی پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۷ء

92. ریاض الرحمن شروانی کا: دستاویزات ایجوکیشنل کانفرنس مرتبہ اقبال حسین پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۴ء

93. ریاض الرحمن شروانی کا: ڈھونڈھو گے انہیں (خاکے) از کبیر احمد جائسی پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۵ء

94. ریاض الرحمن شروانی کا: علامہ عبدالعزیز میمنی۔ حیات و خدمات پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۴ء

95. ریاض الرحمن شروانی کا: مولانا عبدالسلام ندوی از کبیر احمد جائسی پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۵ء

96. ریاض الرحمن شروانی کا: نقوش تابندہ از اخلاق احمد پر تبصرہ کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۵ء

97. ریاض الرحمن شروانی کا: آئین اکبری از ابوالفضل علامی پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۶ء

98. ریاض الرحمن شروانی کا: علمائے سلف از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۶ء

99. ریاض الرحمن شروانی کا: کارگہ شیشہ گری از ڈاکٹر مجیب احمد خاں پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۶ء

100. ریاض الرحمن شروانی کا: حکیم اجمل خاں از حکیم سید ظل الرحمن پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء
101. ریاض الرحمن شروانی کا: فکر اسلامی کے فروغ میں شیخ سرہندی کی خدمات مرتبہ عبدالعلی اور ظفر الاسلام، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
102. ریاض الرحمن شروانی کا: تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۶ء
103. ریاض الرحمن شروانی کا: معاصر شخصیات مرتبہ: پروفیسر شاہ عبدالسلام پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۷ء
104. ریاض الرحمن شروانی کے: امریکہ کا شام و سحر از اخلاق احمد پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۶ء
105. ریاض الرحمن شروانی: اقلیتی کردار، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۶ء
106. ریاض الرحمن شروانی: ایک تعلیمی سفر، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۵ء
107. ریاض الرحمن شروانی: ایک ساتھی کی یاد، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۵ء
108. ریاض الرحمن شروانی: تین ساتھی، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۵ء
109. ریاض الرحمن شروانی: دینی مدارس اور جدید دور میں ان کے مسائل (اداریہ)، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۵ء
110. ریاض الرحمن شروانی: سیکولرزم، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۵ء
111. ریاض الرحمن شروانی: یادرفتگاں) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۴ء
112. ریاض الرحمن شروانی: یاد یار مہرباں آید ہمی، کانفرنس گزٹ، اپریل تا جون، ۲۰۰۶ء
113. ریاض الرحمن شروانی: ایک استاد کی یاد، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۴ء
114. زاہدہ زیدی (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، فروری، مارچ ۲۰۱۱ء

115. سبحان اللہ عظیم گور کھپوری کا سفر نامۂ حج (از اصغر عباس) کانفرنس گزٹ، نومبر، (نومبر ۲۰۱۵ تا جنوری ۲۰۱۶ء

116. سچر کمیٹی رپورٹ ایک جائزہ (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۷ء

117. سر سید احمد خاں کی الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ پر تبصرہ (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۴ء

118. سر سید ایک مومن صادق اور شاہ ولی اللہ ایک عالم کبیر (از شائستہ خان) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۰ء

119. سر سید پر کتاب۔ سد احمد خاں۔ حیات وافکارہ از محمد صلاح الدین العمری (تبصرہ از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۴ء

120. سر سید پر۔ مطالعات سر سید (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۹ء

121. سر سید کا نقطہ نظر (از شان محمد صاحب) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۳ء

122. سر سید کو مولانا آزاد کا خراج عقیدت (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۴ء

123. سر سید کی سیرت فریدیہ کی مختلف اشاعتیں (از اصغر عباس) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۰ء

124. سر سید کی ضرورت۔ کل اور آج (از سید مرتضیٰ حسین بلگرامی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء

125. سر سید کے مطالعہ کی نئی جہت (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، نومبر، دسمبر ۲۰۰۳ء

126. سرسید کے مکتوب سرسید احمد خاں بنام نواب محمد اسحاق خاں (مرسلہ محمد معتصم عباسی آزاد) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۱ء
127. سرسید کی نظر میں سیاست اور مذہب (از جمال خواجہ) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۴ء
128. سرسید کی نظر میں عربی و فارسی زبان و ادب اور دینی علوم (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
129. سرسید، اکبر اعظم اور محمد حسین آزاد کی ذہنی مماثلتیں (از اصغر عباس) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۴ء
130. سر شاہ سلیمان: علوم مغربی (اقتباس خطبہ صدارت) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۳ء
131. سر ضیاء الدین احمد کچھ یادیں کچھ باتیں (از مختار الدین احمد) کانفرنس گزٹ، اپریل، مئی، ۲۰۰۷ء
132. سر راس مسعود اور اردو ادب (از نظامی بدایونی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۱ء
133. سرسید ''اسباب بغاوت ہند'' کی روشنی میں (از شاہد قمر قاضی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
134. سرسید احمد خاں کا مرثیہ (از مولوی نذیر احمد، شمس العلماء) کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
135. سرسید احمد خاں اور جدت پسندی۔ تعارف و تبصرہ (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۴ء
136. سرسید احمد خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء
137. سرسید احمد خاں کے خطوط) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
138. سرسید اور حالی (از اصغر عباس) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۵ء

139. سرسید اور زراعت (۱۱ قسطوں میں، اگست ۲۰۱۳ تا اکتوبر ۲۰۱۴) (از افتخار عالم خاں) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۳ء
140. سرسید اور سیکولرزم (از شمیم الدین) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۲ء
141. سرسید اور علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام (از پرویز عالم خاں) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۵ء
142. سرسید اور قدیم وجدید تعلیم کا امتزاج (از ظفر الاسلام اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
143. سرسید اور محمد حسین آزاد (از اصغر عباس) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۰ء
144. سرسید اور نیشنل کانگریس (از افتخار عالم خاں) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۶ء
145. سرسید ایک خواب اور اس کی تعبیر (از نور الحسن نقوی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
146. سرسید پاکستان میں (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۵ء
147. سرسید پاکستان میں کیوں ہار گئے اور اقبال کیوں جیت گئے (از پرویز ہدیٰ بھائی/مترجم ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۳ء
148. سرسید پر تحقیقی خدمات کس انداز سے؟ (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۸ء
149. سرسید تحریک کی ایک نئی نمائندگی (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء
150. سرسید ثانی الحاج سید حامد نہ رہے (از سید مرتضی حسین بلگرامی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۵ء
151. سرسید درون خانہ از افتخار عالم (تبصرہ از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۷ء

152. سرسید درونِ خانہ پر ایک نظر (از اولاد احمد صدیقی) کانفرنس گزٹ، جون، جولائی ۲۰۰۷ء
153. سرسید راس مسعود (از سید بدرالدین صاحب) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۳ء
154. سرسید راس مسعود (از مولوی عبدالحق) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۴ء
155. سرسید راس مسعود (از مولوی عبدالحق) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۴ء
156. سرسید کا اصلی کارنامہ (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۵ء
157. سرسید کا ایک خط (مرسلہ شاہد قمر قاضی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۳ء
158. سرسید کا تہذیبی و معاشرتی شعور تہذیب الاخلاق کے حوالے سے (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
159. سرسید کا دینی تصور (از ابوسفیان اصلاحی،) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۵ء
160. سرسید کا روایت سے انحراف (از افتخار عالم خاں) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۵ء
161. سرسید کا مدرسہ اور حالی کا مٹی کا دیا (از مہر الٰہی ندیم علیگ) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۴ء
162. سرسید کا ایک بڑا کارنامہ (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۳ء
163. سرسید کا سفر نامہ 'مسافران لندن' (از مسعود الحسن) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۰ء
164. سرسید کے ایک رفیق منشی نجم الدین (از مختار الدین احمد) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۷ء
165. سرسید کے ایک رفیق: منشی نجم الدین (از مختار الدین احمد) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۷ء
166. سرسید کی تحریک، اس کی معنویت اور عصر جدید کے تقاضے (از شاہ محمد وسیم) کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء

167. سرسید کی تحریک۔مایوسی کے اندھیرے میں روشنی کی علامت)کانفرنس گزٹ،اکتوبر و نومبر،۲۰۰۲ء
168. سرسید کے تذکرۂ اہل دہلی میں عربی الفاظ(ازابوسفیان اصلاحی)کانفرنس گزٹ،اکتوبر،۲۰۱۲ء
169. سرسید کی تصحیح کردہ تاریخ فیروز شاہی(ازاصغر عباس)کانفرنس گزٹ،اکتوبر،۲۰۰۶ء
170. سرسید کی صحافت(از مسعود الحسن)کانفرنس گزٹ،نومبر،۲۰۱۲ء
171. سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی،(حیات سرسید،افکار سرسید کے مرتب ضیاءالدین لاہوری(تبصرہ از ریاض الرحمن شروانی)کانفرنس گزٹ،اکتوبر،۲۰۰۵ء
172. سرسید کی لندن سے کچھ نایاب تحریریں(ازاصغر عباس)کانفرنس گزٹ،اکتوبر،۲۰۱۲ء
173. سرسید کی نظر میں عورتوں کے مسائل(ازابوسفیان اصلاحی)کانفرنس گزٹ، اکتوبر،۲۰۰۶ء
174. سرسید کی یاد(از حبیب الرحمان خاں شروانی)کانفرنس گزٹ،اکتوبر،۲۰۰۳ء
175. سرسید کی یادگاروں کی تباہی غازی پور میں اور کارپردازانِ مسلم یونیورسٹی کی غفلت کی داستان(از عزیز الحسن صدیقی،مولانا)کانفرنس گزٹ،جولائی،۲۰۱۱ء
176. سرسید مغرب کی نظر میں(از شاہد قمر قاضی)کانفرنس گزٹ،نومبر،۲۰۰۶ء
177. سرسید میموریل لکچر ۲۰۰۴ء(از ریاض الرحمن شروانی)کانفرنس گزٹ، دسمبر،۲۰۰۴ء
178. سرسید نے طلباء کے لئے درس قرآن کا اہتمام کیا(از ظفرالاسلام)کانفرنس گزٹ،جنوری،۲۰۰۳ء
179. سرسید ہاؤس منزل بہ منزل(ازاصغر عباس)کانفرنس گزٹ،اکتوبر و نومبر،۲۰۰۲ء

180. سر سید وایم اے او کالج اور دینی و مشرقی علوم (از ظفر الاسلام اصلاحی) (تبصرہ از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۴ء
181. سر سید، انگریز اور نظریۂ وفاشعاری (از افتخار عالم خاں) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۲ء
182. سر سید۔ ایک تحریک (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۳ء
183. سر سید احمد خاں اور غازی پور (از پرویز احمد) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۱ء
184. سر شاہ سلیمان اور اردو ادب (از نظام الدین حسین نظامی) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۴ء
185. سرور صاحب کے بارے میں؛ جلوۂ سرور (از اصغر عباس) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۵ء
مزید ملاحظہ ہو آل احمد سرور
186. سلیمان اشرف، محمد (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۲ء
187. سلیمان اشرف، محمد (از احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اپریل، مئی، ۲۰۱۲ء
188. سمیع اللہ خاں 'مسافران لندن' کی روشنی میں (از خواجہ محمد شاہد) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۳ء
189. سمیع اللہ خاں اور ان کا سفر نامہ مسافران لندن (از اصغر عباس) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۳ء
190. سمیع اللہ خاں (مولوی) کا سفر نامہ مسافرانِ لندن (از مسعود الحسن) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۳ء
191. سید امین اشرف (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، مارچ، اپریل ۲۰۱۳ء
192. سید حامد کا سر سید یادگاری خطبہ) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۳ء

193. سید حامد کے مکاتیب بنام اصغر عباس (از اصغر عباس) کانفرنس گزٹ، مارچ، مئی، جون ۲۰۱۵ء
194. سید محمد احمد۔ پرستار ادارۂ سرسید (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۱ء
195. سید محمود، جسٹس (از مولوی عبدالحق) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۴ء
196. سید مقبول (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۲ء
197. سید ہاشم علی صاحب کی کچھ یادیں کچھ باتیں (از محمد سالم قدوائی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۸ء
198. شان الحق حقی صاحب کا انتقال (۱۱، اکتوبر) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۵ء
199. شاہ دین ہمایوں، جسٹس: مسلمانوں میں تربیت نفس کی کمی کا نقص عظیم (اقتباس خطبہ صدارت) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۳ء
200. شائستہ خاں: مولانا آزاد لائبریری میں آزادی کی کے بعد قیمتی اضافے، کانفرنس گزٹ، مارچ، اپریل ۲۰۱۴ء
201. شائستہ خان: ۱۹۲۵۔۱۹۲۷ کے ہندوستان کی کچھ جھلکیاں، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۱۰ء
202. شائستہ خان: پروفیسر محمد حبیب، نظام الدین اولیاء کے حضور میں، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۱ء
203. شائستہ خاں: شہریار (نصف صدی قبل اور ربع صدی قبل)، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، نومبر ۲۰۱۵ء
204. شائستہ خاں: علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ مسئلہ، آزادی کے بعد، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۶ء
205. شائستہ خان: معربات رشیدی مصنفۂ عبدالستار صدیقی، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۰ء

206. شبلی صدی (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۵ء
207. شبلی کا نواب صدر یار جنگ کے نام خط (از پیش کش: آصف نعیم صدیقی) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۱۶ء
208. شبلی کے بارے میں: اصلی شبلی (از فیض الرحمن اعظمی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۰ء
209. شبلی کی تقریر، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس میں (از ابو علی اثری مرحوم) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۳ء
210. شبلی کے دبستاں کے ارکانِ ثلاثہ (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۸ء
211. شبلی کی سیاسی بصیرت (از شاہد ماہلی) کانفرنس گزٹ، اپریل، مئی، ۲۰۱۵ء
212. شبلی کی یاد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ۲۸ ویں اجلاس میں (منقول از سالانہ رپورٹ کانفرنس بابت ۱۹۱۴ء)) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء
213. شبلی معاصرین کی نظر میں مرتب ظفر احمد صدیقی پر تبصرہ (تبصرہ از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۶ء
214. شبلی نعمانی اور مدارس اسلامیہ میں جدید تعلیم اور انگریزی (از فیروز بخت احمد) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۳ء
215. شبلی نعمانی حیات وافکار دو روزہ سمینار دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (از محمد عمیر الصدیق؟ دریابادی ندوی، حافظ) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء
216. شبلی نعمانی سمینار دارالمصنفین اعظم گڑھ (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء
217. شبلی نعمانی کی غیر مدوّن پہلی تقریر (از اصغر عباس، پروفیسر) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۱ء

218. شبلی۔اصلی شبلی کی تلاش میں (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، جنوری،۲۰۱۱ء
219. شفیع صاحب پر۔پروفیسر محمد شفیع کی رحلت (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، جنوری،۲۰۰۸ء
220. شفیق انجم ایک خوش فکر شاعر (از اولاد احمد صدیقی) کانفرنس گزٹ جون،۲۰۰۴ء
221. شمس الرحمن فاروقی کا مجموعہ آسماں محراب (از سید امین اشرف) کانفرنس گزٹ، ستمبر،۲۰۱۱ء
222. شہر سرسید کا ایک اور چراغ بجھا (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، فروری،۲۰۰۷ء
223. شہریار سے مکالمہ (از راشد عزیز) کانفرنس گزٹ، دسمبر،۲۰۱۰ء
224. شہریار، وہ جو آسماں پہ ستارہ تھا (از شمس الرحمن فاروقی) کانفرنس گزٹ، جولائی،۲۰۱۲ء
225. شہریار (نصف صدی قبل اور ربع صدی قبل) (از شائستہ خاں) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، نومبر ۲۰۱۵ء
226. شہریار اقبال سمان سے سرفراز (کتاب نمائی دہلی) کانفرنس گزٹ، مارچ،۲۰۰۵ء
227. شہریار کو اعزاز (از۔۔۔) کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
228. شہریار کی یاد (از اخلاق احمد) کانفرنس گزٹ، اگست،۲۰۱۳ء
229. شہریار! تم بھی چلے گئے (از مجتبیٰ حسین) کانفرنس گزٹ، جولائی،۲۰۱۲ء
230. شیخ عبدالرشید (جنوری، فروری ۲۰۰۸) (از محمد ذاکر علی خاں) کانفرنس گزٹ، جنوری،۲۰۰۸ء
231. صاحب باغ، ڈیوٹی ہوسٹل سے سلیمان ہال تک (از افتخار عالم خاں) کانفرنس گزٹ، نومبر،۲۰۰۳ء
232. صاحب زادہ آفتاب احمد خاں: اتحاد کا یقینی ذریعہ (اقتباس خطبۂ صدارت، خطبات عالیہ حصہ سوم)) کانفرنس گزٹ، اپریل،۲۰۰۳ء

233. صدر یار جنگ کی خدمات اردو (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۳ء
مزید دیکھیے ''حبیب الرحمن خاں شروانی''
234. صدر یار جنگ کی خدمات اردو (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۳ء
235. ضیاء احمد بدایونی (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۱ء
236. طیب جی کی خود نوشت کا ایک دلچسپ ٹکڑا (از مترجم: شائستہ خاں) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۰ء
237. ظل احمد نظامی (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۶ء
238. ظہور الحق، ڈاکٹر محمد (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۷ء
239. عابد اللہ غازی کا مضمون، ''مقاصد کی لگن''، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۵ء
240. عابد اللہ غازی: مثبت اور منفی طرز فکر، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۵ء
241. عبد الحق انصاری (پروفیسر) کی فکری جہات و ترجیحات کے کچھ پہلو (از عبد الحمید نعمانی) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۱۲ء
242. عبد الحلیم صدیقی (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۲ء
243. عبد الحلیم کا انتقال (۱۲ر اکتوبر) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۵ء
244. عبد السلام قدوائی ندوی (از محمد سالم قدوائی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۵ء
245. عبد السلام قدوائی ندوی۔ میری نظر میں (از محمد شمیم جیراج پوری) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۲ء
246. عبد العزیز میمنی۔ حیات و خدمات پر تبصرہ (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۴ء

247. عبدالعلیم، پروفیسر (مختصر جائزہ)(از سید مرتضی حسین بلگرامی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۸ء

248. عبدالعلیم خاں کی افسوس ناک وفات (از مختار الدین احمد) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء

249. عبدالعلیم، پروفیسر آئینہ ایام میں (جون جولائی ۲۰۰۸)(از احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۸ء

مزید ملاحظہ ہو "ڈاکٹر عبدالعلیم"

250. عبداللہ یوسف علی: مسلمانوں کی تعلیم اور حالتِ امید و بیم)(اقتباس خطبۂ صدارت) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۳ء

251. عبدالماجد دریابادی کے حضور میں (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۵ء

252. عتیق احمد صدیقی (متوفی ۱۶ نومبر ۲۰۰۴ء)(از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۱ء

253. عتیق احمد صدیقی صاحب کا انتقال) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء

254. عشرت فاروقی کی وفات پر (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۳ء

255. علی گڑھ، میرا علی گڑھ (از سید محمد ٹونکی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۴ء

256. علی گڑھ ۱۹۱۱ء میں: ایک انسائیکلوپیڈیا (از شائستہ خان) کانفرنس گزٹ، جولائی، اکتوبر ۲۰۰۸ء

257. علی گڑھ برادری کی رائے جمہوریت کے بارے میں، کچھ اوروں کی، کچھ میری زبانی (از محمد ظل الرحمن خاں) کانفرنس گزٹ، نومبر، دسمبر ۲۰۱۲ء

258. علی گڑھ تحریک (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۵ء

259. علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ مسئلہ، آزادی کے بعد (از شائستہ خان) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۶ء
260. علی گڑھ تحریک خصوصاً آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا حصہ اردو کی ترویج و ترقی میں (از امان اللہ خاں شروانی) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۳ء
261. علی گڑھ قاہرہ میں (از مختار الدین احمد) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۸ء
262. علی گڑھ کا پیغام (از عبداللہ غازی) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۵ء
263. علی گڑھ کا حصہ اردو صحافت میں (از صدر عالم) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۳ء
264. علی گڑھ کا زمانہ طالب علمی (جون، جولائی ۲۰۰۹) (از ہارون قمر علی خان) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۹ء
265. علی گڑھ کی انسائیکلوپیڈیا (از شائستہ خاں) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۶ء
266. علی گڑھ کی انسائیکلوپیڈیا (تیسری و آخری قسط) (از شائستہ خاں) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۶ء
267. علی گڑھ کی انسائیکلوپیڈیا۔ ۳ (از شائستہ خاں) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
268. علی گڑھ کی تاریخ (از ہارون قمر علی خاں، علیگ) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۲ء
269. علی گڑھ کی تعلیمی تحریک (از خواجہ غلام السیدین) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۶ء
270. علی گڑھ کی چند شخصیتیں (از خلیل الرحمن اعظمی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۶ء
271. علی گڑھ کے دو نامور فرزندوں کا حصہ، ہندوستان کی جنگ آزادی میں (از ہارون خاں شروانی، ترجمہ ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۶ء
272. علی گڑھ کی روایات (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۳ء
273. علی گڑھ کے مردانِ کار (از نواب بہادر الحاج مولانا محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی صدر یار جنگ بہادر) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۳ء

274. علی گڑھ کے مشاہیر کی انسائیکلوپیڈیا(از شائستہ خاں)کانفرنس گزٹ، فروری،مارچ،۲۰۰۶ء

275. علی گڑھ کی نذر(از طاہرہ حسین)کانفرنس گزٹ،جولائی،۲۰۰۴ء

276. علی گڑھ کی یاد میں۔چانداب بھی نکلتا ہے مگر(از زیدی جعفر رضا،راہی معصوم رضا) کانفرنس گزٹ،مارچ،۲۰۱۲ء؛فروری،۲۰۱۲ء

277. علی گڑھ کی یادداشتیں:لوٹ پیچھے کی طرف گردش ایام تو!(خود نوشت سوانح ''افسانہ درافسانہ''سے،از شان الحق حقی)،کانفرنس گزٹ،جون،۲۰۰۴ء

278. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مسلمان طلبا کی مذہبی تعلیم و تربیت(منقول از العلم)(از نواب وقار الملک)کانفرنس گزٹ،جون،۲۰۰۵ء

279. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار(از محمد ظل الرحمن خاں)کانفرنس گزٹ،اپریل تاجون،۲۰۰۶ء

280. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سالانہ کانووکیشن(از ریاض الرحمن شروانی)کانفرنس گزٹ،اپریل،۲۰۰۳ء

281. علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وائس چانسلر:طریقۂ انتخاب(از عشرت فاروقی))کانفرنس گزٹ،اگست،۲۰۱۱ء

282. علی گڑھ مشاہیر انسائیکلوپیڈیا(ڈیڑھ درجن کتابوں سے منتخب:ایک اور قسط)(از شائستہ خاں)کانفرنس گزٹ،جنوری،۲۰۰۹ء

283. علی گڑھ میں ہندو مطالعات کا خزینہ(دسمبر ۲۰۱۴،جنوری ۲۰۱۵)(از شایستہ خان) کانفرنس گزٹ،دسمبر،۲۰۱۴ء

284. علی گڑھ،کچھ یادیں کچھ باتیں(از عبداللہ)کانفرنس گزٹ،اگست،۲۰۰۴ء

285. علی گڑھ۔ نام ورانِ علی گڑھ کا ایک روشن باب (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اگست، ستمبر ۲۰۱۲ء

286. علیم صاحب ایک شفیق استاد (از محمد سالم قدوائی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۸ء
مزید دیکھیے ''ڈاکٹر عبدالعلیم۔ اور۔ عبدالعلیم''

287. علیم صاحب مرتبہ پروفیسر محمد سالم قدوائی۔ ایک تعارف (تبصراتی مضمون) (از زبیر عالم صدیقی) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۱ء

288. غلام مصطفی خان کا انتقال (۲۶ دسمبر ۲۰۰۵ء) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۶ء

289. فارسی ذخیرے کے نوادر، آزادی سے قبل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں (از شائستہ خان) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۸ء

290. فضل الرحمن فریدی (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۳ء

291. فضل الرحمن گنوری (پروفیسر) (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۴ء

292. فضل الرحمن ندوی (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۸ء

293. فضل الرحمن ندوی (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۸ء

294. فضل الرحمن ندوی (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۸ء

295. قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (از سید احتشام ندوی) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۹ء

296. قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی۔ بہار میں سرسید تحریک کے ایک اہم حامی (از مختار الدین احمد) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۸ء

297. قرۃ العین حیدر (از ثاقب صدیقی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء

298. قرۃ العین حیدر کے مکاتیب بنام اصغر عباس (از اصغر عباس) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۸ء

299. قرۃ العین حیدر کی یاد میں (از ابوالکلام قاسمی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۴ء
300. قیصر زیدی (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۴ء
301. کبیر احمد جائسی (کی وفات پر) (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۳ء
302. کبیر احمد جائسی کی یاد میں (از محمد آصف نعیم صدیقی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۳ء
303. کبیر احمد جائسی مرحوم (ذکر دوست) (از محمد سالم قدوائی) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۴ء
304. کبیر خاں جالندھری علیگ (از ہارون قمر علی خاں) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۰ء
305. کبیر احمد جائسی مرحوم (از ظفر الاسلام اصلاحی) کانفرنس گزٹ، مارچ، اپریل ۲۰۱۳ء
306. کنور عمار احمد خاں کا انتقال پر ملال، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء
307. کے پی سنگھ (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۹ء
308. محمد اقبال انصاری صاحب کا انتقال، کانفرنس گزٹ، اپریل تا جون، ۲۰۰۶ء
309. محمد اقبال انصاری کا ایک عظیم کارنامہ (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۶ء
310. محمد اقبال انصاری کی یاد میں (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۸ء
311. محمد علی جوہر۔ راولپنڈی، اسلام آباد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ۲۸ ویں سالانہ اجلاس کے موقع پر (از سید الطاف علی بریلوی علیگ) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۴ء
312. محمد یسین کے نام مشاہیر کے خطوط، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۹ء
313. محمد یوسف، سید مکتوبات مرسلۂ مختار الدین احمد، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۰ء
314. محمود الٰہی صاحب پر۔ پروفیسر محمود الٰہی، معروف شاعر، نقاد اور محقق (از زیبا محمود) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۴ء

315. مختارالدین احمد (ذاتی تعلقات کی روشنی میں) (از احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۱۲ء

316. مختارالدین احمد، ایک ہمہ جہت شخصیت (از محمد نعمان خاں) کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۰ء

317. مختارالدین احمد ذاتی تعلقات کی روشنی میں (از فخر عالم) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۰ء

318. مختارالدین احمد کی علمی شخصیت (از احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۱ء

319. مختارالدین احمد (پروفیسر آرزو) (از قمرالہدی فریدی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء

320. مختارالدین احمد۔ نام وران علی گڑھ کا روشن باب (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۰ء

321. مختارالدین احمد کی خود نوشت کے کچھ اوراق، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۱ء

322. مختار مسعود کی باتیں (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۴ء

323. مزمل اللہ خاں شروانی، نواب سر: اقتباس خطبۂ صدارت) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۳ء

324. مسعود حسین (از احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۱ء

325. مسعود حسین خاں کے ہاتھوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کے علمی و تحقیقی جریدے کا اجراء) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۴ء

326. مسعود حسین خاں، اردو کے جلیل القدر ادیب وانشاپرداز، محقق اور ماہر لسانیات (فروری، مارچ ۲۰۰۹) (از مرزا خلیل احمد بیگ) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۹ء

327. مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا ماضی وحال (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، اگست، ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۴ء

328. مسلم سماج کے لئے اسلام کا جدید مفہوم تلاش کرنے کی ضرورت (از ضیاءالدین سردار مترجم: ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۶ء

329. مسلم ویمنز کالج علی گڑھ کا جشن صد سالہ (از راحت ابرار) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۷ء

330. مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار (از جسیم محمد) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۶ء

331. مسلم یونیورسٹی کے دو معزز وائس چانسلر (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۲ء

332. مسلمان عورتوں کی تعلیم کے سو سال (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۷ء

333. مشیر الحق (پروفیسر) آئینہ ایام میں (از احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۳ء

334. معین احسن جذبی صاحب کا انتقال) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۵ء

335. معین احسن جذبی (از سید مرتضی حسین بلگرامی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۳ء
مزید دیکھیے: ''جذبی''

336. معین الدین آرٹ گیلری (ایک بازیافت) (از افتخار عالم خاں) کانفرنس گزٹ، جنوری، فروری ۲۰۰۴ء

337. مفتی اسد اللہ (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۱ء

338. مقبول احمد (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۶ء

339. مقبول احمد صاحب کا انتقال، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۴ء

340. مقبول احمد، ڈاکٹر سید کے مکاتیب مرسلہ مختار الدین احمد ((جون، جولائی، اگست ۲۰۱۰) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۰ء

341. مکتوبات اساتذۂ عربی واسلامیات (از مختار الدین احمد) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۹ء
342. منٹو سرکل (از ہارون قمر علی خاں) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۹ء
343. منٹو سرکل کی یادیں (از سلیم قدوائی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۴ء
344. منشی نجم الدین (از مختار الدین احمد) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء
345. منظور ہاشمی (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۸ء
346. منیب الرحمن کا ''اسلام اور اسلامیات امریکہ میں'' کے عنوان پر توسیعی خطبہ ۳ دسمبر ۲۰۰۲ء) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۳ء
347. منیب الرحمن کے ساتھ ایک شام (از صغیر افراہیم) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۳ء
348. مہدی انصاری (از محمد سالم قدوائی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۱ء
349. مہدی انصاری فرنگی محلی (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۲ء
350. مولانا لطف اللہ (علی گڑھ) کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب (از حکیم سید ظل الرحمن) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۶ء
351. مولانا آزاد لائبریری میں آزادی کے بعد قیمتی اضافے (از شائستہ خاں) کانفرنس گزٹ، مارچ، اپریل، ۲۰۱۴ء
352. نذیر احمد (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، جنوری، فروری ۲۰۰۹ء
353. نذیر احمد (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۹ء
354. نذیر احمد صدیقی (از مختار الدین احمد) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۸ء
355. نذیر احمد کے مکاتیب بنام کبیر احمد جائسی، کانفرنس گزٹ، جنوری، فروری ۲۰۱۱ء
356. نذیر احمد مرحوم (از سید مرتضیٰ حسین بلگرامی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۹ء
357. نفیس بیگ، پروفیسر (از سید احتشام احمد ندوی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۶ء
358. نور الحسن نقوی (از ابو سفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۶ء

359. نورالحسن نقوی کاانتقال)کانفرنس گزٹ،فروری،۲۰۰۶ء
360. نورالحسن،تاریخی شخصیت(ازثاقب صدیقی)کانفرنس گزٹ،جنوری،۲۰۰۹ء
361. نیم علیگی۔جوش اور منٹو(ازمہرالٰہی ندیم،علیگ))کانفرنس گزٹ،مارچ،۲۰۰۹ء
362. ہادی حسن(ازسیداحتشام احمد ندوی)کانفرنس گزٹ،اکتوبر،۲۰۱۰ء
363. ہاشم علی اختر ایک تہذیب ایک تاریخ(ازابوسفیان اصلاحی)کانفرنس گزٹ،اپریل،۲۰۰۷ء
364. ہاشم علی صاحب سابق وائس چانسلر کاانتقال)کانفرنس گزٹ،جولائی،۲۰۰۳ء
365. ہاشم قدوائی صاحب کامراسلہ،کانفرنس گزٹ،نومبر،۲۰۰۹ء
366. ہندوستانی مسلمان،تعلیم اور روزگار(ازسید حامد،چانسلر جامعہ ہمدرد))کانفرنس گزٹ،ستمبر،۲۰۰۳ء
367. ہندوستانی مسلمانوں کی غیر موجودگی(ازریاض الرحمن شروانی)کانفرنس گزٹ، دسمبر،۲۰۰۶ء
368. وارث کرمانی صاحب کے انتقال؛اسے کیوں کہو کہ وہ مر گیا(ازمحمد آصف نعیم صدیقی) کانفرنس گزٹ،جنوری،۲۰۱۳ء
369. وحیداختر کی باتیں(ازابوسفیان اصلاحی)کانفرنس گزٹ،جولائی،۲۰۰۵ء
370. یادیں،گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را(ازمحمد آصف نعیم صدیقی)کانفرنس گزٹ،مئی،۲۰۱۲ء
371. یوسف حسین خاں(ازاحتشام احمد ندوی)کانفرنس گزٹ،دسمبر،۲۰۰۹ء

☆☆☆

ریاض صاحب کا ''کانفرنس گزٹ''

۲۰۰۲ء تا ۲۰۱۶ء

مصنف وار ابجدی ترتیب

- ابوالکلام قاسمی: حکیم محمد طیب کی یاد میں، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۳ء
- ابوالکلام قاسمی: قرۃ العین حیدر کی یاد میں، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۴ء
- ابوسفیان اصلاحی: انجم اعظمی۔ ایک چراغ تھا جو بجھ گیا، کانفرنس گزٹ، اپریل تا جون، ۲۰۰۶ء
- ابوسفیان اصلاحی: باتیں وحید اختر کی، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۵ء
- ابوسفیان اصلاحی: پروفیسر محمد شفیع کی رحلت، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۸ء
- ابوسفیان اصلاحی: تفسیر سرسید میں مفردات القرآن، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۰ء
- ابوسفیان اصلاحی: جعفر رضا زیدی، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۱۱ء؛ جنوری ۲۰۱۲ء
- ابوسفیان اصلاحی: حامد علی خاں، میرے محسن عزیز، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۷ء
- ابوسفیان اصلاحی: خسرو۔ ایک ذاتی تاثر، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۳ء
- ابوسفیان اصلاحی: خلیق احمد نظامی، مینارۂ علی گڑھ، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۷ء
- ابوسفیان اصلاحی: خورشید احمد فارق، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۵ء
- ابوسفیان اصلاحی: خورشید الاسلام رخصت ہو گئے، انفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۶ء
- ابوسفیان اصلاحی: ذاکر علی خاں، محمد، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۲ء
- ابوسفیان اصلاحی: ذاکر علی گڑھ، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۶ء

- ابوسفیان اصلاحی: رحمت اللہ خاں شروانی، نواب، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۲ء
- ابوسفیان اصلاحی: زاہدہ زیدی، کانفرنس گزٹ، فروری، مارچ ۲۰۱۱ء
- ابوسفیان اصلاحی: سرسید کی نظر میں عربی وفارسی زبان وادب اور دینی علوم، کانفرنس گزٹ، اکتوبر ونومبر، ۲۰۰۲ء
- ابوسفیان اصلاحی: سرسید احمد خاں اور جدت پسندی۔ تعارف وتبصرہ، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۴ء
- ابوسفیان اصلاحی: سرسید پاکستان میں، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۵ء
- ابوسفیان اصلاحی: سرسید پر تحقیقی خدمات کس انداز سے؟، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۸ء
- ابوسفیان اصلاحی: سرسید تحریک کی ایک نئی نمائندگی، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء
- ابوسفیان اصلاحی: سرسید کا دینی تصور، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۵ء
- ابوسفیان اصلاحی: سرسید کے تذکرۂ اہل دہلی میں عربی الفاظ، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۲ء
- ابوسفیان اصلاحی: سرسید کے نظر میں عورتوں کے مسائل، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
- ابوسفیان اصلاحی: سلیمان اشرف، محمد، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۲ء
- ابوسفیان اصلاحی: سید امین اشرف، کانفرنس گزٹ، مارچ، اپریل ۲۰۱۳ء
- ابوسفیان اصلاحی: سید محمد احمد۔ پرستار ادارۂ سرسید، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۱ء
- ابوسفیان اصلاحی: شبلی صدی۔ ۲ (آخری قسط)، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۵ء
- ابوسفیان اصلاحی: شہر سرسید کا ایک اور چراغ بجھا، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۷ء
- ابوسفیان اصلاحی: ظل احمد نظامی، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۶ء

- ابوسفیان اصلاحی: ظہور الحق، ڈاکٹر محمد، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۷ء
- ابوسفیان اصلاحی: عشرت فاروقی کی وفات پر، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۳ء
- ابوسفیان اصلاحی: علی گڑھ کی روایات، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۳ء
- ابوسفیان اصلاحی: فضل الرحمن ندوی، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۸ء
- ابوسفیان اصلاحی: فضل الرحمن ندوی، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۸ء
- ابوسفیان اصلاحی: کبیر احمد جائسی (کی وفات پر)، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۳ء
- ابوسفیان اصلاحی: کے پی سنگھ، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۹ء
- ابوسفیان اصلاحی: محمد اقبال انصاری کی یاد میں، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۸ء
- ابوسفیان اصلاحی: مختار الدین احمد۔ نام وران علی گڑھ کا روشن باب، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۰ء
- ابوسفیان اصلاحی: مختار مسعود کی باتیں، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۴ء
- ابوسفیان اصلاحی: مطالعات سرسید، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۹ء
- ابوسفیان اصلاحی: منظور ہاشمی موم کے پتلے، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۸ء
- ابوسفیان اصلاحی: نام ورانِ علی گڑھ کا ایک روشن باب، کانفرنس گزٹ، اگست، ستمبر ۲۰۱۲ء
- ابوسفیان اصلاحی: نذیر احمد، شیر از ہند یا فارسی کا سوقِ عکاظ (جنوری، فروری ۲۰۰۹)، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۹ء
- ابوسفیان اصلاحی: نور الحسن نقوی، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۶ء
- ابوسفیان اصلاحی: ہاشم علی اختر ایک تہذیب ایک تاریخ، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۷ء

- ابوسفیان اصلاحی: تقی امینی، محمد (از ابوسفیان اصلاحی) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۵ء
- ابو علی اثری: شبلی کی تقریر، آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس میں، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۳ء
- احتشام احمد ندوی: عتیق احمد صدیقی (متوفی ۱۶ نومبر ۲۰۰۴ء)، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۱ء
- احتشام احمد ندوی: اسلام جنوبی ہند کے بین المذاہبی معاشرے کے تناظر میں، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۰ء
- احتشام احمد ندوی: اسلوب احمد انصاری کے حضور میں، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۶ء
- احتشام احمد ندوی: اصلی شبلی کی تلاش میں، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۱ء
- احتشام احمد ندوی: امجد علی، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۷ء
- احتشام احمد ندوی: پروفیسر محمد حبیب، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۰ء
- احتشام احمد ندوی: جائسی نامہ، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۴ء
- احتشام احمد ندوی: حافظ غلام مصطفی، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۸ء
- احتشام احمد ندوی: حکیم افہام اللہ، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۴ء
- احتشام احمد ندوی: حکیم عبداللطیف فلسفی، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۴ء
- احتشام احمد ندوی: حکیم محمد طیب، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۴ء
- احتشام احمد ندوی: خلیق احمد نظامی، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۱ء
- احتشام احمد ندوی: خورشید احمد فارق، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۴ء
- احتشام احمد ندوی: رشید احمد صدیقی، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۰ء
- احتشام احمد ندوی: سر سید احمد خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء

- احتشام احمد ندوی: سلیمان اشرف، محمد، کانفرنس گزٹ، اپریل، مئی، ۲۰۱۲ء
- احتشام احمد ندوی: سید مقبول، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۲ء
- احتشام احمد ندوی: شبلی کے دبستاں کے ارکانِ ثلاثہ، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۸ء
- احتشام احمد ندوی: ضیاء احمد بدایونی، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۱ء
- احتشام احمد ندوی: عبدالحلیم صدیقی، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۲ء
- احتشام احمد ندوی: عبدالعلیم، پروفیسر آئینہ ایام میں (جون جولائی ۲۰۰۸)، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۸ء
- احتشام احمد ندوی: عبدالماجد دریاآبادی کے حضور میں، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۵ء
- احتشام احمد ندوی: فضل الرحمن فریدی، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۳ء
- احتشام احمد ندوی: فضل الرحمن گنوری (پروفیسر)، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۴ء
- احتشام احمد ندوی: فضل الرحمن ندوی، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۸ء
- احتشام احمد ندوی: قیصر زیدی، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۴ء
- احتشام احمد ندوی: محمد اقبال انصاری کا ایک عظیم کارنامہ، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۶ء
- احتشام احمد ندوی: محمد مہدی انصاری فرنگی محلی، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۲ء
- احتشام احمد ندوی: مختار الدین احمد (ذاتی تعلقات کی روشنی میں)، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۱۲ء
- احتشام احمد ندوی: مختار الدین احمد کی علمی شخصیت، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۱ء
- احتشام احمد ندوی: مسعود حسین، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۱ء

- احتشام احمد ندوی: مشیر الحق (پروفیسر) آئینہ ایام میں، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۳ء
- احتشام احمد ندوی: مفتی اسد اللہ، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۱ء
- احتشام احمد ندوی: نذیر احمد، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۹ء
- احتشام احمد ندوی: نفیس بیگ، پروفیسر، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۶ء
- احتشام احمد ندوی: ہادی حسن، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۰ء
- احتشام احمد ندوی: یوسف حسین خاں، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۹ء
- احتشام ندوی: قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۹ء
- اخلاق احمد: شہریار کی یاد، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۳ء
- ادارہ: غلام مصطفی خان کا انتقال (۲۶ دسمبر ۲۰۰۵ء) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۶ء
- ادارہ: معین احسن جذبی صاحب کا انتقال) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۵ء
- ادارہ: مقبول احمد صاحب کا انتقال) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۴ء
- ادارہ: ہاشم علی صاحب سابق وائس چانسلر کا انتقال) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۳ء
- ادارہ: محمد اقبال انصاری صاحب کا انتقال، کانفرنس گزٹ، اپریل تا جون، ۲۰۰۶ء
- اسلوب احمد انصاری کو مولانا آزاد ایوارڈ، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۵ء
- اصغر عباس: حیات جاوید کا انگریزی ترجمہ، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۷ء
- اصغر عباس: سبحان اللہ عظیم گورکھپوری کا سفر نامۂ حج، کانفرنس گزٹ، نومبر، (نومبر ۲۰۱۵ تا جنوری ۲۰۱۶ء

- اصغر عباس: سر سید، اکبر اعظم اور محمد حسین آزاد کی ذہنی مماثلتیں، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۴ء
- اصغر عباس: سر سید اور حالی، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۵ء
- اصغر عباس: سر سید اور محمد حسین آزاد، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۰ء
- اصغر عباس: سر سید کی لندن سے کچھ نایاب تحریریں، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۲ء
- اصغر عباس: سر سید ہاؤس منزل بہ منزل، کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
- اصغر عباس: سرور صاحب کے بارے میں؛ جلوۂ سرور، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۵ء
- اصغر عباس: سمیع اللہ خاں اور ان کا سفر نامہ مسافران لندن، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۳ء
- اصغر عباس: سید حامد کے مکاتیب بنام اصغر عباس، کانفرنس گزٹ، مارچ، مئی، جون ۲۰۱۵ء
- اصغر عباس: سیرت فریدیہ مصنفہ سر سید کی مختلف اشاعتیں، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۰ء
- اصغر عباس: شبلی نعمانی کی غیر مدوّن پہلی تقریر، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۱ء
- اصغر عباس: قرۃ العین حیدر کے مکاتیب بنام اصغر عباس، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۸ء
- اصغر عباسی: سر سید کی تصحیح کردہ تاریخ فیروز شاہی، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
- آصف نعیم صدیقی: اسے کیوں کہو کہ وہ مر گیا (وارث کرمانی صاحب کے انتقال پر)، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۳ء
- آصف نعیم صدیقی: حالی، شبلی اور سعدی، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۵ء
- آصف نعیم صدیقی: حیات سعدی مصنفہ حالی، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۶ء
- آصف نعیم صدیقی: شبلی کا نواب صدر یار جنگ کے نام خط، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۱۶ء

- آصف نعیم صدیقی: کبیر احمد جائسی کی یاد میں، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۳ء
- آصف نعیم صدیقی: یادیں، گاہے گاہے باز خوانیں قصۂ پارینہ را، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۲ء
- افتخار عالم خاں: سرسید اور زراعت (۱۱ قسطوں میں، اگست ۲۰۱۳ تا اکتوبر ۲۰۱۴)، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۳ء
- افتخار عالم خاں: سرسید اور نیشنل کانگریس، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۶ء
- افتخار عالم خاں: سرسید کا روایت سے انحراف، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۵ء
- افتخار عالم خاں: سرسید، انگریز اور نظریۂ وفاشعاری، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۲ء
- افتخار عالم خاں: صاحب باغ، ڈیوٹی ہوسٹل سے سلیمان ہال تک، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۳ء
- افتخار عالم خاں: معین الدین آرٹ گیلری (ایک بازیافت) کانفرنس گزٹ، جنوری، فروری ۲۰۰۴ء
- آل احمد سرور کی ایک نادر تحریر: حرفے چند، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۶ء
- آل احمد سرور: اپنی جنت پکی کرنا کافی نہیں، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۵ء
- آل علی نقوی، خان صاحب سید: اقتباس خطبۂ صدارت) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۴ء
- امان اللہ خاں شروانی: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال، کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
- امان اللہ خاں شروانی: الطاف علی بریلوی، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۳ء
- امان اللہ خاں شروانی: حالی کی نظم اور ترکیب بند مولانا حالی، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۲ء

- امان اللہ خاں شروانی: علی تحریک خصوصاً آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا حصہ اردو کی ترویج و ترقی میں، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۳ء
- امیر عارفی صاحب کا انتقال (۱۳ فروری ۲۰۰۵ء) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۵ء
- امین اشرف، سید: شمس الرحمن فاروقی کا مجموعہ آسماں محراب، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۱ء
- اولاد احمد صدیقی: گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۳ء
- اولاد احمد صدیقی: آفتاب احمد خاں، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۳ء
- اولاد احمد صدیقی: سرسید درونِ خانہ پر ایک نظر، کانفرنس گزٹ، جون، جولائی ۲۰۰۷ء
- اولاد احمد صدیقی: شفیق انجم ایک خوش فکر شاعر، کانفرنس گزٹ جون، ۲۰۰۴ء
- باقر مہدی صاحب کا انتقال (۲۴ ستمبر) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
- بدرالدین، سید (متعلم مسلم یونیورسٹی): راجہ جے کشن داس بہادر سی۔ایس۔آئی، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۴ء (غالباً ۱۹۳۹ء کے علی گڑھ میگزین سے منقول)
- بدرالدین، سید: سرسید راس مسعود، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۳ء
- پرویز احمد: سرسید احمد خاں اور غازی پور، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۱ء
- پرویز عالم خاں: سرسید اور علی گڑھ یونیورسٹی کا قیام، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۵ء
- پرویز ہدیٰ بھائی: سرسید پاکستا میں کیوں ہار گئے اور اقبال کیوں جیت گئے، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۳ء
- ٹونکی، سید محمد: علی گڑھ، میرا علی گڑھ، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۴ء
- ثاقب صدیقی: رشید احمد صدیقی، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۱ء

- ثاقب صدیقی: رشید جہاں، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۶ء
- ثاقب صدیقی: قرۃ العین حیدر، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء
- ثاقب صدیقی: مرقع کالج پر ایک طائرانہ نظر، کانفرنس گزٹ، اپریل تا جون، ۲۰۰۶ء
- ثاقب صدیقی: نورالحسن، تاریخی شخصیت، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۹ء
- جسیم محمد: مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۶ء
- جمال خواجہ: سرسید کی نظر میں سیاست اور مذہب، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۴ء
- جمیل احمد نقوی، سید: حالی کی تعلیمی خدمات، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۳ء
- حافظ علی بہادر خاں: میری یادداشت سے، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۰ء
- حامد انصاری: قومی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین کا سرسید پر منعقد سہ روزہ سمینار کے افتتاحی جلسے سے خطاب، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۶ء
- حامد انصاری کا میموریل لیکچر میں خصوصی خطبہ، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۶ء
- حبیب الرحمن خاں شروانی: علی گڑھ کے مردانِ کار، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۳ء
- حبیب الرحمن شروانی: سرسید کی یاد، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۳ء
- حکیم ظل الرحمن، پدم شری سے سرفراز (منقول راشٹریہ سہارا، نئی دہلی) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۶ء
- خسرو صاحب سابق وائس چانسلر کا انتقال، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۳ء
- خلیل احمد بیگ: مسعود حسین خاں، اردو کے جلیل القدر ادیب و انشاپرداز، محقق اور ماہر لسانیات (فروری، مارچ ۲۰۰۹) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۹ء

- خلیل الرحمن اعظمی: علی گڑھ کی چند شخصیتیں، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۶ء
- خواجہ غلام السیدین: علی گڑھ کی تعلیمی تحریک، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۶ء
- خواجہ غلام السیدین: علی گڑھ کی تعلیمی تحریک، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۶ء
- خواجہ محمد شاہد: ڈاکٹر عبدالعلیم، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۷ء
- خواجہ محمد شاہد: سمیع اللہ خاں 'مسافران لندن' کی روشنی میں، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۳ء
- خورشید الاسلام کا انتقال، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۶ء
- ذاکر حسین خاں: اقتباس خطبۂ صدارت) کانفرنس گزٹ، جنوری، فروری ۲۰۰۴ء
- ذاکر علی خاں: شیخ عبدالرشید (جنوری، فروری ۲۰۰۸)، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۸ء
- راحت ابرار: مسلم ویمنز کالج علی گڑھ کا جشن صد سالہ، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۷ء
- راس مسعود: اقتباس خطبۂ صدارت) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۳ء
- راشد عزیز: شہریار سے مکالمہ، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۱۰ء
- راہی معصوم رضا کے ادب پر مذاکرہ) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۴ء
- رفعت سروش: جذبی کی یاد میں، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی (مترجم): درد کا رشتہ (از وجیا نرونے، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۱ء
- ریاض الرحمن شروانی (مترجم): خاموشی کے خلاف، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: کم از کم مشترکہ پروگرام، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۴ء
- ریاض الرحمن شروانی: حضرت مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی علمی شخصیت اور فکری بصیرت مرتبہ سید احتشام احمد ندوی پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۷ء

- ریاض الرحمن شروانی: دستاویزات ایجوکیشنل کانفرنس مرتبہ اقبال حسین پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۴ء
- ریاض الرحمن شروانی: ڈھونڈھو گے انہیں (خاکے) از کبیر احمد جائسی پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: علامہ عبدالعزیز میمنی۔ حیات وخدمات پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۴ء
- ریاض الرحمن شروانی: مولانا عبدالسلام ندوی از کبیر احمد جائسی پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: نقوش تابندہ از اخلاق احمد پر تبصرہ کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: آئین اکبری از ابوالفضل علامی پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: علمائے سلف از نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: کارگہ شیشہ گری از ڈاکٹر مجیب احمد خاں پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: اقلیتی کردار، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: ایک تعلیمی سفر، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: ایک ساتھی کی یاد، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: تین ساتھی، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۵ء

- ریاض الرحمن شروانی: دینی مدارس اور جدید دور میں ان کے مسائل (اداریہ)، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: سیکولرزم، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: یادرفتگاں) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۴ء
- ریاض الرحمن شروانی: یاد یار مہرباں آید ہمی، کانفرنس گزٹ، اپریل تا جون، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور دینی تعلیم (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۳ء
- ریاض الرحمن شروانی: امریکہ کا شام و سحر از اخلاق احمد پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: ایک استاد کی یاد، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۴ء
- ریاض الرحمن شروانی: تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام از سر سید احمد خاں پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: تن ہمہ داغ داغ شد (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: حکیم اجمل خاں از حکیم سید ظل الرحمن پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: خواجہ حسن عسکری کی کہانی، کچھ ہماری، کچھ ذاکر علی خاں کی زبانی (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۸ء

- ریاض الرحمن شروانی: سچر کمیٹی رپورٹ ایک جائزہ (از ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۷ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید احمد خاں کی الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۴ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید کو مولانا آزاد کا خراج عقیدت، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۴ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید کے مطالعہ کی نئی جہت، کانفرنس گزٹ، نومبر، دسمبر ۲۰۰۳ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید احمد خاں۔ حیات وافکارہ از محمد صلاح الدین العمری پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۴ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید پاکستان میں کیوں ہار گئے اور اقبال کیوں جیت گئے (از پرویز ہدیٰ بھائی/مترجم ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۳ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید درون خانہ از افتخار عالم پر تبصرہ کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۷ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید کا اصلی کارنامہ، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید کا تہذیبی و معاشرتی شعور تہذیب الاخلاق کے حوالے سے، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید کا ایک بڑا کارنامہ، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۳ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید کی کہانی ان کی اپنی زبانی، حیات سرسید، افکار سرسید مرتبہ ضیاء الدین لاہوری پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید میموریل لکچر ۲۰۰۴ء، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۴ء

- ریاض الرحمن شروانی: سرسید وایم اے او کالج اور دینی و مشرقی علوم از ظفر الاسلام اصلاحی پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۴ء
- ریاض الرحمن شروانی: سرسید۔ایک تحریک کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۳ء
- ریاض الرحمن شروانی: شبلی معاصرین کی نظر میں مرتب ظفر احمد صدیقی پر تبصرہ کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: شبلی نعمانی سمینار دارالمصنفین اعظم گڑھ کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: صدر یار جنگ کی خدمات اردو کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۳ء
- ریاض الرحمن شروانی: صدر یار جنگ کی خدمات اردو کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۳ء
- ریاض الرحمن شروانی: عبدالعزیز میمنی۔حیات و خدمات پر تبصرہ کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۴ء
- ریاض الرحمن شروانی: علی گڑھ تحریک، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۵ء
- ریاض الرحمن شروانی: علی گڑھ کے دو نامور فرزندوں کا حصہ، ہندوستان کی جنگ آزادی میں (از ہارون خاں شروانی، ترجمہ ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا سالانہ کانووکیشن، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۳ء
- ریاض الرحمن شروانی: فکر اسلامی کے فروغ میں شیخ سرہندی کی خدمات مرتبہ عبدالعلی اور ظفر الاسلام، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: کانفرنس کا ماضی و حال، کانفرنس گزٹ، اگست، ستمبر، اکتوبر ۲۰۰۴ء

- ریاض الرحمن شروانی: مسلم سماج کے لئے اسلام کا جدید مفہوم تلاش کرنے کی ضرورت (از ضیاء الدین سردار مترجم: ریاض الرحمن شروانی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: مسلم یونیورسٹی کے دو معزز وائس چانسلر کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۲ء
- ریاض الرحمن شروانی: مسلمان عورتوں کی تعلیم کے سو سال، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۷ء
- ریاض الرحمن شروانی: مقبول احمد، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: ہندوستانی مسلمانوں کی غیر موجودگی، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: تاریخ فیروز شاہی از ضیاء الدین برنی، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۶ء
- ریاض الرحمن شروانی: معاصر شخصیات مرتبہ: پروفیسر شاہ عبدالسلام پر تبصرہ، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۷ء
- زبیر عالم صدیقی: علیم صاحب مرتبہ پروفیسر محمد سالم قدوائی۔ ایک تعارف (تبصراتی مضمون)، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۱ء
- زیبا محمود: پروفیسر محمود الٰہی، معروف شاعر، نقاد اور محقق، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۴ء
- زیدی جعفر رضا: چاند اب بھی نکلتا ہے مگر، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۲ء؛ فروری، ۲۰۱۲ء
- سالم قدوائی: کبیر احمد جائسی مرحوم (ذکر دوست)، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۴ء
- سالم قدوائی: مہدی انصاری، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۱ء
- سالم قدوائی، محمد: سید ہاشم علی صاحب کی کچھ یادیں کچھ باتیں، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۸ء
- سالم قدوائی، محمد: عبدالسلام قدوائی ندوی، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۵ء

- سالم قدوائی، محمد: علیم صاحب ایک شفیق استاد، کانفرنس گزٹ، فروری،۲۰۰۸ء
- سرسید احمد خاں کے خطوط) کانفرنس گزٹ، اکتوبر،۲۰۰۶ء
- سرسید کی تحریک۔ مایوسی کے اندھیرے میں روشنی کی علامت) کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر،۲۰۰۲ء
- سلیم قدوائی: آل احمد سرور۔ چند بکھری یادیں، کانفرنس گزٹ، نومبر،۲۰۰۵ء
- سلیم قدوائی: ایک مثالی علیگ، کانفرنس گزٹ، اپریل،۲۰۱۶ء
- سلیم قدوائی: رشید احمد صدیقی۔ دو ملاقاتیں، کانفرنس گزٹ، اپریل،۲۰۱۵ء
- سلیم قدوائی: منٹو سرکل کی یادیں، کانفرنس گزٹ، اگست،۲۰۱۴ء
- سید احتشام احمد ندوی: آل احمد سرور، کانفرنس گزٹ، اپریل،۲۰۱۱ء
- سید حامد کا سرسید یادگاری خطبہ) کانفرنس گزٹ، نومبر،۲۰۰۳ء
- سید حامد، چانسلر جامعہ ہمدرد: ہندوستانی مسلمان، تعلیم اور روزگار، کانفرنس گزٹ، ستمبر،۲۰۰۳ء
- سید مرتضی حسین بلگرامی: ایک نادر دستاویز، کانفرنس گزٹ، نومبر،۲۰۱۱ء
- سید مسعود حسن: حبیب الرحمن خاں شروانی مقالات شروانی کی توضیحی اشاریے کی روشنی میں، کانفرنس گزٹ، فروری،۲۰۰۹ء
- سیما صغیر: ڈاکٹر رشید جہاں کی زندگی اور کارناموں پر بین الاقوامی سمینار، کانفرنس گزٹ، دسمبر،۲۰۰۵ء
- شان الحق حقی صاحب کا انتقال (۱۱، اکتوبر) کانفرنس گزٹ، نومبر،۲۰۰۵ء

- شان الحق حقی: علی گڑھ کی یادداشتیں: لوٹ پیچھے کی طرف گردش ایام تو! (خود نوشت سوانح ''افسانہ در افسانہ'' سے، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۴ء
- شان محمد: سرسید کا نقطہ نظر، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۳ء
- شاہ دین ہمایوں، جسٹس: مسلمانوں میں تربیت نفس کی کمی کا نقص عظیم (اقتباس خطبہ صدارت) کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۳ء
- شاہ محمد سلیمان: علوم مغربی (اقتباس خطبہ صدارت) کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۳ء
- شاہ محمد وسیم: سرسید کی تحریک، اس کی معنویت اور عصر جدید کے تقاضے، کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
- شاہد قمر قاضی: ایک حکایت، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۵ء
- شاہد قمر قاضی: سرسید ''اسباب بغاوت ہند'' کی روشنی میں، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
- شاہد قمر قاضی: سرسید کا ایک خط، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۳ء
- شاہد قمر قاضی: سرسید مغرب کی نظر میں، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۶ء
- شاہد ماہلی: شبلی کی سیاسی بصیرت، کانفرنس گزٹ، اپریل، مئی، ۲۰۱۵ء
- شائستہ خاں: مولانا آزاد لائبریری میں آزادی کی کے بعد قیمتی اضافے، کانفرنس گزٹ، مارچ، اپریل ۲۰۱۴ء
- شائستہ خان: ۱۹۲۵۔۱۹۲۷ کے ہندوستان کی کچھ جھلکیاں، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۱۰ء
- شائستہ خان: پروفیسر محمد حبیب، نظام الدین اولیاء کے حضور میں، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۱ء

- شائستہ خاں: شہریار (نصف صدی قبل اور ربع صدی قبل)، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، نومبر ۲۰۱۵ء
- شائستہ خاں: علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ مسئلہ، آزادی کے بعد، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۶ء
- شائستہ خان: معربات رشیدی مصنفہ عبدالستار صدیقی، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۰ء
- شائستہ خان: بابری مسجد رام مندر پر پروفیسر حقی کا کارنامہ، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۱ء
- شائستہ خان: رحم علی الہاشمی کی یادیں، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۳ء
- شائستہ خان: سرسید ایک مومن صادق اور شاہ ولی اللہ ایک عالم کبیر، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۰ء
- شائستہ خان: طیب جی کی خود نوشت کا ایک دلچسپ ٹکڑا، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۰ء
- شائستہ خان: علی گڑھ ۱۹۱۱ء میں ایک انسائیکلوپیڈیا، کانفرنس گزٹ، جولائی، اکتوبر ۲۰۰۸ء
- شائستہ خان: علی گڑھ تحریک اور علی گڑھ مسئلہ، آزادی کے بعد، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۶ء
- شائستہ خان: علی گڑھ کی انسائیکلوپیڈیا، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۶ء
- شائستہ خان: علی گڑھ کی انسائیکلوپیڈیا (تیسری وآخری قسط)، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۶ء
- شائستہ خان: علی گڑھ کی انسائیکلوپیڈیا، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۶ء
- شائستہ خان: علی گڑھ کے مشاہیر کی انسائیکلوپیڈیا، کانفرنس گزٹ، فروری،، مارچ، ۲۰۰۶ء
- شائستہ خان: علی گڑھ مشاہیر انسائیکلوپیڈیا (ڈیڑھ درجن کتابوں سے منتخب: ایک اور قسط)، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۹ء

- شائستہ خان: فارسی ذخیرے کے نوادر، آزادی سے قبل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ہیں کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۸ء
- شائستہ خان: مولانا آزاد لائبریری میں آزادی کے بعد قیمتی اضافے، کانفرنس گزٹ، مارچ، اپریل، ۲۰۱۴ء
- شبلی کی یاد آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ۲۸ ویں اجلاس میں (منقول از سالانہ رپورٹ کانفرنس بابت ۱۹۱۴ء)) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء
- شمس الرحمن فاروقی: شہریار، وہ جو آسماں پہ ستارہ تھا، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۲ء
- شمیم الدین: سرسید اور سیکولرزم، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۲ء
- شمیم جیراج پوری: عبدالسلام قدوائی ندوی۔ میری نظر میں، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۲ء
- شہریار (نصف صدی قبل اور ربع صدی قبل) (از شائستہ خاں) کانفرنس گزٹ، اکتوبر، نومبر ۲۰۱۵ء
- شہریار اقبال سمان سے سرفراز (کتاب نمائی دہلی) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۵ء
- شہریار کو اعزاز (از۔۔۔) کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
- صاحب زادہ آفتاب احمد خاں: اتحاد کا یقینی ذریعہ (اقتباس خطبۂ صدارت، خطبات عالیہ حصہ سوم)) کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۳ء
- صدر عالم: علی گڑھ کا حصہ اردو صحافت میں، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۳ء
- صغیر افراہیم: منیب الرحمن کے ساتھ ایک شام، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۳ء
- صلاح الدین عمری: یونیورسٹی ترانے کا عربی ترجمہ، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۲ء

- ضیاءالدین سردار: مسلم سماج کے لئے اسلام کا جدید مفہوم تلاش کرنے کی ضرورت، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۶ء
- الطاف علی بریلوی: محمد علی جوہر۔ راولپنڈی، اسلام آباد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ۲۸ویں سالانہ اجلاس کے موقع پر، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۴ء
- طاہرہ حسین: علی گڑھ کی نذر، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۴ء
- ظفرالاسلام اصلاحی: آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور تعلیم نسواں، کانفرنس گزٹ، نومبر، دسمبر، ۲۰۰۷ء
- ظفرالاسلام اصلاحی: خسرو صاحب۔ ایک یادگار واقعہ، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۳ء
- ظفرالاسلام اصلاحی: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں شبلی صدی بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۵ء
- ظفرالاسلام اصلاحی: سرسید اور قدیم وجدید تعلیم کا امتزاج، کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
- ظفرالاسلام اصلاحی: سرسید نے طلباء کے لئے درس قرآن کا اہتمام کیا، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۳ء
- ظفرالاسلام اصلاحی: کبیر احمد جائسی مرحوم، کانفرنس گزٹ، مارچ، اپریل ۲۰۱۳ء
- ظل الرحمن خاں: علی گڑھ برادری کی رائے جمہوریت کے بارے میں، کچھ اوروں کی، کچھ میری زبانی، کانفرنس گزٹ، نومبر، دسمبر ۲۰۱۲ء
- ظل الرحمن خاں: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار، کانفرنس گزٹ، اپریل تا جون، ۲۰۰۶ء
- ظل الرحمن، حکیم سید: رشید صاحب کا مکتوب بنام قاضی عبدالغفار، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۴ء

- ظل الرحمن، حکیم سید: مولانا لطف اللہ علی گڑھ کا ایک غیر مطبوعہ مکتوب، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۶ء
- عابداللہ غازی: مثبت اور منفی طرز فکر، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۵ء
- عابداللہ غازی: مقاصد کی لگن، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۵ء
- عابداللہ غازی: علی گڑھ کا پیغام، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۵ء
- عبدالحلیم کا انتقال (۱۲، اکتوبر) کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۵ء
- عبدالحمید نعمانی: عبدالحق انصاری (پروفیسر) کی فکری جہات و ترجیحات کے کچھ پہلو، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۱۲ء
- عبداللہ یوسف علی: مسلمانوں کی تعلیم اور حالتِ امید و بیم) (اقتباس خطبۂ صدارت) کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۳ء
- عبدالحق، مولوی: سر سید راس مسعود، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۴ء
- عبدالحق، مولوی: سر سید راس مسعود، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۴ء
- عبدالحق، مولوی: سید محمود، جسٹس، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۴ء
- عبدالغفار شکیل: رشیدیات، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۱ء
- عبداللہ: علی گڑھ، کچھ یادیں کچھ باتیں، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۴ء
- عتیق احمد صدیقی صاحب کا انتقال) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء
- عزیز الحسن صدیقی: غازی پور میں سر سید کی یادگاروں کی تباہی اور کارپردازانِ مسلم یونیورسٹی کی غفلت کی داستان، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۱ء

- عشرت فاروقی: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی وائس چانسلر: طریقۂ انتخاب، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۱ء
- عمیر الصدیق ندوی: شبلی نعمانی حیات وافکار دو روزہ سمینار دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء
- فخر عالم: مختار الدین احمد ذاتی تعلقات کی روشنی میں، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۰ء
- فیروز بخت احمد: شبلی نعمانی اور مدارس اسلامیہ میں جدید تعلیم اور انگریزی، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۳ء
- فیض الرحمن اعظمی: شبلی کے بارے میں: اصلی شبلی، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۱۰ء
- قمر الہدیٰ فریدی: مختار الدین احمد (پروفیسر آرزو)، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء
- کبیر احمد جائسی: ایم حبیب خاں، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۰ء
- کبیر احمد جائسی: نذیر احمد کے مکاتیب بنام کبیر احمد جائسی، کانفرنس گزٹ، جنوری، فروری ۲۰۱۱ء
- کنور عمار احمد خاں کا انتقال پر ملال، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۵ء
- گجرال، آئی۔ کے۔: حکیم عبدالحمید جیسا شخص دس جنموں میں بھی نہیں پیدا ہوتا، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۶ء
- مجتبیٰ حسین: شہریار! تم بھی چلے گئے، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۲ء
- محمد سالم قدوائی: ذاکر حسین خاں صاحب: یادیں، باتیں اور ملاقاتیں، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۲ء
- محمد یسین: مشاہیر کے خطوط محمد یٰسین کے نام، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۹ء
- مختار الدین احمد: بابائے اردو، کانفرنس گزٹ، جولائی، اگست ۲۰۰۷ء

- مختارالدین احمد: سر ضیاءالدین احمد کچھ یادیں کچھ باتیں، کانفرنس گزٹ، اپریل، مئی، ۲۰۰۷ء
- مختارالدین احمد: سر سید کے ایک رفیق منشی نجم الدین، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۷ء
- مختارالدین احمد: سر سید کے ایک رفیق: منشی نجم الدین، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۰۷ء
- مختارالدین احمد: عبدالعلیم خاں کی افسوس ناک وفات، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء
- مختارالدین احمد: علی گڑھ قاہرہ میں، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۸ء
- مختارالدین احمد: قاضی سید رضا حسین عظیم آبادی۔ بہار میں سر سید تحریک کے ایک اہم حامی، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۸ء
- مختارالدین احمد: محمد یوسف، سید مکتوبات، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۰ء
- مختارالدین احمد: مقبول احمد، ڈاکٹر سید کے مکاتیب (جون، جولائی، اگست ۲۰۱۰) کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۰ء
- مختارالدین احمد: مکتوبات اساتذۂ عربی واسلامیات، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۹ء
- مختارالدین احمد: منشی نجم الدین، کانفرنس گزٹ، اکتوبر، ۲۰۰۷ء
- مختارالدین احمد: نذیر احمد صدیقی، کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۸ء
- مختارالدین احمد کی خود نوشت کے کچھ اوراق، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۱ء
- مرتضی حسین بلگرامی: احسن مارہروی، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۵ء
- مرتضی حسین بلگرامی: ذکر یاد ماضی، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۱۵ء
- مرتضی حسین بلگرامی: رحمت اللہ خان شروانی، نواب، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۲ء

- مرتضیٰ حسین بلگرامی: سرسید کی ضرورت۔ کل اور آج، کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
- مرتضیٰ حسین بلگرامی: سرسید ثانی الحاج سید حامد نہ رہے، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۵ء
- مرتضیٰ حسین بلگرامی: عبدالعلیم، پروفیسر (مختصر جائزہ)، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۰۸ء
- مرتضیٰ حسین بلگرامی: معین احسن جذبی، کانفرنس گزٹ، مئی، ۲۰۱۳ء
- مرتضیٰ حسین بلگرامی: نذیر احمد مرحوم، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۹ء
- مزمل اللہ خاں شروانی، نواب سر: اقتباس خطبۂ صدارت) کانفرنس گزٹ، دسمبر، ۲۰۰۳ء
- مسعود الحسن: رحمت اللہ خاں شروانی، نواب، کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۱۲ء
- مسعود الحسن: سرسید کا سفر نامہ 'مسافران لندن'، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۱۰ء
- مسعود الحسن: سرسید کی صحافت، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۱۲ء
- مسعود الحسن: سمیع اللہ خاں (مولوی) کا سفر نامہ مسافرانِ لندن، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۳ء
- مسعود انور علوی کاکوری: رحمت اللہ خاں شروانی، نواب کی یاد میں، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۱۲ء
- مسعود حسین خاں کے ہاتھوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ لسانیات کے علمی و تحقیقی جریدے کا اجراء) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۴ء
- معتصم عباسی آزاد، محمد: سرسید کے مکتوب سرسید احمد خاں بنام نواب محمد اسحاق خاں، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۱ء
- منیب الرحمن کا ''اسلام اور اسلامیات امریکہ میں'' کے عنوان پر توسیعی خطبہ ۳ دسمبر ۲۰۰۲ء) کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۳ء

- مہرالٰہی ندیم: دو نیم علیگی۔ جوش اور منٹو، کانفرنس گزٹ، مارچ، ۲۰۰۹ء
- مہرالٰہی ندیم: سرسید کا مدرسہ اور حالی کا مٹی کا دیا، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۴ء
- نذیر احمد، مولوی: سرسید احمد خاں کا مرثیہ، کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
- نسیم احمد، وائس چانسلر: اکثریتی فرقہ کے افراد کو اقلیتی فرقے کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا چاہیے، کانفرنس گزٹ، جنوری، ۲۰۰۳ء
- نظام الدین حسین نظامی: راس مسعود اور اردو ادب، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۴ء
- نظام الدین حسین نظامی: سر شاہ سلیمان اور اردو ادب، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۴ء
- نظامی بدایونی: سر راس مسعود اور اردو ادب، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۱۱ء
- نعمان خاں، محمد: مختار الدین احمد، ایک ہمہ جہت شخصیت، کانفرنس گزٹ، ستمبر، ۲۰۱۰ء
- نورالحسن نقوی کا انتقال) کانفرنس گزٹ، فروری، ۲۰۰۶ء
- نورالحسن نقوی: سرسید ایک خواب اور اس کی تعبیر، کانفرنس گزٹ، اکتوبر و نومبر، ۲۰۰۲ء
- ہارون خاں شروانی: علی گڑھ کے دو نامور فرزندوں کا حصہ، ہندوستان کی جنگ آزادی میں، کانفرنس گزٹ، جولائی، ۲۰۰۶ء
- ہارون قمر علی خاں: تاریخ علی گڑھ، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۱۲ء
- ہارون قمر علی خاں: ترانۂ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ تاریخی پس منظر، کانفرنس گزٹ، اگست، ۲۰۰۹ء
- ہارون قمر علی خاں: علی گڑھ کا زمانہ طالب علمی (جون، جولائی ۲۰۰۹)، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۹ء

- ہارون قمر علی خاں: کبیر خاں جالندھری علیگ، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۱۰ء
- ہارون قمر علی خاں: منٹو سرکل، کانفرنس گزٹ، اپریل، ۲۰۰۹ء
- ہاشم قدوائی صاحب کا مراسلہ، کانفرنس گزٹ، نومبر، ۲۰۰۹ء
- وقار الملک، نواب: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مسلمان طلبا کی مذہبی تعلیم و تربیت (منقول از العلم)، کانفرنس گزٹ، جون، ۲۰۰۵ء

***

تازہ کتب ورسائل: تعارف

''اقبال اور اورنگ آباد'' مرتب: انجینئر عنایت علی، ناشر: عنایت علی، ایگزیکیٹیو انجینئر، محکمہ آبپاشی (موظف)، مکان نمبر 1، 64-12- محلّہ گھاٹی، نزد پرگتی کالونی، اورنگ آباد، 431001، مہاراشٹر۔ ۵۴۲ صفحات، ۲۰۱۸ء

اورنگ آباد پر اقبال کا اور اقبال پر اورنگ آباد کا قرض مدت سے چلا آتا تھا، عنایت علی صاحب نے اس قرض کو ادا کرنے کی بڑی خوبصورت کوشش کی ہے۔ ان کی مرتبہ کتاب میں خود عنایت علی صاحب کے علاوہ اقبالیات اور اقبالیاتِ اورنگ آباد سنہ ۱۹۳۴ تا ۲۰۱۰ء تک اس موضوع پر خود عنایت علی صاحب اور انور معظم صاحب کے علاوہ، اورنگ آباد سے خصوصی دلچسپی رکھنے والے اہل قلم نے جس طرح اس موضوع کا حق ادا کیا ہے، وہ قابل صد آفریں ہے، خصوصی توجہ کے لائق ہے خود مرتب کا مضمون اقبال اور اورنگ آباد۔ مضمون کے مطالعہ سے جو کچھ حاصل ہوا، اس میں ہم آپ کو بھی شریک کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔

عنایت علی صاحب کی کتاب کا موضوع بھی نیا ہے اور لکھنے والے بھی بس اورنگ آبادی۔ اس لئے اوپر مذکورہ مضمون نگاروں کے ناموں کے ماسوا بقیہ مشتملات کی فہرست بھی دے دینا مناسب ہوگا۔ جو اس طرح ہیں:

- اقبال کا دورہ اورنگ آباد، از عنایت علی
- اقبال اور اورنگ زیب عالم گیر، از عنایت علی
- اقبال اور اہل اورنگ آباد کی خدمات، از عنایت علی
- **اقبالیات اورنگ آباد، سنہ ۱۹۳۴ تا ۲۰۱۰ تک دستیاب تحریریں**

حصۂ نظم: ● اقبال از سکندر علی وجد ● پیام اقبال از سکندر علی وجد ● نزع لمعہ بحضور اقبال از ڈاکٹر عباس علی خاں لمحہ ● اقبال (چند اشعار)، از اختر الزمان ناصر ● نذر عقیدت بہ حضور اقبال، از حکیم احمد حسینی بے خود اورنگ آبادی ● اقبال اور میں، از حمایت علی شاعر ● یاد اقبال، از غلام

طیب ● حضرت اقبالؒ، از سکندر علی وجد ● آہ! اقبال، از محمد باقر امام ● اقبال کے ترانہ ملی پر نظر ثانی، از اختر الزماں ناصر ● اقبال کی غزل پر تضمین، از عبدالروف عروج ● اقبال و ٹیگور، از ڈاکٹر عباس علی خاں لمعہ ● پیروڈی بر نظم اقبال، راجہ غضنفر علی ● لاولد، از راجہ غضنفر علی

حصہ نثر: ● اقبال، از اختر الزماں ناصر ● یاد اقبال، از ولی محمد خان ● اقبال، از یعقوب عثمانی ● نذر اقبال، از امیر احمد اورنگ آبادی ● نوحہ غم، مظہر الدین صدیقی ● اقبال اور مستقبل، سید واحد علی ● علامہ اقبال کا شاعرانہ خیال اور پیغام، از محمد قمر الدین ● انسان۔ فکر اقبال کے آئینہ میں، از سیدہ حسنیٰ بانو ● اقبال اور نظریہ خودی، شاہد پروین

دیگر رسائل و کتب سے انتخاب: ● اقبال کی غزلیں، از سکندر علی وجد ● بال جبرئیل، از سکندر علی وجد ● حیات اقبال کا سبق، ابو الاعلیٰ مودودی ● اقبال اور انسان دوستی، عیسیٰ خان (ایڈوکیٹ) ● اقبال شاعر۔ اردو شاعری کا دور جدید یا افادی دور، از ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ● اقبال کا ڈکشن (اقبال کی شاعری کی زبان) ● مسجد قرطبہ، از اختر الزماں ناصر ● ساقی نامہ، از اختر الزماں ناصر ● اقبال کی تشبیہیں اور استعارے ● ذوق و شوق ایک تجزیاتی مطالعہ، از اختر الزماں ناصر ● علامہ اقبال اپنی طرز کا پہلا شاعر، از حمایت علی شاعر ● صاحب اقبال شاعر، از یوسف ناظم

ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ کی تحریریں: ● اقبال کا تصور الہ ● اقبال کا تصور مرد مومن ● اقبال بحیثیت شاعر ● اقبال کا شعری اسلوب ● اقبال کی مہارت فن ● اقبال کا پیغامِ عمل ● ضربِ کلیم ● اقبال اور مناظر قدرت ● اقبال کا فنی ارتقا

ڈاکٹر وحید اختر کی تحریریں: ● اقبال کا تصور فن ● اقبال اور مغربی فکر ● اقبال اور مشرقی فکر ● اقبال اور عصری حسیت ● اقبال کی فکر میں وجودی عناصر ● اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیل نو ● اقبال کا تصور زماں ● ایڈورڈ کارپینٹر۔ فکر اقبال کا ایک غیر تسلیم شدہ ماخذ ● علامہ اقبال۔ ایک عظیم شاعر، میر ہاشم ● علامہ اقبال کا فلسفہ عشق، سید امجد علی ● اقبال کا آہنگ شاعری، سید امجد علی ● ذوق و شوق، شفیق فاطمہ شعریٰ ● اقبال ایک عہد آفریں شاعر، سیدہ مہر ● ایک محرک۔ دو نظمیں، ڈاکٹر رعنا حیدری ● برصغیر کے مسلمان اور علامہ اقبال، از ڈاکٹر میر مجاہد علی ● بانگ درا کے آئینے میں اقبال کا تصور تہذیب، ڈاکٹر انور معظم ● تصاویر۔

☆☆☆

Khuda Bakhsh Library

Journal

No. 191-194 January – December 2018

Khuda Bakhsh Oriental Public Library
Patna

Reg. No. 33424/77
Issue : 191-194
Quarterly Journal

Subscription

Individuals ₹ 400/-
Institutions ₹ 500/-
Foreign Individuals 30$
Foreign Institutions 60$

Editor
Dr. Shayesta Bedar
Director

ख़ुदा बख़्श लाइब्रेरी जरनल

अंक 191–194 जनवरी–दिसम्बर 2018

Opinions expressed by contributors are not necessarily those of the editor.

Printed by Md. Jawaid Ashraf at Pakiza Offset, Shahganj, Patna & published by Khuda Bakhsh Oriental Public Library, Patna-800 004.

CONTENTS
Journal No. 191-194

English/Hindi Section

- *Qiranus Sa'dain* : Historical Perspective — *by* Dr. Nirmala Gupta — 1
- Muslim Historiography in India — *by* Dr. Nik'hat Tabassum — 17

Urdu Section

- Editorial — - — v
- *Shikast wa Fath* (Defeat & Victory) Jameel Mazhari's Masterpiece — *by* Jameel Mazhari (Late) — 1
- Zo'ey Ansari : Unpublished letters — *comp. by* Dr. Fardul Hasan — 69
- Purnia : History and Culture — *by* Dr. Md. Anwarul Haq Tabassum — 88
- History of Mag'hi Language — *by* Dr. Alfia Noori — 112
- A Pioneer writing on *Tazkira Ab-e Hayat* — *by* Dr. Abrar Abdus Salam — 138
- Iqbal's Visit to Aurangabad — *by* Dr. Inayat Ali — 146
- Index of Monthly **Conference Gazette** of R. R. Sherwani: 2002-17 — *by* S.K. — 161
- New Arrivals Books/Periodicals — *by* Ed. — 219

Our Contributors

- *Dr. Abrar Abdus Salam, HOD, Deptt. Of Urdu, Government College, Civil Lines, Multan (Pakistan)*
- *Dr. Alfia Noori, Post Doctoral Fellow, Deptt. Of Urdu, College of Commerce, Patna*
- *Dr. Fardul Hasan, Iram Publishing House, Daryapur, Sabzi Bagh, Patna*
- *Dr. Inayat Ali, H. No. 1-12-46, Moona Muhalla Ghati, Near Pargati Colony, Aurangabad*
- *Jameel Mazhari, Famous Poet, Ex-Professor Patna University*
- *Dr. Md. Anwarul Haq, Former Associate Prof. Oriental College, Patna City, Patna*
- *Dr. Nik'hat Tabassum, Research Scholar, Deptt. Of History, Patna University, Patna*
- *Dr. Nimala Gupta, Deptt. Of History, M. M. V. Banaras Hindu University, Varanasi*

Historical perspective of Qiranus Sa'dain

by: Dr. Nirmala Gupta,

The celebrated poet and a man of versatile character, Amir Khusrau, was not merely an outstanding poet and a gifted singer, whose flights of fancy command over the language, the variety of subjects and the marvellous ease and grace, with which he describes human passions and emotions and the scenes of love and war. He was also a great historian and some of his works deal with the History. '*Qiranus Sadain*' is one of them, and it deals with the history of Balban's successors, and the transfer of power from the hands of the Ilbarites, to the hands of the Khaljis. For, most of the historical events recorded by him, in his works, which took place during his times and can be considered as an eye-witness. The '*Qiranus Sadain*' is a phrase applied to the conjunction of two auspicious planets, the Jupiter and Venus, compared with the auspicious meeting of the father and son; both were also just like two important stars of the earth; Muizuddin Kaikubad, the ruler of Delhi, and Bughra Khan, the father of the ruler of Delhi and the viceroy of Bengal, both were illustrious son and the grandson of Ghiyasuddin Balban of the Mamluk Dynasty of the Delhi sultanate. Balban, originally a slave, succeeded the throne of Delhi, married with one of the daughters of Iltutmish; Bughra Khan was his son, who himself married with the daughter of Sultan Nasiruddin Mahmud, the last ruler of the Shamsi dynasty, and she was the mother of Kaikubad.[1] Thus, both these rulers inherited the legacy of three generations kingship. Muizuddin Kaikubad was

the last ruler of Mamluk dynasty, and rule lasted for less than three years 1387 June to1390.

Amir Khusrau himself writes the reason for writing this *masnavi*. After the death of Prince Muhammad, he joined the job under Amir Ali Sarjandar, popularly known with the name, 'Hatim Khan'; with him, he went to Oudh; where the meeting of the father and son took place. Sultan Kaikubad had invited him to join the court, but he did not accept the offer. In 1289, his mother fell ill, and Amir Khusrau returned to Delhi. The Sultan came to know of this, he sent Amir Hajib to invite him to the court. He says, that he was requested by the Sultan Kaikubad that he should undertake the trouble of writing in verse, an account of the interview between the two Kings, namely My Honoured Father and Myself, so that it can give me solace from the woeful cry of my father.[2] When Sultan said this, he made a gift of money and bestowed a dress of honour. After six months of hard labour and at the age of 36, the poet completed this *masnavi*, and thus a small event was described in 3944 verses. This was for the first time that poet had given a detailed description of the contemporary history. '*Qiranus Sadain*' deals very delicately the meeting of the father and son, Kaikubad. This book also throws light on the condition of Delhi and the cultural atmosphere of the period. Amir Khusrau gives a vivid description of the royal musical concerts in this *masnavi*. The detailed description of musical parties, with different types of musical instruments, depicts the talents of musicians of the period. During the gay time of Kaikubad, music became the order of the day. The celebration of the *Nauroz*, on the eve of spring season, a wonderful and exciting description of the festival has been given by the poet.[3] He has given the detailed description of Delhi and the palace of Kiloghari. He had praised the Sultan Kaikubad,[4] and his

personality, who inspite of gay life, cared for the welfare of his people, and it seems that everyone was happy and contended. The artistic and cultural force of the kingship was also something new which must have promoted the fusion of different cultures.[5] The descriptions of spring of summer season are beautiful. He has also praised the availability of water melons very excitingly.[6] He has given a long and filthy description of Mongols and their attacks on North-Western provinces, during the reign.[7]

As far as literary value of the *masnavi* is concerned, Prof. Habib writes, '*Qiranus Sadain*' has all colourless insipidity of a government publication. The metre is soft and sweet and Khusrau's power never flags, while some of the *ghazals* are remarkable for their poetic beauty. Nevertheless, the dull records of one of the most stupid reign of Medieval India, was hardly the proper theme for Khusrau's muse. An artist in a position to express his views would have no doubt, found much to depict. The tragedy of a handsome young Emperor of eighteen, drinking himself to death, inspite of the futile advice of a futile father taken out of a silly, old text book on politics; the ambition and incompetence of the Wazir; the intrigues of the Turkish nobility, who combined some of the best and some of the worst traits of human nature; and below their feet the rumblings of an approaching revolution, which was soon to cast everything in the furnace and mould it as new.[8]

The main theme of the *masnavi* is the simple and elegant description of the historical meeting of the father and the son, which is supposed to be one of the tenderest events of the medieval Indian history. The description of the meeting is referred by most of the contemporary Historian of Medieval India but, Khusrau was an eye witness and he was literally

present on the occasion, so the description given by him is more reliable. His work '*Qiranus Sadain*', gives the full account of the meeting, so, his account is preferable to that given by Barani. What ever Barani writes was only from hearsay.[9] [chi.iii p.85 fn] Ziauddin Barani himself writes, That Amir Khusrau stands unequal for the volume of his writing and the originality of his ideas; for, while other great masters of prose and verse have excelled in one or two branches, Amir Khusrau was conspicuous of every department of letters. A man with such mastery over all the forms of poetry has never existed in the past and may not come into existence before the day of judgment. Before coming to the theme of '*Qiranus Sadain*', we would like to know the circumstances in which the meeting took place.

Balban had two sons; the most capable son, Muhammad Khan, was also known as 'Khan of Multan'; he was holding the fief of Multan and some other western frontier states of the Empire. He was well educated and the patron of learning; Amir Khusrau and other eminent scholars were in his service. He was efficient and a mighty general. Balban had all the love and hopes of the future, totally based on him; but, unfortunately, he was killed while fighting with the Mongols. Since then, he was renamed as 'Khan-i Shahid', Amir Hasan and Amir Khusrau, both have written '*marsias*' on the deceased. It is said that no poem of Amir Khusrau evoked so many tears as this '*marsia*'; and later on, he gained popularity. Badauni has quoted the *marsia* in his '*Muntkhabut Tawarikh*'. And more over, while fighting, Khusrau was also with the prince and was arrested by the Mongols; but somehow, with greater difficulties, he was able to save his life. The death of the Prince Muhammad was a death blow to Balban. Bughra Khan was the youngest son, who was the viceroy of Bengal.

He was summoned to Delhi, so that his presence in the capital might avert the disputed succession problem. Balban had appealed to him to remain in Delhi; as he was a shattered man, and both his grandsons, Kaikhusrau and Kaikubad were young and inexperienced; He should prepare himself to bear the burden of the crown.[10] But, Bughra Khan did not paid any heed to his father's request and left Delhi against the wishes of his father. The Prince was rather dull witted, for he could not notice that his father is on his death bed. The worthless Prince had always been impatient under the restraints of his father's austere court and declined the throne. After staying for few months he returned to his governorship, without informing his father. It is also surprising that he was the next successor, inspite of that he could not take any interest in his father's empire and in his administration. He loved to lead a easy life and liked the mild climate of Bengal, and even the prospect of succeeding to the throne of Delhi did not attract him. Before leaving for the distant province, Bughra Khan must have made up his mind to forgo his claims on Delhi and to exchange the crown of Delhi for the kingdom of Lakhnauti. Before he reached to Bengal, Balban became very serious and he summoned his trusted officers, *Malikul Umara*, the *Kotwal* of Delhi, Khwaja Hasan Basari, the Wazir and some other officers, and disinherited his younger son, and designated Kaikhusrau, the son of '*Khan-e Shahid*', as his heir apparent. Few days later the old King Balban breathed his last in the middle of 1287. And thus, Bughra Khan lost his claim over the throne of Delhi.

The *Kotwal* of Delhi, Malik Fakhrauddin and his party did not like the nomination, seeing their own self interest, as they feared that Kaikhusrau would not be amiable to their dictates. The choice fell on the eighteen years old son of

Bughra Khan, Kaikubad. Kaikhusrau was sent to his old fief in Multan. Kaikubad was given the title of Muizuddin, and was raised to the throne. The election of Kaikubad introduced a new principle, the fact that he was raised to the throne while his father was yet alive. It was yet another innovation of the Turkish nobles. It proved that although the Turks had come to show regard to the family of a successful ruler in the matter of succession yet they were free to choose anyone they liked heedless of any nomination.[11]

The prince then was in eighteenth year, had been brought up under the strict care and vigilance of his grandfather. He was gifted with charming manners. He was partly trained by his puritan grandfather and partly by puritan type of teachers. It was the ardent wish of Balban that the young Prince should be kept aloof from the gaiety of life. Rather he was given full training of physical and intellectual art and possessed a refined taste for poetry and music, and including calligraphy, literature, archery, spearmanship. The puritanic upbringing was bound to set reaction in him and it did upset his balance of mind after he became the Sultan. By the fluke of destiny or unexpectedly, he found himself not only the master of his action but the master of a vast, prosperous, wealthy and disciplined empire at an immature age. Life of gaiety and pleasure was his immediate objective after ascending the throne. And at once, he was plunged in unbridled indulgence in wine, women and gaiety. Isami and Barani have given the detailed description of Sultan's reckless fulfilment of sexual desires. The court became full of buffoons, musicians and dancers. He had also exerted enormous influence in the general public life. Even courtiers and citizens they too were involved in pleasures, and Delhi became a flourishing mart for wine. Even the learned too were involved in this kind of dissipation.

The Sultan took his abode in the newly constructed palace in Kiloghari[12] on the bank of river Jamuna. His officers and courtiers were also shifted to the new palace.

Barani remarks that during three years of Kaikubad's rule, the people had no other work but to seek merriment and invent newer forms of pleasure.

In the new regime, some new appointments were also done. New officers were appointed, the main appointment was of Malik Nizamuddin, the son in law of the *Kotwal* of Delhi, who was given the post of Dad-Bek or chief magistrate; very soon, he made himself de-facto 'Naib-i Mumlikat' and assumed the control of the whole department. Probably, he exploited Fakhruddin's support to Kaikubad, and under this mask he wanted to strengthen his own position; in pursuance of the foolish thought of acquiring power and empire, he devised means for the extirpation of the Balban dynasty, deceived the young Emperor and obtained permission for the killing of those, who were obstacles on his way. He also started appointing his own supporters to the important posts of the empire. He became one of the close associates of the Sultan, and his only duty was to collect and supply all sorts of things to the Sultan, which elevate sensual pleasure. His wife, daughter of the Kotwal of Delhi, Fakhruddin, was given the charge of his harem; she was known as the 'honorary mother of the Sultan' and the directoress of his female department.'[13] Barani's description clearly indicates that the Young Sultan was very innocent; of the ways of the world; so, he did not like to share the burden of state's responsibility, and the power eventually fell into the hands of ambitious intriguers. He now started clearing all the obstacles on his way in getting the throne, one by one. Murder of Kaikhusrau was the first charge brought by Nizamuddin, he was the nearest successor to the

throne. Barani says that he got the order of his assassination in the fit of drunken-ness. He was summoned to Delhi, and on the way, at Rohtak, Kaikhusrau was killed.[14] Later on, the persons who opposed the accession of Kaikubad were the Khwaja Khatir was placed on an ass and was paraded. Wazir Hasan Basri and the Dabir, were eventually arrested and were sent into exile. Nizamuddin chalked out a plan to get rid of other Amirs, and on the false pretext they were summoned to the court; Malik Beksariq, the Amire Hajib, Malik Ghazi, the Vakildar, Malik Karimuddin, the Naib Barbak, Malik Bahrain, the Akhur Beg, Malik Jaroji, the chief sword bearer, Malik Mughlati, the Musalladar, they presented themselves to offer their felicitations to the Emperor, some of them were killed and others were arrested.[15] Posts were reassigned to those who enjoyed the confidence of Nizamuddin. Tamar Khan, the Mongol leader, attacked India, and on this pretext, Nizamuddin, deceitfully, obtained the order of their execution, and killed some of the Mongols who were converted to Islam and settled in Delhi in the reign of Balban.[16]

But, Nizamuddin was not destined to reap the fruit of his labour. Bughra Khan, the father of Kaikubad, had already assumed the sovereignty soon after Balban's death, and declared himself independent Sultanate of Delhi, by assuming the title of Nasiruddin and the Khutba read and coins struck in his name.[17] He had kept himself fully informed of his son's doings and carried a constant correspondence with Delhi. Reports of his son's gaiety reached to Bughra Khan, and he realized that his son is leading a dissipated life and that Nizamuddin was inducing him to kill the leading Maliks with the ultimate intention of putting an end to Kaikubad himself. So, his letter was full of advice, admonition, and indirect hints. But, Kaikubad paid no heed to his father's advice. So, after a

lapse of two years, he wanted to come personally to see his son. It is very difficult to define the motives of Bughra Khan, whether it was simply a filial attachment that inspired him to this action or he marched from Lakhnauti with the intention of conquering his father's dominion. It is a matter of controversy among the scholars. The description of '*Qiranus Sadain*' gives graphic accounts of the Historic meet. Amir Khusrau's reference clearly shows that their was an exchange of hot words,[18] 'The kingdom of Delhi is mine, but if it has passed to my son, he should not contend with his father. For me, the kingdom of Lakhnauti, the heritage of my father, is most desirable.' And, he further said, 'Banish the idea of revolt from your mind. I am the heir to this throne and you can obtain it through me.'[19] Do not fight, infront of my ferocious elephants your horses will stand no where. Kaikubad sent his reply in fiery words that, 'nobody inherits a kingdom without having to fight for its preservation. I have a claim over the throne by virtue of three descendents; Iltutmish, Nasiruddin Mahmud and Balban.'[20] At last, Kaikubad said very humbly that, I will surrender this crown, but come closer to me. He further said that I have kept the throne for you and protected it from Mongols; hearing these words Bughra Khan also replied in a very affectionate manner that, you are my favourite son and, if I get this crown ultimately it will be yours.[21] Amir Khusrau gives a different version by saying That Bughra Khan marched with the intention of conquering Delhi. He stayed in Oudh, and captured all the surrounding territories. He used to say that `It is my kingdom, though my son is too beloved to me, but unless and until hold my right, I cannot be satisfied.[22] Whatever was his real motive, Bughra Khan certainly marched with his army and encamped on the Eastern bank of river Saryu.[23] Barani writes the name of the river as *Saryu* but Khusrau writes that, at one side it was *Ghagra* and the other

side was *Saryu*, where both the army encamped.

Barani writes that, he wrote a letter to him and several letter passed. It was at length arranged that the Sultan would go to Oudh, and that his father should come from Lakhnauti and meet him on the bank of Saryu.[24] The Sultan wanted to come secretly but his ministers opposed this, and at last it was decided that the Sultan should proceed with his army in all state grandeur. Sultan set out in a regal state with a suitable army marching into Oudh, he pitched his camp.[25] When Bughra Khan came to know that the Sultan had brought a large army, he understood that Nizamuddin had instilled terror in his heart but he set forth from Lakhnauti with his army and elephants where the two armies encamped on opposite sides of the river, within the sight of each other.[26][ed. iii, p.130] The situation was critical seeing the superiority of the royal army, he was bewildered and was in dilemma, Amir Khusrau mentions a large correspondence between the father and the son, but when Bughra Khan reached to his son, he gave up the idea of his military objectives and his march assumed the nature of a complex social visit.[27] Woolsley Haig supports the view of Khusrau and writes, 'Bughra Khan's intention was undoubtedly hostile. He had acquiesced in his son's elevation to the throne, but latter's subsequent conduct and the prospect of the extinction of his house, had, aroused even his resentment.[28]

This display of military power may only have been a precautionary measure. But, Nizamuddin, instinctively foresaw the emotional effect, on the young King, of a meeting with his long separated father. He tried his best to bring about an armed conflict. The conflict seemed to be imminent but, through the earnest endeavours and the wise counsels of some of the old and loyal Balbani Nobles, the crisis was averted.

And at last, the King was persuaded to impose rigid and humiliating court ceremonials. Bughra Khan, agreed with remarkable equanimity and accepted to pay the homage to the sovereign of Delhi.[29]

The whole situation was changed and there was an exchange of gifts, Bughra Khan sent his younger son Kaikaus to Kaikubad as a hostage, with jewels, huge elephants and rare speciality of his province. Sultan Muizuddin also sent his infant son Kaimurs accompanied by the Ariz with the presentation of Arabian horses and valuable gifts.[30] After the exchange of complimentary gifts between father and the son, the auspicious meeting took place. The astrologers were to fix the auspicious time hour for an interview. The meeting, which held between father and the son, is one of the tenderest episodes of Medieval Indian History, and has furnished the theme of '*Qiranus Sadain*', one of the celebrated poems of Amir Khusrau. The description of the decoration and pomp elevates the real scene, one can presume. Amir Khusrau writes: Bughra Khan bowed his head to the earth and kissed the ground thrice, as required by the ceremonial of the court. Kaikubad, sitting on the throne, affected a stony dignity and with Kingly unconcern looked on as his father bowing and kissing the ground, approached the throne and prostrated himself at his feet; but at the end, his natural feelings overwhelmed him and he broke down and threw himself at his father's feet and in tears, which melted the heart of all the spectators, conducted him to the throne.[31] The details of the meeting have been vividly described by Khusrau with all the felicity of his powerful poetic imagination. Bughra Khan took his son's hand and led him to the throne, intending himself to stand before it for a while, but the Sultan came down, he bent down on his knees, and sat respectfully before him.[32] He cast

himself at his father's feet, father and son burst into tears and embraced each other and the sultan rubbed his eyes on his father's feet. Amir Khusrau writes that trays, full of jewels were scattered upon the heads of the rulers, and the ground before them, was strewed with rubies, pearls, silver and gold.[33] It reminds us of a similar scene, when Kamran Mirza, the rebel brother of Humayun was presented to the Mughal Emperor after his surrender and he carried out all the provisions of the court etiquette. The patience and reserve of Humayun broke down. He asked Kamran to embrace him a second time as a brother, when he broke into tears of joy and fraternal love.[34]

Amir Khusrau gives a full detail of the festivities on the occasion of these meetings, in which they had intimate conversation. Bughra Khan used to narrate the story related with his father and his ideals. On the demand of Kaikubad, Bughra Khan gave a good moral teaching about wealth, religion and administration. He also rebuked him for the killing of his cousin Kaikhusrau and asked him to be very particular about namaz and fasts. He also requested him to give the gift of white canopy and black cap which was used by Balban. These were promised and next day they were sent to him, and the bearer was handsomely rewarded with a robe of honour and presents.[35]

Few days after, both the army prepared for their return to their respective countries. The farewell interview took place between the father and the son. It was an affectionate meeting in which deep grief was expressed in the presence of the Nobles and Maliks, to refrain from indulging in his pleasure pursuits. Knowing, fully well that all his counsels were thrown upon a Prince, whose whole and soul was in his pleasure. Barani also gives the details of the last interview he says, 'Both father and son wept, and pressing his son to his bossom,

he bade him farewell. Nizamuddin took so much care to prevent any confidential meeting between father and son. So, Bughra Khan had to confine himself to the general moral exhortation, as Balban used to preach. But, at the time of farewell and while parting he whispered into Kaikubad's ear and advised him to get rid of Nizamuddin, otherwise, that man will one day seize an opportunity to remove him from the throne.[36] After saying this and shedding many tears, he parted with his son. When he reached his own camp, he said to his friends, 'I have said farewell to my son and to the kingdom of Delhi, for I know fully well neither my son nor the throne of Delhi will exist long.'[37] The prophecy proved too true; nevertheless, Bughra Khan and five of his successors ruled in Bengal for more than half a century [1287-1339]. An important outcome of this historical meeting of the father and son in Oudh, was the implied and tacit acceptance of the independence of Bengal.

After the departure of his father, the son cried and returned to Delhi and for some days, he was mindful of his father's advice, and sustained from the sensual amusement. But, he could not resist himself for a long time and again indulged mostly in amusement and pleasure. From extreme dissipation, extreme lasciviousness and constant drinking, he was attacked with illness. Remembering his father's instructions, he ordered Nizamuddin to proceed to Multan; but, he purposely delayed going, on various pretext. The Turkish officers found the time opportunity and poisoned Nizamuddin. After his death, the administration became chaotic, and order was never restored. Kaikubad's indolence and inefficiency led to serious conflict between old Turkish nobility and the Khaljis. The leader of the Khaljis was Jalauddin and Aitman Surkha was chosen by The Turks, as their leader. Sultan's

condition deteriorated and he became a patient of paralysis and thus he was confined to bed, lying helpless in the Kiloghari palace. His younger son, Kaimurs, who was three years old, was made the King. Obviously, it paved the way for the rise of Khaljis; and at last, Firuz Khalji ascended the throne. A Khalji Malik was sent to kill Kaikubad; he wrapped his paralytic body in a bed sheet and kicked him into *Jamuna*, and soon Kaimurs was also removed from the throne and thus, ended the glorious History of the magnificent rule of Ghiyasuddin Balban.

It is a sad event, but no contemporary Historian refers to the reaction of Sultan Nasiruddin [Bughra Khan] to the tragic end of his house at Delhi. The author of the '*Riyazus Salatin*,' perhaps on the basis of the tradition floating down the stream of time, says that Bughra Khan discarded the insignia of royalty. It is difficult to agree with the author's statement that he did this out of fear of the Khaljis. It was perhaps a shock which developed in him the disgust of all material glory and power. It cannot be said as to how long Bughra Khan survived this shock. His son Kaika'us in teens was raised to the throne after the abdication of his father.[38]

References:

1. Amir Khusrau, *Qiranus Sadain*, ed. Maulvi Muhammad Ismail, Aligarh, 1918, pp.22, 118-119.
2. *Ibid*., pp.231-235.
3. *Ibid*., pp.67-86.
4. *Ibid*., pp.78-85.
5. *Ibid*., pp.54-57.
6. *Ibid*., p.47.

7. *Ibid*., pp.58, 63, 90-91.

8. *Politics and Society in Early Medieval Period*, ed. K. A. Nizami, 1974, p.320.

9. *Cambridge History of India*, Woolsley Haig, vo1.III, p.85 fn.

10. Ziauddin Barani, *Tarikh e Firuzshahi*, Calcutta, 1862, pp.120-121.

11. R. P. Tripathi, *Some Aspects of Muslim Administration*, Allahabad, 1966, p.39.

12. The general impression that Kaikubad founded the new city '*Shahri Nau* or *Kiloghari*', it is not correct because Minhaj refers it even during the time of Nasiruddin Mahmud, Raverty, p.634 fn.21.

13. Elliot and Dowson, *History of India as told by its own Historian*, vol. III, pp.127-129.

14. *Tarikh-e Firuzshahi*, p.133.

15. *Ibid*., p.132; Yahya bin Ahmed Sirhindi, *Tarikh-e Mubarakshahi*, tr. H. Beveridge, 1992, p.50.

16. *Ibid*., pp.133-134.

17. *Ibid*., p.139.

18. *Qiranus Sadain*, pp.115-118.

19. *Ibid*., pp.117-119.

20. *Ibid*., pp.117-119.

21. *Ibid*., pp.123-128.

22. *Ibid*., p.46.

23. *Ibid*., p.105; *Tarikh-e Firuzshahi*, p.141.

24. *Ibid*., pp.117-118; *Tarikh-e Firuzshahi*, pp.140-141.

25. *Ibid*., pp.87, 100-101.

26. *Tarikh-e Firuzshahi*, pp.141-142; Elliot & Dowson, vo1.III,

p.130.

27. *Qiranus Sadain*, pp.106-114.

28. *Cambridge History of India*, vo1.III, p. 85.

29. *Tarikh-e Firuzshahi*, p.141; Elliot & Dowson, voI.III, pp.130-131.

30. *Qiranus Sadain*, pp.131-142; *Tarikh-e Mubarakshahi*, pp.51-52.

31. *Ibid*., pp.148-149.

32. *Tarikh-e Firuzshahi*, p.143; Elliot & Dowson, vo1.III, p.131.

33. *Ibid*., p.143; *Qiranus Sadain*, pp.150-151.

34. Gulbadan Begam, *Humayunama*, tr. Beveridge, pp.141-142.

35. *Qiranus Sadain*, pp.150-151; *Tarikh-e Firuzshahi*, p.143.

36. *Tarikh-e Firuzshahi*, p.156.

37. *Ibid*., p.156.

38. *Comprehensive History of India*, ed. Habib & Nizami, Delhi, 1970, vo1.V, pp.1144-1145.

भारत में मुस्लिम इतिहासलेखन का उद्भव एवं विकास

– डा0 निकहत तबस्सुम

भारत में इस्लाम की सबसे बड़ी देन इतिहास–लेखन के रूप में है। निःसन्देह प्राचीन भारतीय सभ्यता संस्कृति उन्नतशील रही है तथा इस काल में विविध प्रकार के साहित्य रचे गये, किन्तु प्राचीन भारत में इतिहास–लेखन की परम्परा एवं उसके प्रति अभिरूचि का अभाव रहा है। इस काल में आध्यात्मिक एवं दार्शनिक साहित्य के प्रति विशेष ध्यान दिया गया। फलस्वरूप इतिहास ग्रन्थों की रचना संभव न हो सकी। इस काल के ऐतिहासिक तथ्य, तत्कालीन धार्मिक, साहित्यक आदि ग्रन्थों में ही प्राप्त होते हैं। इसके विपरीत इतिहास–लेखन मुस्लिम संस्कृति का एक अंग रहा है। इस्लाम धर्म के अनुयायियों की इतिहास में अभिरूचि इस्लाम के अभ्युदय से ही रही है। इस्लाम पूर्व अरब के लोग वंशावली, इतिहास स्वप्न की व्याख्या एवं नक्षत्र विज्ञान के अध्ययन पर बल देते थे, किन्तु इस्लाम के उदय के उपरान्त वास्तविक मुस्लिम इतिहास–लेखन प्रारम्भ होता है। एक धर्म के रूप में इस्लाम में इतिहास के प्रति दृढ़ चेतना है। अनेक चेतावनियाँ देकर कुरान इतिहास का पाठ पढ़ाता है। यही कारण है कि इस्लाम के अभ्यूदय के उपरान्त अरबों में इतिहास–लेखन को ज्ञान की प्रारम्भिक शाखा के रूप में अपना लिया।

प्रारम्भिक अरब इतिहासकारों ने मौखिक बातों एवं परम्परा को स्रोत सामग्ती के रूप में उपयोग किया क्रमशः यह विकसित होता गया। अरब लेखकों ने पैग़म्बर की जीवनी, युद्ध एवं विजयों से संबंधित रचनायें (मग़ाज़ी), वंशावली (अन्साब), जीवनियाँ (तबक़ात) आदि का लेखन किया। अरब इतिहास–लेखन का स्वरूप विस्तृत था। इसने समाज, राजनीति, प्रशासनिक संस्था एवं संस्कृति को अपने लेखन का विषय–वस्तु बनाया। दसवीं शताब्दी में फारसी पुनर्जागरण के फलस्वरूप मुस्लिम इतिहास लेखन में एक बड़ा परिवर्तन आया।

फारसी भाषा से प्रभावित इतिहासकारों ने अरबी के स्थान पर फारसी भाषा को अपने लेखन का माध्यम बनाया।

ख़लीक़ अहमद निज़ामी लिखते हैं कि मुस्लिम इतिहास–लेखन में दो परम्पराओं का विकास हुआ, प्रथम अरबी इतिहास–लेखन एवं द्वितीय फारसी इतिहास–लेखन की परम्परा थी। इन्हीं दो परम्पराओं ने मध्यकालीन इतिहास लेखन की प्राकृति तथा चरित्र को निर्धारित किया है। अरबी इतिहास–लेखन की परम्परा लोकतांत्रिक भावना से प्रभावित होने के कारण अपने इतिहास ग्रन्थों में साधारण वर्ग के जीवन से संबंधित घटनाओं को भी स्थान देती है। अरबी इतिहास–लेखन के विपरीत फारसी इतिहास–लेखन की परंपरा राजतंत्रीय पृष्ठ भूमि तथा आदर्शों से प्रेरित तथा प्रभावित थी और अपने लेखन को शासकों की जीवनी तक सीमित रखती थी। जहाँ अरबी इतिहासकरों ने अपना ग्रन्थ किसी शासक अथवा अमीर वर्ग को समर्पित करने का विचार नहीं किया वहीं फारसी इतिहास–लेखन की परम्परा के इतिहासकार अपनी पुस्तक की महत्ता बढ़ाने के लिए ऐसा करना अनिवार्य समझते थे। दसवीं शताब्दी आते–आते फारसी इतिहास–लेखन की परम्परा प्रभावी हो उठी। जब उत्तर भारत में दिल्ली सल्तनत की स्थापना हुई तो यह परम्परा राजनीतिक जीवन में प्रभावी हो गई और दिल्ली सल्तनत के आरम्भिक तीनों इतिहासकार – हसन निज़ामी, फख़रे मुदब्बिद तथा मिनहाज– उस–सिराज ने फारसी इतिहास–लेखन की परम्परा का ही अनुसरण किया[1]।

जगदीश नारायण सरकार अपनी पुस्तक *हिस्ट्री ऑफ हिस्ट्री राइटिंग इन मेडिवल इण्डिया* में लिखते हैं कि भारत में मुसलमानों के आगमन और तुर्की सत्ता की स्थापना के साथ ही भारतीय इतिहास–लेखन का प्रारम्भिक चरण प्रारम्भ होता है। समकालीन भारतीय संस्कृति इतिहास लेखन का प्रारम्भिक चरण प्रारम्भ होता है। समकालीन भारतीय संस्कृति को ईरानी परम्परा से प्रभावित तुर्की द्वारा मुस्लिम इतिहास–लेखन के रूप में एक विलक्षण उपहार दिया गया। यह कहना पूर्ण तथा सत्य होगा कि तुर्की ने इतिहास–लेखन को भारत में संस्कृति के एक अंग के रूप में प्रस्तुत किया।

जगदीश नारायण सरकार ने भारत में मुस्लिम इतिहास–लेखन

को तीन चरणों में विभाजित किया है – प्रथम, अरबों के सम्पर्क और विजयों का काल (सातवीं से दसवीं शताब्दी तक) द्वितीय तुर्की के आगमन और दिल्ली सल्तनत का काल (ग्यारवीं से सोलहवीं शताब्दी तक) और तृतीय, मुग़ल–युग (सोलहवीं से अट्ठारहवीं शताब्दी तक)।

प्रथम चरण में विदेशी इतिहासकार अल–बिलाजुरी (मृत्यु तिथि 892–93 ई.) ने अपने ग्रन्थ *फ़ुतुह–उल–बुलदान* में अरबों द्वारा सिन्ध विजय का विवरण दिया है, इस चरण का सबसे महत्वपूर्ण और एकमात्र भारतीय इतिहास ग्रन्थ *चचनामा* है।

भारत भूमि पर लिखित यह प्रथम मुस्लिम इतिहास–ग्रन्थ है। इसके लेखक का नाम अज्ञात है। अनुमान किया जाता है कि इसकी रचना मुहम्मद बिन क़ासिम द्वारा सिन्ध विजय के कुछ दिनों उपरान्त की गई थी। दुर्भाग्यवश इसकी मूल अरबी प्रति अब विद्यमान नहीं है। नासिरूद्दीन कुबाचा के शासनकाल में 613 हि./1216 ई. में मुहम्मद अली बिन हमीद बिन अबू बक्र कूफी ने मूल अरबी ग्रन्थ का फारसी भाषा में अनुवाद किया था जो आज उपलब्ध है। इस ग्रन्थ में सिंध के चच राजवंश एवं मुहम्मद बिन क़ासिम द्वारा सिन्ध विजय का इतिहास दिया गया है[2]।

चचनामा के लेखक ने अपनी पुस्तक में इतिहास संबंधी अनेक कहानियों को लिखा है। ये कहानियाँ मौखिक आधार पर एक दूसरे से सुनकर लिखी गयी है, किन्तु उन पर अविश्वास करने का कोई कारण नहीं है। इसमें सिंध का विस्तृत इतिहास दिया गया है। यह ग्रन्थ नामों और स्थानों से परिपूर्ण है। यही कारण है कि निजामुद्दीन अहमद, फरिश्ता, मीर मासूम आदि अन्य लेखकों में अरबों द्वारा सिन्ध विजय का वृतान्त इसी पुस्तक से लिया है। इस ग्रन्थ की सबसे बड़ी विशेषता यह है कि इसमें अरबों के विवरण के अतिरिक्त सिन्ध के शासक दाहर, उसके पूर्वज, दाहर के परिवार के अन्य जन एवं सिन्ध वासियों के प्रतिरोध का सविस्तार वर्णन किया गया है। भारत में मुस्लिम इतिहास–लेखन के प्रथम चरण का यह एकमात्र ग्रन्थ है।

भारत में मुस्लिम इतिहास–लेखन के द्वितीय चरण का आरम्भ ग्यारवीं शताब्दी से न होकर बारहवीं शताब्दी के अन्तिम दशक अथवा

तेहरवीं शताब्दी के प्रथम दशक से होता है। इसका आरम्भ फ़खरे–मुदब्बिर के ग्रन्थों से होता है। फ़खरे मुदब्बिर का पूरा नाम फ़खरूद्दीन मुहम्मद इब्ने मन्सूर अलमर्वर रूजी अस्सिद्दीक़ी फ़खरे मुबारक शाह था, किन्तु यह फ़खरे मुदीर और फ़खरे मुदब्बिद के नाम से प्रसिद्ध था। भारत में गोरी साम्राज्य की स्थापना के उपरान्त वह भारत आया था और कुतुबउद्दीन ऐबक के राज्याभिषेक के अवसर पर भी वह उपस्थित था। उसने *तारीख़े–फ़खरूद्दीन–मुबारक शाह* नामक पुस्तक की रचना 1206 ई0 में की। यह आदम से लेकर उसके समय तक की विश्व इतिहास की रूपरेखा के सदृश है। इसमें 137 वंशावलियाँ हैं। ईश्वर तथा पैग़म्बर की प्रशंसा के उपरान्त 1173 ई. से लेकर 1206 ई. तक का राजनीतिक व सैनिक इतिहास दिया गया है। इसमें समकालीन सुल्तान कुतुबद्दीन ऐबक की प्रशंसा की गई है और उसके राज्यभिषेक का वर्णन उल्लेखनीय है। इस पुस्तक में शासकों के लिए उपदेश एवं विश्व–विद्या, भौगोलिक एवं नृवंश विद्या संबंधी तथ्य उपलब्ध हैं, किन्तु इसमें अरबी इतिहास–लेखन की आलोचनात्मक पद्धति का अभाव है। फ़खरे मुदब्बिर की दूसरी रचना *'आदाबुल हर्ब वश्शुजाअत'* है। इस पुस्तक में उस समय की शासन एवं सैन्य–व्यवस्था का वर्णन मिलता है। यह पुस्तक सुल्तान इल्तुतमिश को समर्पित की गई है।

सल्तनत काल में इतिहास–लेखन की वास्तविक शुरूआत करने वाला 'सद्रुद्दीन हसन निज़ामी' था, जिसने इल्तुतमिश के शासनकाल में *ताजुल मआसिर* नामक ग्रंथ की रचना की। खलीक़ अहमद निज़ामी का विचार है कि जिस समय सद्रुद्दीन हसन निज़ामी ने अपना इतिहास–लेखन आरम्भ किया तब मात्र गर्दीजी कृत जैनुल अखबार एवं बौहाकी कृत तारीखे सुबुक्तगीन ही फारसी भाषा में रचित इतिहास ग्रंथ थे और फारसी सभ्यता से प्रभावित होने के उपरान्त भी तूसी, इमाम ग़ाजाली, मैदनी, जमाख्शरी और फखरूद्दीन राजी ने अपना ग्रन्थ अरबी भाषा में लिखा था। इस प्रकार फारसी भाषा में अपना ग्रन्थ लिखते समय हसन निज़ामी के सामने फारसी इतिहास–लेखन की कोई समृद्धशाली परम्परा नहीं थी। *ताजुल*

मआसिर का आरम्भ मुइजुद्दीन गोरी के भारतीय अभियान से होता है। सामान्यतया *ताजुल मआसिर* ग्रन्थ की जो पाण्डुलिपियाँ प्राप्त होती है, उनमें 614 हि./1217 ई. तक की राजनीतिक गतिविधियों का उल्लेख मिलता है। *ताजुल मआसिर* की विषय वस्तु से स्पष्ट है कि यह पुस्तक दो भागों में विभाजित है। प्रथम भाग में 1191 ई. तक की घटनायें और द्वितीय भाग में 1206 से 1229 ई. तक की घटनायें हैं[3]। राजनीतिक इतिहास के दृष्टिकोण से प्रथम भाग महत्वपूर्ण है। उसमें मुइजुद्दीन गोरी और ऐबक बड़ी विजयों के साथ ही छोटी–छोटी विजयों का भी उल्लेख है। राजनीतिक इतिहास के दृष्टिकोण से *ताजुल–मआसिर* के द्वितीय भाग का कोई विशेष महत्व नहीं है। राजनीतिक इतिहास के अतिरिक्त *ताजुल–मआसिर* में प्रशासन तथा सामाजिक एवं सांस्कृतिक जीवन से संबंधित पहलुओं की भी झलक मिलती है। उस काल के विभिन्न प्रकार के अस्त्र–शस्त्र, वाद्ययंत्र, आभूषण, वस्तु, विदेशी वस्तु आदि का भी उल्लेख मिलता है। हसन असकरी तथा खलीक अहमद निज़ामी ने *ताजुल–मआसिर* में वर्णित राजनीतिक इतिहास के अतिरिक्त सामाजिक तथा सांस्कृतिक जीवन से संबंधित उदाहरणों का गहराई से अध्ययन किया है। ज़ियाउद्दीन बरनी ने हसन निज़ामी और उसके ग्रंथ को विश्वसनीय माना है। बाद के इतिहासकारों में अमीर खुसरो तथा अबुल फज़ल ने उसके सुन्दर एवं आलंकारिक शैली को अपनाने का प्रयास किया है। *तारीख़े अल्फ़ी, तबकाते अकबरी, मुन्तखब–उत–तवारीख, तारीखे फरिश्ता* आदि ग्रन्थों के भारतीय लेखकों सहित हाजी खलीफा, मीर खवांद, हमदुल्लाह मुस्तौफी जैसे गैर–भारतीय लेखकों ने अपने ग्रन्थ में *ताजुल–मआसिर* और उसके लेखकों के नामों का उल्लेख किया है।

इस प्रकार स्पष्ट है कि *ताजुल मआसिर* से दिल्ली सल्तनत के इतिहास'लेखन का आरम्भ होता है। इसमें 1191 से 1229 ई. के राजनीतिक इतिहास में से 1191 से 1206 ई. तक के घटनाक्रम का विशेष महत्व है क्योंकि इस बीच की अधिकांश घटनाओं का उल्लेख मिन्हाज जैसे लेखों ने भी किया। इसके अतिरिक्त तत्कालीन

प्रशासनिक, सामाजिक एवं सांस्कृतिक जीवन की बहुविध सूचनाएँ भी इस ग्रन्थ में मिल जाती है।

दिल्ली–सल्तनत का दूसरा प्रसिद्ध इतिहासकार 'अबू मिनहाजुद्दीन उस्मान बिन सिराजुद्दीन' था। मिनहाज–उस सिराज ने सुल्तान नासिरूद्दीन महमूद के शासन काल में अपनी पुस्तक *तबकाते नासिरी* की रचना की। इसमें आदम से लेकर सुल्तान नासिरूद्दीन महमूद के शासन काल के पन्द्रहवें वर्ष के शव्वाल 658 ई. (सितम्बर–अक्तुबर, 1260) तक का वर्णन किया गया है। यह पुस्तक सुल्तान नासिरूद्दीन महमूद को समर्पित की गयी है और उसी के नाम पर इस पुस्तक का नामकरण *तबकाते–नासिरी* रखा गया है। *तबकाते–नासिरी* की विषय सूची से स्पष्ट है कि मिन्हाज ने अपना ग्रन्थ विश्व मुस्लिम इतिहास के रूप में लिखा है। इसमें भारत के मुस्लिम राजवंश और उनके मालिकों व अमीरों का भी इतिहास वर्णित है। गर्दीजी कृत जैनुल अखबार की भाँति ही यह मुसलमानों का सामान्य इतिहास है। खलीक़ अहमद निज़ामी का यह भी मत है कि मिनहाज ने गर्दीजीी आदि की तुलना में अपना विषय–वस्तु विस्तार रूप में रखा है और उनसे अधिक राजवंशों को अपने ग्रन्थ में समाहित किया है। *तबकाते नासिरी* का प्रत्येक तबका एक अध्याय के रूप में है, जिसके अन्तर्गत संबंधित राजवंश का पूर्ण विवरण है। प्रत्येक तबके के अन्तर्गत प्रत्येक शासक के लिए उप–अध्याय दिया गया है। प्रत्येक तबका राजवंश से संबंधित पूर्ण वृत्तांत के संक्षिप्तीकरण से आरम्भ होता है और राजनीतिक दृश्य के साथ समाप्त होता है। उप–अध्याय एक शासक के सिंहासनारोह से आरम्भ होकर उस शासक के शासनकाल की समाप्ति तक चलता है। हरबन्स मुखिया का विचार है कि मिनहाज ने शासकों में अपनी सम्मति असावधानीपूर्वक दी है और वह इसे सुल्तान व्यक्तिगत गुणों से ही संबंधित रखा है। वे यह भी लिखते हैं कि शायद ही कोई शासक हो जिसके सम्मान में मिनहाज ने कुछ अच्छे शब्द न लिखे हों। मिनहाज ने अपनी पुस्तक में आरम्भ से लेकर सुल्तान नासिरूद्दीन महमूद के शासनकाल के पूर्व तक लेखन का प्रायः एक ही रूप रखा है, किन्तु सुल्तान नासिरूद्दीन महमूद के शासनकाल के आरम्भ से अन्त तक उसने अपना विवरण वार्षिक वृत्तांत्त के रूप में

लिखा है। *तबकाते नासिरी* में मिनहाज ने अपने स्रोतों का भी उल्लेख किया है। पैग़म्बर एवं इस्लाम के आरम्भिक इतिहास के लिये मिनहाज ने 14 पुस्तकों की सूची दी है, जिनके आधार पर उसने अपना विवरण लिखा है। खलीक़ अहमद निज़ामी का मत है कि मिनहाज ने यात्रियों एवं व्यापारियों से भी ऐतिहासिक सूचनायें एकत्रित की थी। मिनहाज ने अपने ग्रन्थ में बहुत ही सरल भाषा का प्रयोग किया है और घटनाओं को काल–क्रमानुसार लिखा है। ज़ियाउद्दीन बरनी ने दिल्ली के प्रसिद्ध चार इतिहासकारों में मिनहाज को सम्मिलित किया है। विश्व मुस्लिम इतिहास अथवा दिल्ली का सामान्य इतिहास लिखने के लिए सल्तनत एवं मुगलकालीन इतिहासकारों ने *तबकाते नासिरी* को अपना आधार बनाया है। अनेक आधुनिक इतिहासकार भी मिनहाज एवं उसके विवरण को महत्वपूर्ण मानते हैं। इस प्रकार *तबकाते नासिरी* एक काल क्रमानुसार मूलतः राजनीतिक इतिहास है। इस रूप में इसकी महत्ता *ताजुल मआसिर* से अधिक है। जहाँ ताजुल मआसिर से आलंकारिक भाषा में प्रशस्तिपूर्ण लेखन प्रारम्भ हुआ वहीं *तबकाते नासिरी* ने सरल भाषा में कालक्रमानुसार तिथि सहित ठोस राजनीतिक इतिहास–लेखन की एक अलग विद्या का मार्ग प्रशस्त किया।

हसन निज़ामी एवं मिनहाज–उस सिराज के उपरान्त सल्तनतकालीन इतिहास–लेखकों में अमीर खुसरो (1253–1325 ई.) का नाम आता है। उसने कई साहित्यिक तथा ऐतिहासिक ग्रन्थों की रचना की, जिसमें पाँच ऐतिहासिक मसनवी (किसी विषय विशेष अथवा व्यक्ति विशेष पर लिखा काव्यात्मक विवरण) एवं एक गद्य में लिखा गया ग्रन्थ है। उसकी प्रथम ऐतिहासिक रचना 'करानुस्सादैन' है[4]। इस मसनवी में दिल्ली के सुल्तान कैकूबाद तथा उसके पिता बंगाल के शासन बुगरा खाँ के बीच भेंटवार्ता का विवरण है। पुस्तक के आरम्भ में ईश्वर एवं पैग़म्बर मुहम्मद की वन्दना की गई है। उसके आगे उसने अपने आश्रयदाता सुल्तान मुइज्जुद्दीन कैकूबाद की प्रशंसा की है। अमीर खुसरो ने करानुस्सादैन में मुख्य विषय–वस्तु के अतिरिक्त बीच–बीच में दिल्ली तथा उसके भवनों का वर्णन, मुगलों का आक्रमण और उनका प्रतिरोध, मुगलों का पलायन, मुगलबन्दियों का पेश होना, उनका रूप–रंग व वेश–भूषा आदि का वर्णन करके

उस पुस्तक को विषय विशेष के स्थान पर तत्कालीन समस्त इतिहास ही बना दिया है। सुल्तान कैकूबाद द्वारा नौरोज का त्योहार मनाने का वर्णन करके अमीर खुसरो ने तत्कालीन सामाजिक व सांस्कृतिक झलक दिखाने की चेष्टा की है। इस प्रकार अमीर खुसरो ने उस समय की अनेक ऐतिहासिक तथा सांस्कृतिक बातों को स्पष्ट कर दिया है। आधुनिक लेखकों में मुहम्मद हबीब ने इस ग्रन्थ की आलोचना की है। उनके अनुसार 250 पृष्ठों की इस पुस्तक में तत्कालीन शासन के विषय में बहुत ही सूक्ष्म वर्णन है। इसके विपरीत मोहम्मद वाहिद मिर्जा इसे अमीर खुसरो के सुन्दरतम रचनाओं में से एक मानते हैं। साहित्यिक दृष्टि से केरानुस्सादैन में जो भी कमियाँ हो, किन्तु ऐतिहासिक दृष्टिकोण से यह कहा जा सकता है कि अमीर खुसरो ने पद्य में इतिहास–लेखन का जो आरंभ इस रचना से किया, वह अत्यन्त ही महत्वपूर्ण है। उसने अपनी प्रतिभा के आधार पर एक छोटी सी घटना पर केन्द्रित पुस्तक को तत्कालीन समग्र इतिहास की पुस्तक में बदल देने का महत्वपूर्ण कार्य किया। इस प्रकार केरानुस्सदैन से ही मध्यकालीन भारतीय इतिहास–लेखन में एक नई धारा का प्रस्फुटन हुआ जो अमीर खुसरो की अन्य ऐतिहासिक मसनवी से होती हुई एसामी तक पहुँचती है।

अमीर खुसरो की दूसरी ऐतिहासिक मसनवी *मिफ़ताहुल फुतूह* है, जिसमें सुल्तान जलालुद्दीन फिरोज़ खलजी के शासनकाल के प्रारम्भिक वर्षों का सविस्तार उल्लेख किया गया है। वह इस पुस्तक के संबंध में लिखता है – ''इसमें सुल्तान की एक वर्ष की उपलब्धियों का उल्लेख है। जो कुछ इस कविता में लिखा गया है वह सब मेरी आँखों के सामने हुआ है। मैंने इसमें कुछ घटाया बढ़ाया नहीं। सुल्तान की विजयों के उल्लेख के कारण इसका *मिफ़ताहुल फुतूह* (विजयों की कुंजी) रखा। इसकी रचना 20 जमादी उस्मानी 697 हि./20 जून 1291 ई. को समाप्त हुई। अमीर खुसरो ने आरम्भ में ईश्वर तथा पैग़म्बर की प्रशंसा की है। तत्पश्चात वह सुल्तान जलालुद्दीन फ़िरोज़ ख़लजी की चार विजयों का संक्षिप्त वृत्तांत्त देता है। *मिफ़ताहुल फुतूह* एक छोटी पुस्तिका है। अलीगढ

संस्करण में कुद 41 पृष्ट हैं। मोहम्मद हबीब के अनुसार यह अपनी ठोस ऐतिहासिक महत्ता के कारण अलग पहचान रखती है। सैयद अतहर अब्बास रिज़वी लिखते हैं, ''इसमें कवि ने जो कुछ लिखा है वह बड़ी सावधानी से लिखा है[5]''। वे आगे लिखते हैं, ''विद्रोह का समाचार मिलना, सुल्तान का क्रोध, सेना, प्रस्थान, युद्ध, विजय तथा लौटना। इस प्रकार विस्तार से लिखे गये है कि पाठक अपने आप को उसी युग में वर्तमान समझने लगता है।

अमीर खुसरो की तीसरी ऐतिहासिक मसनवी देवलरानी ख़िज़्र खाँ है, जिसे आशिका भी कहा जाता है। मूलतः इसमें गुजरात के राजा कर्णबघेला की पुत्री देवलरानी और सुल्तान अलाउद्दीन के येष्ठ शाहजादा ख़िज़्र खाँ के प्रेम कथा तथा विवाह का वर्णन है। अमीर खुसरो ने इसकी रचना 715 हि./1316 ई. में की। अमीर खुसरो अपनी ऐतिहासिक मसनवियों की भांति इस पुस्तक का आरम्भ भी ईश्वर एंव पैग़म्बर की प्रशंसा से किया है। तत्पश्चात निज़ामुद्दीन औलिया एवं सुल्तान अलाउद्दीन खलजी संबंधी प्रशांसात्मक पद्य लिखा गया है। आगे वह हिन्दुस्तान की प्रशंसा दिल्ली के पूर्व सुल्तानों का उल्लेख, अलाउद्दीन के समय में कुछ मुगल आक्रमणों का उल्लेख करता है। अमीर खुसरो ने प्रेम–प्रणय केन्द्रित मसनवी में एक ओर तत्कालीन राजनीतिक घटनाओं का विवरण दिया है, तो दूसरी ओर देवलरानी ख़िज़्र खाँ के विवाह को केन्द्रित कर तत्कालीन सामाजिक व सांस्कृतिक क्रिया–कलापों की झाँकी भी प्रस्तुत की है। सैयद अतहर अब्बास रिज़वी इस ग्रन्थ की महत्ता पर प्रकाश डालते हुए लिखते हैं ''अमीर खुसरो ने उस समय की वैवाहिक विधि प्रथाओं का बड़े विस्तार के साथ उल्लेख किया है। नगर की स्वच्छता, सजावट, नगर–वासियों के उत्साह, बाजों, खेल–तमाशों, नाच–गानों, बारात के जुलूस, निकाह, विदाई के रस्मों तथा दूसरे रस्मों का बड़ा ही सटीक और विशद वर्णन है। उस समय के उच्च वर्ग की सामाजिक दशा का परिचय प्राप्त करने में अमीर खुसरो का यह काव्य विशेष सहायक है। ख़िज़्र खाँ के पतन, उसके अंधे बनाये जाने और अन्त में उसकी हत्या का उल्लेख बड़ी ही करूण शैली में

है। इससे स्पष्ट है कि देवलरानी ख़िज्र खाँ ने राजनीतिक इतिहास–लेखन में तो योगदान दिया ही है। इसकी सबसे बड़ी महत्ता सामाजिक व सांस्कृतिक इतिहास–लेखन में है''।

अमीर खुसरो की चौथी ऐतिहासिक मसनवी *नुह सिपेहर* है जिसे उसने सुल्तान कुतबुद्दीन मुबारक खलजी के आदेशानुसार 718 हि./1318–19 ई. में पूरा किया[6]। यह नौ अध्याय में विभाजित है। प्रथम सिपेहर या अध्याय से पुस्तक आरम्भ होती है। सर्वप्रथम ईश्वर पैग़म्बर तथा उसके आध्यात्मिक गुरू निज़ामुद्दीन औलिया की प्रशंसा की गई है। तत्पश्चात सुल्तान कुतबुद्दीन मुबारक खलजी के राज्याभिषेक और उसकी देवगिरी विजय का उल्लेख किया गया है। दूसरे सिपेहर के अन्तर्गत सुल्तान द्वारा निर्मित कुछ भवनों का उल्लेख है। तत्पश्चात वारंगल–विजय का वर्णन है। तीसरे सिपेहर के अन्तर्गत भारत के ज्ञान, विज्ञान और दर्शन की चर्चा की गई है। चौथे सिपेहर के अन्तर्गत बादशाह, मलिकों एवं सैनिकों को परामर्श दिया गया है। उनको उनके कर्त्तव्य–बोध से अवगत कराया गया है। पांचवे सिपेहर में सुल्तान के शिकार का वर्णन है। छठे सिपेहर में शाहजादा मुहम्मद के जन्म संबंधी समारोहों का उल्लेख है। सातवें सिपेहर में बसन्त ऋतु एवं नौरोज, दरगाह, खुसरो खाँ को उपाधि तथा खिलअत प्रदान किये जाने का विवरण है। आठवें सिपेहर में चौगान खेल एवं नौवे सिपेहर में अमीर खुसरो ने अपने गुणों की प्रशंसा की है। नूह–सिपेहर खुसरो की सर्वोत्तम रचना है। यह तत्कालीन इतिहास एवं सामाजिक दशा के अध्ययन के लिए एक उत्तम स्रोत है। अभी तक सल्तनतकालीन इतिहासकार केवल राजनीतिक घटनाओं पर विशेष महत्व देते थे, किन्तु अमीर खुसरो अपनी चार ऐतिहासिक मसनवी के माध्यम से पिछले लेखकों से अलग हटकर सामाजिक व सांस्कृतिक दशाओं के चित्रण में जुटा रहा। अमीर खुसरो की ऐतिहासिक मसनवियों में राजनीतिक घटनाओं का विवरण तो है ही किन्तु उसकी चार ऐतिहासिक मसनवी की वास्तविक सामाजिक एवं सांस्कृतिक दृष्टि से अधिक है। यही कारण है कि सैयद हसन असकरी तथा के.एम. अशरफ़ ने उसका मूल्यांकन

एक सामाजिक इतिहासकार के रूप में करने का प्रयत्न किया है[7]।

अमीर खुसरो ने गद्य में अपनी एकमात्र रचना *खजाएनुल फुतूह* लिखा है। उसने इस पुस्तक की रचना 1311 ई. में समाप्त की। इसमें 1295 ई. से लेकर 1311 ई. तक ही घटनाओं का उल्लेख हुआ है। यह पुस्तक 6 भागों में विभाजित है – 1. प्रस्तावना, 2. प्रशासकीय सुधार और सार्वजनिक निर्माण–कार्य, 3. मंगोलों के विरूद्ध अभियान, 4. हिन्दुस्तान (उत्तरी भारत के अभियान), 5. वांरगल अभियान, 6. माबर अभियान। अपनी अन्य ऐतिहासिक मसनवियों की भांति अमीर खुसरो *खजाइनुल फुतूह* का आरम्भ भी ईश्वर, पैग़म्बर मुहम्मद एवं प्रथम चार खलीफाओं की प्रशंसा से करता है। द्वितीय अध्याय ''सिंहास नारोहण, सुधार एवं सार्वजनिक कार्य'' के अन्तर्गत सर्वप्रथम अलाउद्दीन खलजी के प्रथम देवगिरी अभियान एवं सिंहास नारोहण का वर्णन है। उसके बाद सुल्तान के आर्थिक तथा सामाजिक सुधारों का उल्लेख किया गया है। तृतीय अध्याय ''मंगोलों के विरूद्ध अभियान'' में मंगोलों के कुछ आक्रमणों के प्रति सुल्तान की कार्यवाही का उल्लेख है। चतुर्थ अध्याय ''गुजरात, राजपूताना, मालवा और देवगिरी'' अभियानों से संबंधित है। इसमें गुजरात, रणथाभोर, मालवा, चित्तौड़, देवगिरी और सिवाना विजयों का उल्लेख है। अध्याय पाँच व छः दक्षिण विजय से संबंधित है। अन्त में शाही सेना की दक्षिण भारत से वापसी एवं सुल्तान द्वारा सेना नायकों को सम्मानित किये जाने व कवि की ईश्वर से प्रार्थना संबंधी विवरण है। बदायूंनी के अनुसार अमीर खुसरो स्वयं दक्षिण विजय में गया था। यही कारण है कि वह इन अभियानों के समय स्थान के नाम, सैन्य शिविरों का विवरण, अभियान से संबंधी विभिन्न तिथियाँ, विजय और लूट के समय सम्पत्तियों का विवरण आदि का उल्लेख विशद रूप में करता है। सैयद अतहर अब्बास रिज़वी लिखते हैं कि अमीर खुसरो की दक्षिण भारत संबंधी ये विविधताएँ ही *खुजाइनुल फुतूह* के इस अध्याय को बहुमूल्य बनाने में सहायक हुई हैं। के.एल. लाल का मत है कि ''इस कृति के ऐतिहासिक महत्व से इंकार नहीं किया जा सकता, क्योंकि वास्तविक दृष्टि से अलाउद्दीन

के शासनकाल का केवल यही समकालीन इतिहास है[8]।'' अमीर खसरो ने *खजाइनुल फुतूह* के माध्यम से अपने को केवल कवि कहलाये जाने का भ्रम तोड़ दिया। इस पुस्तक की विशेषताओं ने उसे खलजी कालीन प्रसिद्ध इतिहासकारों की पंक्तियों में ला खड़ा किया। उसने अपनी इस पुस्तक में इतनी तिथियाँ भी दे दी है कि तत्कालीन घटनाओं को विधिवत समझने में भी सुविधा हो जाती है। निःसन्देह *खजाइनुल फुतूह* ने अमीर खुसरो को एक इतिहासकार के रूप में प्रमाणित कर दिया। इस प्रकार स्पष्ट है कि तुग़लक़ काल आरंभ होने के पूर्व ही दिल्ली सल्तनत में इतिहास–लेखन का प्रारम्भ हो चुका था। फख़रे मुदब्बिद, सद्रुद्दीन हसन निज़ामी, मिनहाज–उस–सिराज एवं अमीर खुसरो ने अपनी रचनाओं के माध्यम से इतिहास–लेखन में योगदान दिया था।

तुग़लक़ काल का मुख्य इतिहासकार बरनी है। बरनी ने *तारीख–ए–फ़ीरोज़शाही* नामक पुस्तक की रचना 1357 ई. में पूरी की। इसमें बलबन के शासनकाल के प्रारम्भ से लेकर फिरोज तुग़लक़ के शासनकाल के छठे वर्ष (1357 ई.) तक का ऐतिहासिक विवरण है। जहाँ पर *''तबकाते–नासिरी''* समाप्त होती है, वहीं से बरनी का इतिहास शुरू होता है। बरनी ने इतिहास की उपयोगिता, इतिहासकार के कर्तव्य आदि के बारे में *तारीख–ए–फ़ीरोज़शाही* की भूमिका में विस्तार से लिखा है। इसमें आठ सुल्तानों का इतिहास है : 1. ग्यासुद्दीन बलबन, जिसने 28 वर्ष शासन किया था, 2. मुईजुद्दीन कैकुबाद, 3. जलालुद्दीन फ़ीरोज़ ख़िलजी, 4. अलाउद्दीन खिलजी, 5. कुतबुद्दीन, 6. तुग़लक़, 7. सुल्तान मुहम्मद, 8. फ़ीरोज़शाह बरनी ने अपने ग्रन्थों की रचना फ़ीरोज़शाह के शासनकाल में की और अपनी पुस्तक फ़ीरोज़शाह को समर्पित की। बरनी ने *तारीख–ए–फ़ीरोज़शाही* के शासनकाल की प्रथम छः वर्ष (1351 से 1357 ई.) की घटनाओं का विवरण लिखा है। बरनी ने फ़ीरोज़शाह के चरित्र, शासन प्रबन्ध, दान–पुण्य एवं दरबार के प्रमुख सामन्तों का विवरण दिया है कि मुहम्मद ग़ौरी से लेकर उस समय तक हुए सुल्तानों में फ़ीरोज़शाह सर्वोत्तम सुल्तान था। बरनी द्वारा लिखित

खिलजीकालीन इतिहास बहुत महत्वपूर्ण है। इसमें जिन घटनाओं का वर्णन किया गया है, उनका वर्णन किसी अन्य समकालीन ऐतिहासिक ग्रन्थ में नहीं मिलता है। उदाहरणार्थ बरनी द्वारा लिखित सुल्तान अलाउद्दीन खिलजी का बाज़ार नियंत्रन एवं मंगोलों का आक्रमण आदि। डॉ. ईश्वरी प्रसाद ने लिखा है कि ''मध्यकालीन इतिहासकारों में बरनी ही अकेला ऐसा व्यक्ति है, जो सत्य पर ज़ोर देता है और मिथ्या से घृणा करता है[9]।'' बरनी ने अपनी दूसरी कृति *फतवाए जहांदारी* की रचना की। इस पुस्तक में राज्य व्यवस्था संबंधी कुछ महत्वपूर्ण बातों का वर्णन किया गया है। बरनी ने *फतवाए जहांदारी* में आदर्श शासक के बारे में अपने विचार भी व्यक्त किऐ हैं। बरनी की कृतियाँ निः–सन्देह अत्यन्त मूल्यवान है, जिसने बाद के इतिहासकारों को प्रेरणा दी है। बरनी ने *तारीख–ए–फ़ीरोजशाही, फतवाए जहांदारी* के अतिरिक्त *इनायतनामा–ए–इलाही, हसरत नामा, सना–ए–मुहम्मदी, सलावत–ए–कबीर* आदि ग्रंथ लिखे हैं। परन्तु बरनी की सर्वाधिक महत्वपूर्ण पुस्तक *तारीख–ए–फ़ीरोजशाही* है, इससे 95 वर्षों का प्रमाणिक इतिहास प्राप्त होता है। वह सल्तनतकालीन इतिहास का एक महत्वपूर्ण स्रोत है।

जहाँ से बरनी की *तारीख–ए–फ़ीरोज़शाही* समाप्त होती है, वहीं से शम्स–ए–सिराज की रचना *तारीख–ए–फ़ीरोजशाही* प्रारम्भ होती है। ''अफ़ीफ में बरनी जैसी न तो बौद्धिक चेतना है और न ही इतिहासकार की योग्यता, सूझ–बूझ तथा पैनी दृष्टि नही, अफ़ीफ़ घटना को तिथि–क्रम से लिखने वाला सामान्य इतिहासकार है, जिसने प्रशंसात्मक दृष्टि से अपने विचार व्यक्त किये हैं। फिर भी सुल्तान फ़ीरोजशाह का समकालीन इतिहासकार होने के कारण उसके विवरण की उपेक्षा नहीं की जा सकती।

ज़ियाउद्दीन बरनी एवं शम्स–ए–सिराज अफ़ीफ की रचनाओं के अतिरिक्त फिरोशाह तुग़लक़ का समकालीन एक अन्य ग्रंथ *सीरत–ए–फ़ीरोजशाही* भी महत्वपूर्ण है। इस ग्रंथ की एकमात्र ज्ञात प्रति खुदाबख़्श ओरिएन्टल पब्लिक लाइब्रेरी में सुरक्षित है। *सीरत–ए–फ़ीरोजशाही* की रचना 1370 ई. में सुल्तान फ़ीरोज़शाह

तुग़लक़ के समय में की गई थी। इस पुस्तक का लेखक कौन था, अभी तक पता नही चल सका। इस पुस्तक में सुल्तान फ़ीरोजशाह के शासनकाल की उपलब्धियों का वर्णन क्रमबद्ध रूप से किया गया है। यह पुस्तक फ़ीरोजशाह के बंगाल, सिंध, जार्ज नगर और नगरकोट के अभियानों पर अच्छा प्रकाश डालती है। इस ग्रंथ में सुल्तान फ़ीरोजशाह की उदार नीति एवं उसके द्वारा निर्मित भवनों का विवरण है। विभिन्न हथियारों, गोला–बारूद एवं ज्योतिष संबंधी चार्टों का भी वर्णन है। यह पुस्तक उस युग की शिक्षा पर भी अच्छा प्रकाश डालती है। साथ ही इससे हमें उस युग की प्रशासनिक व्यवस्था एवं सांस्कृतिक जीवन के बारे में भी अच्छी जानकारी प्राप्त होती है। इस प्रकार फ़ीरोज तुग़लक़ कालीन इतिहास–अध्ययन के लिए बरनी तथा अफ़ीफ़ की रचनाओं के पश्चात् इस ग्रंथ की ही महत्ता है। विशेषकर बरनी और अफ़ीफ़ के ग्रंथों में जो विवरण छूट गये है, उसकी पूर्ति यह ग्रंथ करता है। इसीलिए इतिहास–लेखन के दृष्टिकोण से *सीरत–ए–फ़ीरोजशाही* का विशेष महत्व है। इस तरह तुग़लक़ कालीन प्रसिद्ध भारतीय इतिहासकारों में ज़ियाउद्दीन बरनी, शम्स सिराज अफ़ीफ़ तथा *सीरत–ए–फ़ीरोजशाही* के अज्ञात लेखक का नाम आता है, जिन्होंने विशुद्ध रूप में इतिहास लिखा है।

तुग़लक़ कालीन इतिहासकारों में 'एसामी' भी एक प्रसिद्ध इतिहासकार है एवं उसकी कृति महत्वपूर्ण है। अमीर खुसरो के उपरान्त 'एसामी' सल्तनत कालीन भारत का एकमात्र ऐसा इतिहासकार है, जिसने पद्य में अपना इतिहास ग्रंथ लिखा। अमीर खुसरो ने जहाँ अपनी मसनवी में व्यक्तिगत शासकों अथवा विशेष घटनाओं का ही उल्लेख किया है वहीं एसामी ने लगभग 350 वर्षों का एक राजनीतिक इतिहास लिखा। एसामी मुहम्मद बिन तुग़लक़ का समकालीन था। उसने *फ़ुतूह–उस–सलातीन* की रचना फ़ारसी पद्यों में 1349 ई. में की। इस ग्रन्थ में सुल्तान महमूद ग़ज़नवी के समय से लेकर सुल्तान अलाउद्दीन बहमनशाह तक के शासनकाल का विवरण है। यद्यपि कवि था, परन्तु उसमें ऐतिहासिक घटनाओं को शुद्ध एवं तिथिक्रम में लिखने की आश्चर्यजनक क्षमता थी। ऐतिहासिक दृष्टि

से उसकी कृति का बहुत अधिक महत्व है। उस समय न तो कोई बादशाह की बुराई कर सकता था और न ही उसके खिलाफ़ लिख सकता था, परन्तु हम उसके इतिहास से सुल्तानों के आलोचकों का मत भी जान सकते हैं। निस्संदेह एसामी का यह ग्रंथ इतिहास–लेखन की दृष्टि से महत्वपूर्ण है।

मुगलकाल में इतिहास–लेखन की परम्परा, जिसका सल्तनतकाल में विकास हो चुका था और भी विकसित हुई। मुगलकाल में ऐतिहासिक रचनाओं की संख्या और विविधता में भी वृद्धि हुई। अबुल फ़ज़ल की *अकबरनामा,* बदायूनी की *मुंतखब–उत–तवारीख़,* अब्दुल हमीद लाहौरी की *बादशाहनामा* और खफ़ी खाँ की *मुंतखब–उल–लुबाब* आदि इस परम्परा के महत्वपूर्ण उदाहरण हैं। बाबर एवं जहाँगीर के संस्करण *तुज़ुके बाबरी* और *तुज़ुके जहाँगीरी* ऐतिहासिक सूचनाओं के लिए विशेष महत्व रखते हैं।

अबुल फज़ल कृत *अकबरनामा* मुगल सम्राट अकबर के राज्य काल का इतिहास जानने का महत्वपूर्ण विश्वसनीय स्रोत है। लेखक ने अपने इतिहास–लेखन हेतु तिथि क्रम सम्राट अकबर द्वारा स्थापित अभिलेख कार्यालयों से प्राप्त किया। उसने बड़े परिश्रम से सम्राट द्वारा प्रान्तों को भेजी गयी, आज्ञायों की नकलें, मंत्री एवं उच्च अधिकारियों द्वारा पेश की गई साम्राज्य की समस्याओं की रिपोर्ट और विदेशी घटनाओं की सूचनायें संकलित की, इस प्रकार उसने जाँच और खोज द्वारा सामग्री एकत्रित की। *अकबरनामा* में अकबर के शासनकाल का विस्तृत वर्णन है। अकबर के शासनकाल के संबंध में यह कृति सबसे सम्पूर्ण तथा मौलिक इतिहास के रूप में स्वीकार की जा सकती है। अबुल फ़ज़ल मुग़ल काल का प्रमुख इतिहासकार है। उसकी लेखन–शैली उच्च कोटि की है। परन्तु लेखक के कुछ दोष भी है, इस दोष के होते हुए भी *अकबरनामा* मुग़ल सम्राट अकबर के काल का इतिहास जानने का प्रमुख स्रोत स्वीकार किया जा सकता है। अबुल फ़ज़ल कृत अकबरनामा में घटनायें सम्भवतया क्रम से है और तिथियों की प्रचुरता है जो विश्वसनीय भी हैं। इस कृति का अंग्रेजी अनुवाद हेनरी बिवरीज ने प्रस्तुत किया था।

अबुल फ़ज़ल ने 1593 ई. *आईने अकबरी* की भी रचना की थी

और इसे मुग़ल सम्राट अकबर को भेंट किया था। यह एक प्रकार से अकबरनामा का परिशिष्ट है। इसमें शासन के विभिन्न प्रलेखों के साथ तत्कालीन उद्योगों, जनसंख्या तथा सम्पत्ति का भी विस्तृत विवेचन किया गया है। *आईने अकबरी* में में शेरशाह की भू–व्यवस्था तथा राजस्व–व्यवस्था पर भी विस्तृत प्रकाश डाला गया है।

अब्दुल क़ादिर बदायूनी कृत *मुन्तख़ब–उत् तवारीख़* मुगलकाल का विशेषकर अकबर के समय का इतिहास जानने का महत्वपूर्ण स्रोत है। अब्दुल क़ादिर बदायूनी फ़ारसी, अरबी, संस्कृत का विद्वान था तथा उसे भाषा पर प्रबल अधिकार प्राप्त था। उसने अपनी कृति *मुन्तख़ब–उत तवारीख़* अपनी मृत्यु से पूर्व (कुछ ही समय पहले) लगभग 1615 ई. में पूर्ण किया था। इस कृति में गज़नवी वंश से लेकर अकबर के समय तक की घटनाओं का विवेचनात्मक विवरण प्रस्तुत किया गया है। यह कृति तीन भागों में विभक्त है – पहले भाग में भारत का इतिहास सुबुक्तगीन (977 ई.) से सम्राट हुमायुँ की मृत्यु (1556 ई.) तक लिपिबद्ध किया गया है; दूसरे भाग में अकबर के प्रथम चालीस वर्षों के राज्यकाल का विवरण लिपिबद्ध है; तृतीय भाग में समकालीन संतों, फ़कीरों, सूफ़ियों, कवियों, साहित्यकारों, कलाकारों आदि के जीवन पहलुओं को वर्णित किया गया है[10]। लेखक अबुल फ़ज़ल की अति–श्योक्तिपूर्ण प्रशंसा जो उसने अपने आश्रयदाता की है, उसका घोर विरोधी है। अतः उसके ग्रन्थ में अकबर की उतनी ही निन्दा है, जितनी *अकबरनामा* में अकबर की प्रशंसा निहित है। बदायूनी अकबर के कार्यों, नीतियों का कटु आलोचक रहा है उसने अपना ग्रन्थ अकबर से छुपा कर लिखा तथा यह अकबर की मृत्यु के बाद प्रकाश में आया, अतः अकबर के शासन–काल का विवेचनात्मक इतिहास इस कृति में निहित है जो हमारी जानकारी को बहुमूल्य बनाता है।

अब्दुल हमीद लाहौरी ने सम्राट शाहजहाँ के आदेश से *बादशाहनामा* की रचना की थी। लेखक ने अबुल फ़ज़ल को अपना आदर्श मानकर इस ऐतिहासिक ग्रन्थ की रचना की है। इस ग्रन्थ में शाहजहाँ के समय के राजनीतिक, सामाजिक तथा सांस्कृतिक जीवन का सजीव चिंतण किया गया है। लाहौरी ने *बादशाहनामा* में शाहजहाँ के

शासनकाल के प्रथम 20 वर्षों का इतिहास लिखा है। शाहजहाँ के काल के लिए *बादशाहनामा* बड़ा प्रमाणिक ग्रन्थ है। यह ग्रन्थ बहुत बड़ा है। इसमें 1662 पृष्ठ है। लाहौरी ने इस ग्रंथ में शाहजहाँ की उपलब्धियों का प्रशंसात्मक वर्णन किया है। फिर भी शाहजहाँ के शासनकाल का इतिहास जानने के लिए यह एक अमूल्य ग्रन्थ है।

मुन्तख़ब–उल लुबाब का लेखक ख़फ़ी खाँ औरंगज़ेब का विश्वस्त अधिकारी रहा था, उसने अपना ग्रन्थ छुपा के लिखा है, क्योंकि सम्राट औरंगजेब ने इतिहास–लेखन पर प्रतिबन्ध लगा दिया था। *मुन्तखब–उल लुबाब* में मुगल सम्राट बाबर से लेकर मुग़ल सम्राट मुहम्मदशाह के 1733 ई. तक के शासन काल की घटनाओं को लिपिबद्ध किया गया है। उसने आँखों देखा वर्णन अपनी कृति में लिखा है। इसलिए यह ग्रन्थ प्रमाणिक माना जाता है। उसने घटनाओं का सुन्दर यथा तथ्य और क्रमबद्ध विवरण दिया है। ख़फ़ी खाँ ने मनसबदारी प्रथा के कारणों का भी वर्णन किया है। इसके अतिरिक्त मराठों के कार्यकलापों, जागीरदारों की स्थिति एवं केन्द्रीय प्रशासन का अच्छा विवरण दिया है। डॉ. जगदीश नारायण सरकार के अनुसार सरकारी अभिलेखों को देखने की सुविधा बहुत कम लोगों को प्राप्त थी, ख़फ़ी खाँ उनमें से एक था। अतः उसने प्राप्त सामग्री का अत्यन्त कुशलता के साथ उपयोग किया है। ख़फ़ी खाँ ने राजनीतिक इतिहास लिखा, उसने सैनिक अभियानों और शाही उपलब्धियों का विस्तृत विवरण दिया है। उसके इतिहास–लेखन में सामाजिक, आर्थिक पहलू भी उजागर हुये है। इस प्रकार उसकी कृति *मुन्तखब–उल लुबाब* मुग़लकाल के इतिहास जानने का बहुमूल्य स्रोत है। विशेषकर सम्राट औरंगजेब और उत्तरकालीन मुग़ल शासकों के इतिहास जानने का यह एकमात्र विश्वसनीय प्रमाणिक स्रोत स्वीकार किया जा सकता है।

मुग़लकालीन इन महत्वपूर्ण इतिहासकारों के इतिहास–लेखन के अतिरिक्त बाबर एवं जहाँगीर के संस्मरण भी मुग़लकाल की ऐतिहासिक सूचनाओं के लिए विशेष महत्व रखते हैं। *तुजक–ए बाबरी* (बाबरनामा) को बाबर ने अपनी मातृभाषा तुर्की में लिखा था। पायन्दा खाँ और अब्दुर्र–रहीम खानखाना ने फारसी में इसका

अनवुाद किया था। अपनी इस आत्मकथा में बाबर ने केवल अपने जीवन की घटनाओं का ही विवरण नहीं दिया अपितु समय–समय पर जो भावनायें उसकी रहीं और जिस प्रकार विभिन्न घटनाओं की प्रतिक्रिया उसके हृदय में हुई, उसने उसको भी लिखा। बाबर की लेखन–शैली स्पष्ट तथा प्रभावशाली थी। अपनी इस कृति में उसने अपने चरित्र के दुर्बल पक्षों को भी उजागर किया है। विभिन्न व्यक्ति, मित्र या शत्रु जो भी उसके सम्पर्क या विरोध में आये, उनके संबंध में उसने बहुत ही ईमानदारी और सुक्ष्मता से लिखा है। दौलत खाँ लोदी, इब्राहिम लोदी, आलम खाँ, राणा सांगा आदि के संबंध में उसका विवरण विश्वसनीय है[11]।

बाबर ने अपने द्वारा देखे गये सभी देशों की जलवायु, झरने, फूल–पत्ते, पहाड़ों, नदियों, जंगलों, वनस्पति, प्राकृतिक सौन्दर्य आदि सभी के संबंध में सुन्दर ढंग से लिखा है। बाबर की स्पष्टवादिता, प्राकृति में अभरूचि मनुष्य के चरित्र और परिस्थितियों को समझने की कुशलता आदि सभी की जानकारी हमें उसकी कृति से ज्ञात होती है। इस तरह इस आत्मकथा में बाबर ने अपने शासनकाल से लेकर मृत्यु के पूर्व तक घटनाओं का विवरण दिया है। इससे 16वीं शताब्दी के भारत की राजनैतिक, सामाजिक एवं आर्थिक स्थिति के बारे में जानकारी प्राप्त होती है। ऐतिहासिक दृष्टि से बाबरनामा एक बहुमूल्य ग्रन्थ है।

तुजुक–ए जहाँगीरी (जहाँगीरनामा) की रचना स्वयं मुग़ल सम्राट जहाँगीर ने की थी। ऐतिहासिक दृष्टिकोण से *तुजुक–ए जहाँगीरी* एक अमूल्य ग्रन्थ है, क्योंकि इससे हमें जहाँगीर के प्रशासन के विकास के बारे में महत्वपूर्ण जानकारी प्राप्त होती है। अपने राज्य के 17वें वर्ष तक स्वयं सम्राट ने ही इसे लेखनीबद्ध किया और स्वास्थ्य बिगड़ जाने के कारण अठारहवें और उन्नीसवें वर्ष का विवरण मोतमिद खाँ ने लिखवाया। इस संस्मरण में मुग़ल सम्राट जहाँगीर के समय का सजीव चिंतन है तथा राजनैतिक सैनिक व्यवहार के अतिरिक्त इसमें सामाजिक सांस्कृतिक तथा आध्यात्मिक जीवन का विस्तृत वर्णन है। मुग़ल सम्राट जहाँगीर ने इसे निष्पक्ष

भाव से लिखा है, उसने अपनी कमियों, दोषों को भी इंगित किया है, अपनी सभी दुर्बलताओं को भी उजागर किया है। इस कृति ने सम्राट जहाँगीर के चरित्र का मूल्यांकन करने में भावी इतिहासकारों का पथ प्रशस्त कर दिया है। सम्राट जहाँगीर के कार्यकाल की जानकारी का यह अमूल्य स्रोत है।

मुग़लकाल में इन अति महत्वपूर्ण ऐतिहासिक रचनाओं के अलावा और भी कई महत्वपूर्ण रचनाएँ लिखी गयीं। इन रचनाओं में सबसे पहले *तजकिरातुल–वाक़यात* – जौहर की कृति। उसकी कृति हुमायूँ के विश्वसनीय स्रोत है। मिर्ज़ा हैदर दोगलात कृत *तारीख–ए रशीदी* में मुग़ल सम्राट बाबर तथा हुमायूँ के राज्य–काल की घटनाओं का विवरण दिया गया है। हुमायूँ के शासनकाल से संबंधित गुलबदन बेग़म का *हुमायूँनामा* एक महत्वपूर्ण रचना है। इसके फलस्वरूप अब्बास खाँ सर्वानी द्वारा *तोहफ़ा–ए अकबरशाही* अथवा *तारीख़–ए शेरशाही* की रचना हुई। इसमें शेरशाह के महत्वपूर्ण शासनकाल और विशेषकर उसके प्रशासनिक सुधारों और कल्याणकारी उपायों का विश्वसनीय वर्णन मिलता है। उपरोक्त रचनाओं के अतिरिक्त निज़ामुद्दीन बख़्शी की *तबकाते अकबरी*, हिन्दू शाह फ़रिश्ता की *गुल्शने इब्राहीमी*, मुहम्मद क़ासिम फ़रिश्ता की *तारीख–ए फ़रिश्ता*, मुतमद खाँ द्वारा रचित *इकबालनामा–ए जहाँगीरी*, कज़वीनी कृत *बादशाहनामा*, मुहम्मद सादिक़ कृत *तारीख़–ए शाहजहाँनी*, भीम सेन कृत *नुस्खा–ए दिलकुशा*, ईश्वर दास कृत *फ़तूहात–ए आलमगीरी*, मुहम्मद साकी मुस्तैद खाँ द्वारा रचित *मासिरे आलमगीरी* तथा मिर्ज़ा मुहम्मद क ाज़िम की रचना *आलमगीरीनामा* मुग़लकाल की महत्वपूर्ण ऐतिहासिक रचनाएं हैं[12]। इस प्रकार मुग़लकाल में इतिहास–लेखन के क्षेत्र में उल्लेखनीय प्रगति हुई।

निष्कर्षता तुर्कों द्वारा मुस्लिम इतिहास लेखन के रूप में जो विलक्षण उपहार दिया गया, वह मुग़लकाल में और भी अधिक विकसित हुआ तथा अपने चरमोर्कष पर पहुँचा। भारत में इतिहास–लेखन की दृष्टि से मध्यकालीन भारत में तुग़लक़ काल एक र्स्वाणम काल है, क्योंकि इसी काल में तत्कालीन इतिहास– लेखन

की प्रायः सभी विद्याओं का विकास हुआ था। इस कारण तुग़लक़–कालीन इतिहासकार एवं इतिहास–लेखन का अध्ययन महत्वपूर्ण है।

<u>सन्दर्भ (References)</u>:

1. *एफ. रोसेनथालः* ए हिस्ट्री ऑफ मुस्लिम हिस्टोरियोग्राफी /
2. *जगदीश नारायण सरकारः* हिस्ट्री ऑफ हिस्ट्री राइटिंग इन मेडिवल इण्डिया /
3. *ख़लीक़ अहमद निज़ामीः* आन हिस्ट्री एण्ड हिस्टोरियन्स ऑफ मेडिवल इण्डिया /
4. *एस.एच. असकरीः* अमीर खुसरो ऐज ए. हिस्टोरियन /
5. *के.एस. लालः* हिस्ट्री ऑफ खलजीज /
6. *जगदीश नारायण सरकारः* हिस्ट्रोरियोग्राफ़ी देन एण्ड नाऊ /
7. *इलियट एवं डाउसनः* भारत का इतिहास /
8. *के.एम. अशरफ़ः* लाइफ एण्ड कन्डीशन्स ऑफ द पीपुल ऑफ हिन्दुस्तान /
9. *एस.ए.ए. रिज़वीः* तुग़लक़ भारत तथा मुग़लकालीन भारत /
10. *आर.के. सक्सेनाः* मुग़लकालीन इतिहासकार /
11. *एम.एल. शर्माः (*अकबरनामा*) शेख़ अबुल फ़ज़ल कृत के संक्षेपक एवं अनुवादक (भूमिका)* /
12. *आर.के. सेक्सेना एवं एल.पी. माथुरः* मुगलकालीन इतिहासकार व इतिहास–लेखन /

***